

# جنسیاتی مُطالعے

علی عباس جلالپوری

# فہرست

پیش لفظ	1
بلوغت اور اوائلِ شباب	2
حسن و جمال	3
حدیثِ عشق	4
شادی	5
ہم جنسیت	6
قبیگی	7
جنس اور ادب و فن	8
برده فروشی	9
جنس اور مذہب	10

جنسی انحرافات	11
نئے جنسی زاویے	12
اصطلاحات	13
کتابیات	14

---

## پیش لفظ

ایک مستقل شعبہ علم کی حیثیت سے جنسیات کی تدوین ۱۹ ویں صدی میں عمل میں آئی تھی لیکن اس کے اصول و مبادی کا کھوج قدیم تہذیبوں میں بھی ملتا ہے۔ فراعین مصر کے مقبروں کی کھدائی سے ایسی تحریریں دستیاب ہوئی ہیں جنہیں آج کل کی زبان میں خوش کا نام دیا جاتا ہے اور جو عالم عقبیٰ میں فراعین کا جی بہلانے کے لئے اُن کی ممیوں کے ساتھ دفن کی جاتی تھیں چنیو، یونانیوں، رومیوں، ہندیوں اور عربوں نے جنسی موضوعات پر مستقل کتابیں تالیف کیں اور اس علم کے بارے میں ایسے ایسے انکشافات کئے کہ بعض پہلوؤں سے آج بھی اُن پر چنداں اضافہ نہیں کیا جاسکا۔ اس ضمن میں افلاطون کے ایک شاگرد میریلیڈیز پونٹانی کی کتاب جنسی حفظ، اوڈو کی "فن عشقبازی" اور جونیال، مارشل اور پوریس کی نظمیں قابل ذکر ہیں۔ اوڈو قیصر اگستس سیزر کے عہد کا مشہور شاعر تھا جس کا معاشرہ قیصر کی نواسیں جو کیا سے ہوا اور راز فاش ہونے پر دونوں کو جلا وطن کر دیا گیا۔ فن عشقبازی، اوڈو کے ذاتی مشاہدات اور واردات کا آئینہ ہے۔ وہ نسوانی فطرت کا بہت بڑا مبصر ہے۔ اُس نے مزاجیہ پیرائے میں عورتوں کو ورغلانے کے گرتبائے میں اور دوسری طرف عورتوں کو ہدایات دی ہیں کہ وہ کس طرح اپنے عشاق پر قابو پاسکتی ہیں۔ اوڈو، جونیال اور پوریس کی نظموں میں معاصر رومی معاشرے کی جنسی زندگی کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں اور جنسیات کے بارے میں رموز و نکات ملتے ہیں۔ افلاطون کے مکالمے سمپوزیم اور فیڈو میں اور سیفوک کی نظموں میں ہم جنسی عشق کا ذکر والدہانہ شفقتگی سے کیا گیا ہے جس سے معلوم ملے جنسی حفظ کے مسلک کو یونانی زبان میں

SEXOLOGY

مسلک کو یونانی زبان میں

HEDONE کہتے تھے۔ اخلاقیات میں HEDONISM کا مکتب اس سے یادگار ہے۔

ہوتا ہے کہ ہم جنسیت قدیم یونانی معاشرے کا تعلیمی ادارہ بن گئی تھی۔ قدیم چینی ادبیات میں دو کتابیں 'سُنہرا کنول' اور 'چنگ پنگ می' قابل ذکر ہیں۔ 'سُنہرا کنول' میں تاؤ مت کے پیروؤں کے لئے اعادہ شباب اور جنسی حظ کے حصول کے طریقے درج کئے گئے ہیں اور جنسی ترغیبات سے بچت کی گئی ہے۔ 'چنگ پنگ می' میں ایک شخص سبھی جن کی عشقیہ مہمت بیان کی گئی ہیں۔ ہندوستان میں 'وتسیان' کی کتاب "کام شاستر" مستند مانی گئی ہے۔ 'واتسیان' کا اصل نام ملی ناکا تھا۔ وہ سنیاں کی حالت میں بنارس میں مقیم تھا جب اُس نے یہ کتاب لکھی تھی۔ اُس کا زمانہ پہلی اور چوتھی صدی بعد از مسیح کے درمیان کا بتایا جاتا ہے۔ ہندوؤں کے ہاں 'لنگ' شیو دیوتا کی اور یونی شکتی دیوی کی علامتیں ہیں۔ وہ 'لنگ' یونی کے اتصال کو پرش پر کرتی کے وصال کے مہاش خیال کرتے ہیں جس سے یہ کائنات بنی تھی۔ اُن کے ہاں مقاربت کی از خود رفتگی اور ملتی ملتی جلتی کیفیات ہیں۔ 'وتسیان' نے 'کام شاستر' میں اس خیال کو پیش نظر رکھا ہے۔ اُس نے عورت کی قسموں، مقاربت کے آسنوں اور جنسی کھڑکیوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ 'کام شاستر' کا ترجمہ مغرب کی بڑی بڑی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ 'لگو کا شاستر'، 'لوک شاستر'، 'دمودر گیت' کی 'منشی مہتم' اور 'کیان مل' کی 'انگ رنگ' میں (لغوی معنی ہے بے رنگ (کام دیو) کے رنگ) جو لاد ا خال لودھی کی فرمائش پر لکھی گئی تھی، 'کام شاستر' ہی سے اخذ و استفادہ کیا گیا ہے۔ دتا کاٹنے پائی پتر کی کسبیوں کی فرمائش پر ایک رسالہ لکھا تھا جو دست بُرد زمانہ کا شکار ہو گیا۔ اس کے اقتباسات البتہ کہیں کہیں ملتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں 'ملک راج' آئندہ نے اپنی کتاب 'کام کلا' میں قدمائے ہند کے جنسی نظریات کو جدید انداز میں پیش کیا ہے۔

عربی زبان میں جاحظ کی کتاب 'العرس والعرائس'، 'الہملی' کی 'کتاب الباہ'، ابن حاجب النعمان کی 'کتاب الفیتان'، جلال الدین سیوطی کی کتاب 'الانبیاح فی علم النکاح'، الف لیلہ ولیلہ اور شیخ لغزادی کی 'الروضۃ العاطر فی نزہۃ الخاطر' میں جنسی مباحث ملتے لے چرڈ برٹن نے اسے 'کٹنی مہتم' لکھا ہے۔ میراجی نے اس کا خوبصورت ترجمہ کیا ہے۔

ہیں شیخ انفرادی تیونس کا رہنے والا تھا۔ یہ کتاب اس نے ۱۷ ویں صدی میں ایک وزیر کی فرمائش پر لکھی تھی۔ رچرڈ برٹن نے روشنیہ المعطر کا نہایت دلاویز ترجمہ انگریزی میں کیا اور اس پر سیر حاصل حواشی لکھے۔ بعد میں اس کے ترجمے دنیا بھر کی زبانوں میں شائع ہوئے۔ جدید دور کے علمائے جنسیات ہیو ملار ایلس اور کینے نے بھی اس سے استفادہ کیا ہے اور اپنی کتابوں میں جا بجا اس سے اقتباسات دیئے ہیں۔ شیخ انفرادی نے مرد و عورت کی جنسی موافقت، رجولیت، ملاجعت اور آسنوں کے بارے میں شرح و بسط سے بحث کی ہے اور اپنے مطالب کی وضاحت کے لئے جا بجا دلچسپ کہانیاں بھی لکھی ہیں البتہ ان میں کہیں کہیں مبالغہ ہے جا سے بھی کام لیا ہے۔ شیخ انفرادی مقاربت کو محض بچے پیدا کرنے کا وسیلہ ہی نہیں سمجھتا بلکہ اسے صحت مند تقریح کا ذریعہ بھی مانتا ہے۔ رچرڈ برٹن نے "الف لیلہ و لیلہ" کا معرکہ آراء ترجمہ انگریزی میں کیا اور اس پر ہمیش قیمت حواشی لکھے۔ اس ترجمے کا تہہ نہایت معلومات افزا ہے اس میں ہم جنسیت کا اختصاصی مطالعہ کیا گیا ہے۔ جنسیات میں بین التہذیبی مطالعے کی اولیت بلاشبہ رچرڈ برٹن کو حاصل ہے۔

قدما، جنسی ملاپ کو ایک فطری عمل سمجھتے تھے اور اس سے بلا تکلف حظ اندوز ہوتے تھے۔ عیسائیوں نے جنسی ملاپ کے ساتھ جرم و گناہ کے جو مریضانہ احساسات وابستہ کر دیے۔ ہندویوں، یونانیوں، عربوں اور چینیوں میں ان کا نام و نشان نہیں ملتا۔ کلیسیائے روم کے آباء کلیمنٹ، آگسٹائن وغیرہ نے یہ کہہ کر کہ آدم اور حوا کو مقاربت کے جرم میں جنت سے نکال دیا تھا اور ان کا یہ جرم ہر بچے کو ورثے میں ملتا ہے، جنس کے ساتھ ازلی گناہ اور فحاشی کے تصورات وابستہ کر دیے جو مرور زمانہ سے عیسائی اقوام کے ذہن و قلب میں الجھنیں بن کر راسخ ہو گئے۔ یہیں سے اہل مغرب کی عورت دشمنی کا آغاز بھی ہوا اور عورت کو شیطان کا آلہ کار کہہ کر اسے مردود انالی قرار دیا گیا چنانچہ تاریک صدیوں میں ہزاروں عورتوں کو اس الزام میں

آگ میں جھونک دیا گیا کہ وہ جادوگریاں ہیں اور شیطان کے پاس خلوت میں جاتی ہیں نشاۃ الثانیہ کے دوران میں یونانی اور رومی علوم و فنون کے ساتھ قدام کے طرز حیات اور اخلاقی قدروں کا احیاء بھی ہوا اور شاعروں، فن کاروں اور نقاش نگاروں نے کھل کر حُسن و عشق کی ترجمانی کا حق ادا کیا۔ بوکاچیو اور شہزادی مارگریٹ کی کہانیوں، پیرار کا کے سامیٹوں، ولان کی نظموں سے پہلے کے حصوں، چامبر کی شاعری، شیکسپیر اور مولیئر کی تھیوں، ڈاؤنچی، ماسکیل اچھلو اور رافیل کی تصویروں میں نئے جمالیاتی احساس کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اٹھارویں صدی کو یورپ میں جنسی بے راہ روی کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ یہ بے راہ روی اُس رد عمل کی انتہائی صورت تھی جو ازمنہ وسطیٰ اور تحریک اصلاح کلیسیا کی رہبانیت کے خلاف ہوا تھا۔ دساد کے نادلوں "جتن" اور "جولیت" اور کیوس لیئڈ کے قہقہے "فینی ہل" میں اس دور کی جنسی زندگی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ انیسویں صدی میں وکٹوریہ کے عہد کی اخلاقی بندشیں عائد کر دی گئیں لیکن یہ محض دکھاوا تھا۔ ظاہری پاکبازی اور شائستگی کے پردے میں جنسی بے راہ روی کا بازار بدستور گرم رہا جیسا کہ "میری مخفی زندگی" کے گنام مصنف نے پورست کندہ بیان کیا ہے۔ اسی زمانے میں بخش نگاری کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ ادب میں یہ روایت بڑی حد تک انیسویں صدی سے یادگار ہے۔ اسی صدی میں سائنس کی ایجادات کے طفیل صنعتی انقلاب برپا ہوا اور اہل مغرب نے ایشیا، افریقہ اور امریکہ کے بیشتر ممالک پر جارحانہ تاخت کر کے انہیں اپنی مصنوعات کی کھست کے لئے وسیع منڈیوں میں بدل دیا۔ سامراج کے دوش بدوش عصمت فردشی کے کاروبار کو بھی وسعت ہوئی۔ ایشیا، افریقہ اور امریکہ کے شہروں میں بڑے بڑے قید خانے کھولے گئے جہاں ہزاروں سفید فام کسبیوں کو بھی دوسری مصنوعات اور اجناس کی طرح برآمد کیا گیا اور سفید غلامی منظم تجارت کی صورت اختیار کر گئی۔ فی زمانہ سنگاپور، ہانگ کانگ اور بیروت سفید غلامی کے بڑے مرکز ہیں۔

سائنس کی ترقی کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ علم الانسان، عمرانیات، حیاتیات، نفسیات اور

طب میں حیرت انگیز انکشافات کئے گئے جن کے نتیجے میں علم جنسیات کو بھی وسعت ہوئی۔ علم  
 الانسان اور تاریخ تمدن کی تحقیقات نے عصمت فروشی، بلوغت اور شادی کی رسوم اور جنسیت  
 کے مسائل پر نئے انداز میں روشنی ڈالی۔ مارگن، رابرٹسن سمٹھ، ٹامکر، فرینزر وغیرہ نے سورج کی  
 نئی راہیں دکھائیں۔ رابرٹ برفالٹ، ایڈورڈ ویسٹر مارک اور رچرڈ لیون سورمن نے بیش قیمت  
 معلومات ہم پہنچائیں۔ ان کی کتابوں کے مطالعے سے مفہوم ہوتا ہے کہ مختلف اقوام میں بلوغت  
 اور شادی کی رسوم کیا تھیں اور جغرافیائی، معاشی اور تمدنی تقاضوں کے تحت جنسی معمولات کس  
 طرح مختلف اقوام میں مختلف صورتیں اختیار کرتے رہے نیز اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ اوائل  
 تمدن میں صدیوں تک مادری نظام معاشرہ قائم رہا جس میں بکارت کو غیر ضروری بلکہ مذموم سمجھا  
 جاتا تھا۔ ننگ اور یونی کو بارہ آوری اور زرخیزی کے علامتی مظاہر سمجھ کر ان کی پوجا بڑے ذوق و  
 شوق سے کی جاتی تھی، عورت کو مرد پر سیادت حاصل تھی اور املاک کی وارث عورت ہی تھی۔ زریعی  
 انقلاب کے بعد صورت حال تبدیل ہو گئی اور عورت مرد کی ذاتی املاک بن کر رہ گئی۔ چنانچہ ضابطہ عوامی  
 اور عہد نامہ قدیم کے احکام عشرہ میں بیل گائے، بھیڑ بکری کی طرح عورت کو بھی مرد کی ذاتی املاک  
 میں شمار کیا گیا ہے۔ زریعی معاشرے میں بکارت کو عورت کی سب سے بڑی خوبی قرار دیا گیا کیوں  
 کہ مرد اپنی املاک اپنے ہی صلبی فرزندوں کو ورثے میں چھوڑنا چاہتا تھا۔ عمرانیات کے طلبہ  
 نے تاریخی شواہد سے ثابت کیا کہ عصمت فروشی کو ابتدائے تمدن میں ایک مقدس مذہبی ادا سے  
 کی حیثیت دی گئی تھی، بعد میں اسے عام کاروبار کی صورت میں منظم کیا گیا۔ ہر شس قلم،  
 پولی ایڈلر، فرینڈ ڈومزیک وغیرہ نے عصمت فروشی کے موضوع پر عضویاتی اور نفسیاتی  
 نقطہ نظر سے قلم اٹھایا اور جنسیات کی دنیا میں یہ نزاع شروع ہوئی کہ کوئی عورت خلتی اور  
 عضویاتی لحاظ سے کبسی ہوتی ہے یا ماحول اور سماج کے غلط اثرات اس کی گرامی کا باعث ہوتے  
 ہیں۔ یہ بحث آج بھی جاری ہے۔ کارل ٹنر خ البرٹس نے یہ سوال اٹھایا کہ ہم جنسیت ایک خلتی  
 میلان ہے جسے مجروری سے تعبیر کرنا تعصب ہے جا ہے اور جو لوگ خلتی طور پر ہم جنسی ہوں انہیں

مردود و نابکار کہنا قرین انصاف نہیں ہے نفسیات اور جنسیات کے عالم میں دوسری بڑی نفع ہے جنسی نفسیات میں فرانڈ، ہیولیاک ایلس، ہرش فیلڈ، کرافٹ ایننگ، ڈاکٹر مال، سیزر لومبروسو اور پاولو مانا گیزانے اہم انکشافات کئے اور ایڈکوشی، اینڈالسنڈی، نفسیات طفلی، جنسی ترغیب، اوائل شباب کے آشوب، ترکسیت، خود لذتی، شادی وغیرہ کے موضوعات پر خیال افروز بحثیں کی ہیں۔ ہمارے زمانے میں سچ لندے اور برٹنڈرسل نے ماقبل نکاح کے جنسی تعلق کے حق میں لالہ دیئے ہیں اور کہا ہے کہ نکاح سے پہلے دہا اور دہن سال دو سال کے لئے آزمائشی طور پر میاں بیوی بن کے رہیں تو ان کی شادی زیادہ خوشگوار ثابت ہوگی۔ یہ نظریہ اُس عظیم جنسی انقلاب کی پیش قیاسی کرتا ہے جو امریکہ اور یورپ میں صنعتی انقلاب کے بعد اشاعت پذیر ہو رہا ہے صنعتی انقلاب کے شیوع کے ساتھ ساتھ جہاں زرعی معاشرے کے معاشی، سیاسی اور تہذیبی نصب العین بدلتے جا رہے ہیں وہاں اس کے جنسی اخلاق کی پُرانی قدریں بھی دم توڑ رہی ہیں۔ نئے دور میں عصمت و محفّت اور نسوانی حیا کے معروف روایتی تصورات بھی بہت کچھ بدل گئے ہیں۔ میری سٹولس، پروست، جیمز جانس، برٹنڈرسل، ڈی ایچ لائسن، ہنری ملر، سارتر، سمون، دلوا، ماسٹرز جانسن وغیرہ کے خیالات کی اشاعت کے ساتھ مغرب میں نئے نئے جنسی رویے صورت پذیر ہو رہے ہیں اور قدیم بت پرست اقوام کی جنسی روایات کا احیاء عمل میں آ رہا ہے۔ ہماری صدی معاشی، سیاسی، عمرانی اور جنسی پہلوؤں سے عبوری دور کی حیثیت رکھتی ہے کیوں کہ اس میں زرعی معاشرے کی پُرانی اور صنعتی معاشرے کی نئی قدروں کے مابین شدید کشمکش جاری ہے۔ آنے والی صدیاں ہی بتا سکیں گی کہ نئے معاشرے میں کس نوع کا جنسی طرز عمل صورت پذیر ہوگا البتہ یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ زرعی معاشرے کی اخلاقی اور جنسی قدیں جدید صنعتی معاشرے میں اپنی موجودہ شکل و صورت میں باقی و برقرار نہیں رہ سکیں گی۔ ان تبدیلیوں کے آثار سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظام معاشرہ میں ابھی سے نمایاں ہونے لگے ہیں۔

علی عباس جلالپوری

جنوری ۱۹۷۵ء لاہور

# بلوغت اور اوائل شباب

بلوغت کا انحصار بڑی حد تک آب و ہوا پر ہے۔ گرم ممالک میں بالعموم باہر تیرہ برس کی عمر کا لڑکا لڑکی بالغ ہو جاتے ہیں جب کہ سرد ممالک میں بلوغت کا آغاز پندرہ سولہ برس کی عمر میں ہوتا ہے۔ افریقہ اور عرب کے بعض حصوں میں نو دس برس کی لڑکیاں بالغ ہو جاتی ہیں۔

فرانڈ نے جنسی جبلت کے ارتقاء کے تین مراحل گنائے ہیں۔ ۱۔ طفلی کی جنسیت، ۲۔ نضج، ۳۔ بلوغت

طفلی کی جنسیت : فرانڈ کے خیال میں شیرخوار بچے میں بھی جنسی خواہش موجود ہوتی ہے۔ اس کے ہونٹوں میں کھانے کی جبلت اور جنسی حظ جمع ہو جاتے ہیں چنانچہ وہ ماں کے پستان سے دودھ پیتے وقت بھوک اور جنسی خواہش دونوں کی تسفی بہ یک وقت کر لیتا ہے۔ بچہ اپنے اعضاء نہانی کے لمس سے بھی اک گونہ لذت محسوس کرتا ہے، انہیں ٹوٹتا ہے اور ان سے کھیلتا ہے۔ ان اور آیا اس کی ان حرکتوں کو نفرت اور تشویش کی نگاہ سے دیکھتی ہیں اور ڈانٹ ڈپٹ کر اسے ان سے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہیں جس سے بچے کے ذہن میں جنس کے ساتھ جرم اور گناہ کے احساسات وابستہ ہو جاتے ہیں جو اس کے سرچشمہ حیات کو مکرر کر دیتے ہیں۔ بلوغت کے دور کی جنسی کج رویوں کی بنیاد بھی ماں باپ کے غلط رویے کے باعث اسی دور میں پڑتی ہے۔ با اوقات ماں باپ بچے کو اپنا عضو خاص ٹوٹے دیکھ کر اسے قطع کر دینے کی دھمکی دیتے ہیں جس سے بچہ 'خشتہ کی الجھن' میں مبتلا ہو جاتا ہے اور ختنے کا خوف بعد میں ضمیر کا خوف بن کر نمودار ہوتا ہے۔ یہی الجھن بلوغت کے بعد بچے کو خود کاری کی طرف مائل کرتی ہے۔ ختنی لڑکیاں اپنے بھائی کو

کے عضو خاص کو دیکھ کر اس دم میں مبتلا ہو جاتی ہیں کہ ان کی امی نے ان کا عضو خالص قطع کر دیا ہے اور وہ ساری غمراں کا یہ تصور معاف نہیں کرتیں۔ نسوانی شرم و حیا اسی نقص کو چھپانے کی کوشش کا نام ہے۔ فرائڈ کے ان خیالات سے بعض علمائے نفسیات نے اختلاف کیا ہے لیکن فرائڈ کے اس ادعا کو عام طور سے تسلیم کر لیا گیا ہے کہ بچے کی جنسی زندگی کا آغاز پیدائش کے وقت ہو جاتا ہے۔ فرائڈ کے بعض پیرو جنس میں بھی جنسی خواہش کے وجود کو مانتے ہیں۔

**خفتگی۔** دوسرا مرحلہ خفتگی کا ہے جو بچے کی شیرخوارگی کے خاتمے سے شروع ہو کر بلوغت کے طلوع تک رہتا ہے۔ ان سالوں میں جنسی خواہش پس منظر میں چلی جاتی ہے لیکن اس کا اظہار بالواسطہ لڑکوں اور لڑکیوں کے کھیلوں میں ہوتا رہتا ہے۔ لڑکے لڑکیاں بسا اوقات دھبا دھبن یا ڈاکٹر مرلیض کی اداکاری کرتے ہیں۔ لڑکیاں گڈے گڑیا کا نالک رچاتی رہتی ہیں۔

**بلوغت۔** بارہ تیرہ برس کی عمر میں لڑکے لڑکی کے جنسی غدود ہارمون پیدا کرنے لگتے ہیں، قد بڑھ جاتا ہے، لڑکے کی آواز بھاری ہو جاتی ہے۔ دھکی کے سینے پر ابھار آنے لگتا ہے اور اعضاء نہانی پر بال اگ آتے ہیں۔ بعض خوبصورت گول مٹول لڑکے بد وضع لم ڈھینگ بن جاتے ہیں، بعض بے ڈول کم رول لڑکیاں دیکھتے دیکھتے جادو نگاہ سیناؤں کا روپ دھار لیتی ہیں گویا انہوں نے کیپلی بدل لی ہے۔ لڑکوں کو پورا جوان بننے کے لئے کئی سال درکار ہوتے ہیں جب کہ لڑکیاں چند ماہ میں پوری عورتیں بن جاتی ہیں۔ ان جسمانی تبدیلیوں کے ساتھ ایک نامعلوم اضطراری کیفیت انہیں اپنی گرفت میں لے لیتی ہے، ہم جولیوں اور اپنی بے بنی غم کے لڑکوں لڑکیوں کی باتیں بڑی چسپی سے سنی جاتی ہیں جن میں اشاروں کنایوں میں بچے کی پیدائش کے عمل سے بحث کی جاتی ہے اور اعضاء نہانی کے بارے میں قیاس آریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ لڑکوں کی نسبت لڑکیاں زیادہ متحسّس ہوتی ہیں۔ وہ بلوغت کے لئے سمحت سے چین ہوتی ہیں اور ایام کا بڑی بے صبری سے انتظار کرتی ہیں اگرچہ پہلی بار خون حیض جاری ہونے پر دہشت زدہ بھی ہو جاتی ہیں۔ جب ایام شروع

لے اے EMBRYONIC SEXUALITY کہتے ہیں۔

ہو جائیں تو وہ ایک دوسری کو خیریت پاتی ہیں کہ میں جوان ہو گئی ہوں۔ لڑکی کی بلوغت کی علامت ایام کا آنا ہے، لڑکوں میں اعتلام بلوغت کی نشاندہی کرتا ہے۔ بعض لڑکے لڑکیاں جو بلوغت کے حقائق سے بے خبر ہوتے ہیں ایام کے آنے پر یا اعتلام ہونے پر سخت فکر مند ہو جاتے ہیں کہ شاید میں کوئی مرض لگ گیا ہے۔ بلوغت کا ذکر کرتے ہوئے سمون دلوا لکھتی ہیں۔

”اولیٰ شباب میں جذبات میں حیا اور انتشار پیدا ہو جاتا ہے، خواہشات میں ابری اور تضاد نمایاں ہو جاتا ہے، خیالات پریشان ہو جاتے ہیں، لڑکیاں رومانی ناول بڑے ذوق سے پڑھتی ہیں، عشقیہ فلمیں دیکھتی ہیں اور اپنے محبوب اداکاروں سے پیار کرنے لگتی ہیں۔ وہ اپنے ملنے والے نوجوانوں میں محبوب اداکاروں کے خدو و خال تلاش کرتی ہیں۔ وہ اپنی شکل و صورت اور لباس کے بارے میں حساس ہوتی ہیں اور معمولی سی نکتہ چینی بھی برداشت نہیں کر سکتیں۔ بات بات پر ٹھٹھکنے اور الجھنے لگتی ہیں۔ ماں باپ ان کی کسی حرکت پر گرفت کریں تو خود کشی پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ وہ بسا اوقات ایک دوسری کی محبت میں یا اپنی استانیوں کے پیار میں مبتلا ہو جاتی ہیں اور ہر ممکن طریقے سے لڑکوں کی توجہ جذب کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ جب کوئی لڑکا ان میں دلچسپی کا اظہار کرے تو وہ اپنی سہیلیوں کو فخریہ اپنی فتح کا حال سناتی ہیں کہ اُس نے مجھی کو منتخب کیا ہے۔ اس سے ان کا اعتماد اپنے سُن کوشش پر بحال ہو جاتا ہے۔ خوبصورت لڑکیاں لڑکوں کو تنگی کا ناچ نچا کر بڑی خوش ہوتی ہیں۔ ہر لڑکی کی دلی تمنا ہوتی ہے کہ اُس کے حسن و جمال، لباس کی تلاش خراش اور ذوق زیبائش و آرائش پر داد دی جائے۔ اُس کے بالوں، آنکھوں یا بدن کے تناسب کی تعریف کی جائے تو وہ خوشی سے چھوٹے نہیں سہتیں۔“

عمر کے اس نازک دور میں نوجوان اپنی شکل و صورت کے بارے میں بڑے حساس ہوتے ہیں۔ لڑکیاں

اپنی سے زیادہ خوبصورت ہیلوں کو دیکھ کر رشک اور حسد کی آگ میں جلتی ہیں۔ لیوٹا لٹائے اپنی سوانح عمری میں لکھتا ہے کہ وہ اپنے بھائیوں میں سب سے زیادہ بد صورت تھا۔ اپنی بد صورتی کا یہ تلخ احساس اُسے عمر بھر ستاتا رہا۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑا اپنے گنواروں کے جیسے کٹے جڑے بھونڈی ناک اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو دیکھ کر کڑھتا رہتا تھا۔ لکھتا ہے۔

”میرے خیال میں کسی شخص کی زندگی پر رب سے زیادہ فیصلہ کن اثر اس کی خوبصورتی یا بد صورتی کا ہوتا ہے اور اس سے بھی زیادہ اثر اس بات کا ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو کچھ شش خیال کرتا ہے کہ بد شکل سمجھتا ہے۔“

اولیٰ شباب کے جذباتی فشار کا ذکر کرتے ہوئے برٹنڈرسل لکھتے ہیں۔

”میں چاندنی راتوں کو پاگلوں کی طرح ادھر ادھر گھوما کرتا تھا۔ اس کا سبب شدید جنسی خواہش تھی لیکن اُس زمانے میں مجھے اس بات کا علم نہیں تھا۔“

نوجوانوں کے جذبات میں ہر وقت مہمان پارہتا ہے۔ وہ چھوٹی سی بات پر خوشی سے اُپھٹنے لگتے ہیں اور معمولی بنا پر مُنہ بسورنے لگتے ہیں۔ یہ رقیق جذباتیت انہیں جن سے نہیں سمجھتے دیتی نوجوان لڑکیاں چاہتی ہیں کہ اُن کی بلند از جلد شادی ہو جائے تاکہ وہ خود مختار ہو جائیں اور ماں کی ہر وقت کی نکتہ چینی اور دانٹا کھلکھل سے نجات پالیں۔ بعض لڑکیاں ماں کے درشت رویے سے تنگ آ کر گھر سے بھاگ جاتی ہیں۔ وہ پیار کے لئے حسرتی رہتی ہیں اس لئے جب کوئی نوجوان اُن سے اظہارِ محبت کرتا ہے تو وہ دل و جان سے اُس پر فدا ہو جاتی ہیں۔ بعض لڑکیاں اپنی بکارت کھو کر ماں کے خلاف بغاوت کا اظہار کرتی ہیں۔ جی، بی شانے کہا ہے کہ ایک انگریز لڑکی سب سے زیادہ اپنی ماں سے نفرت کرتی ہے لیکن اس کے ساتھ وہ ماں کی شفقت اور پیار کی آرزو مند بھی ہوتی ہے جو اُسے شاذ و نادر ہی ملتا ہے۔ نوجوان لڑکیوں کو سب سے بڑا صدمہ اُس وقت ہوتا ہے جب وہ کسی لڑکے کو بھانسنے میں ناکام رہتی ہیں۔ ایک لڑکی نے جھٹاکر کہا تھا ”کاش وہ میری جانب مائل ہو جاتا اور میں

اسے رد کر سکتی ہے، جنسی مواصلت کے بارے میں سخت محسوس ہونے کے باوجود وہ اُس سے مستغفر بھی ہوتی ہیں۔ ایک لڑکی کا پہلی بار بوسہ یا گیا تو اُسے سخت کراہت محسوس ہوئی اور اُس نے غسل خانے میں جا کر اپنے دانت برش سے صاف کئے۔ ایک اور لڑکی نے پہلی بار کے جنسی ملاپ کے بعد خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی۔ بہار اور خزاں کے موسموں میں نوجوانوں کا جنسی جذبہ غیر معمولی تندی سے بھرک اٹھتا ہے۔ ان موسموں میں طوفان آتے ہیں۔ آندھیاں جاتی ہیں اسی طرح انسان کے اندرون میں بھی طغیانی مچ جاتی ہے۔ بہار کے ساتھ عشقیہ شاعری کا تعلق ظاہر ہے۔ بہار کا بخار، نوجوان لڑکے لڑکیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے تو وہ رجزِ خوابی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اُن کے رگ و پے میں نفس پروردِ شنگی کی کیفیتِ نفوذِ کرباتی ہے۔ قدیم زمانے میں موسمی اور فصلی تہواروں اور میلوں پر جنسی مواصلت کی آزادی دی جاتی تھی جس سے بہار کا بخار، اتر جایا کرتا تھا۔

وحشی قبائل آغازِ تاریخ سے بلوغت کی رسوم ادا کرتے رہے ہیں۔ افریقہ، آسٹریلیا اور جزائرِ غربِ الہند کے وحشی قبائل میں یہ رسمیں آج بھی باقی ہیں۔ وہ انہیں صحت مند جنسی زندگی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ ختمہ کرنے یا بظرفِ قطع کرنے کی رسمیں آج بھی ادا کی جاتی ہیں۔ ان کی ادائیگی کے بعد لڑکے اور لڑکی کو بالغ مرد اور عورت تسلیم کر لیا جاتا ہے اور انہیں قبیلے کی ذمہ داریاں سونپ دی جاتی ہیں۔ لڑکوں کو خاص طور سے کڑی آزمائش کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بعض اوقات اُن کے اگلے دانت توڑ دیئے جاتے ہیں، انہیں کانٹوں کے بستر پر ٹایا جاتا ہے یا اُن کا بدن آگ میں پتائے ہوئے لوہے سے داغا جاتا ہے۔ اس کے دوران میں کوئی لڑکا یا عورت مار دے یا رو دے تو اُسے بالغ تسلیم نہیں کیا جاتا اور کوئی لڑکی اُس سے بیاہ کرنے پر رضامند نہیں ہوتی۔ ان عذابِ ناک آزمائشوں میں پورا اترنے کے بعد اُسے ہتھیار دیئے جاتے ہیں، شکار میں شریک کیا جاتا ہے اور اُسے عورتوں سے تنہا کی اجازت مل جاتی ہے۔ وحشی خونِ حیض سے سخت خوفزدہ ہو جاتے ہیں چنانچہ ایام کے دوران میں لڑکیوں کو بستی سے دور علیحدہ چھوڑ پڑے میں رکھا جاتا ہے۔ اُن کے فیصل

میں مخالفہ خطرناک اور ناپاک ہوتی ہے۔ اُس میں ایک قسم کی فلسفاتی قوت پیدا ہو جاتی ہے جس سے بچنا لازم ہے۔ مخالفہ کا یہ طبقہ بعض مہذب اقوام میں آج بھی برقرار ہے۔ جیمز فریزر کہتا ہے کہ بعض قبائل میں بلوغت کے وقت لڑکی کو سورج کی شعاعوں سے اوجھل رکھتے تھے مبادا وہ سورج کی روشنی کو اودھ نہ کر دے یا اُس کی شعاعوں سے حاملہ ہو جائے۔

بلوغت کے وقت قدرتنا جنسی خواہش بڑھ اٹھتی ہے۔ چودہ اور سترہ برس کی عمر کے درمیان نوجوان جنسی ملاپ کے بارے میں سخت محسوس ہوتے ہیں۔ مشکیل کے خیال میں انہی سالوں میں اکثر و بیشتر لڑکیاں اپنی بکارت کو بیعتی ہیں۔ اُنیں برس کی عمر کے بعد البتہ جنسی خواہش میں اعتدال آجاتا ہے۔ جوان لڑکیاں اپنے ہم عمر لڑکوں کو سچے سمجھ کر انہیں حقارت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں اور اپنی عمر سے بڑے نوجوانوں میں دلچسپی لیتی ہیں۔ پندرہ اور اٹھارہ برس کی عمر کے درمیان لڑکیاں اپنے تخیل میں مثالی مرد کا تصور بسالیتی ہیں جو اکثر اوقات کوئی مشہور ایکٹر ہوتا ہے۔ فرائد کے خیال میں بلوغت کے بعد جنسی خواہش خود لذتی اور ہم جنسیت کے مراحل سے گذر کر بالآخر صنفِ مخالف سے وابستہ ہو جاتی ہے لیکن یہ ارتقاء مشکلات سے خالی نہیں ہوتا۔ ہم ان مراحل کا ذکر قدرے تفصیل سے کریں گے۔

خود لذتی کی ترکیب ہیویلاک ایلس نے وضع کی تھی۔ یہ خود کاری سے وسیع تر مفہوم رکھتی ہے۔ خود کاری کا مطلب ہے اپنے اعضاء نہانی کو مختلف طریقوں سے چھڑک کر منزل ہونے کی کوشش کرنا۔ خود لذتی میں بغیر کسی خارجی وجود کے توسط کے اپنے ہی جسم سے حظ اندوز ہونے کی کوشش کی جاتی ہے۔ خود لذتی اور نرگسیت لازم ملزوم ہیں۔ نرگسیت انا کا جنسی پہلو ہے اس کا مطلب ہے اپنی ذات سے محبت کرنا۔ لڑکوں کی بہ نسبت لڑکیوں میں نرگسیت کی جانب زیادہ میلان پایا جاتا ہے۔ لڑکوں میں یہ میلان زنانہ مزاجی کی علامت ہے۔ نوجوان لڑکیاں قدیم آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے جسم کے دلاویز زادیوں کو مختلف پہلوؤں سے دیکھ دیکھ کر

محفوظ ہوتی ہیں اور بعض اوقات بے اختیار پکار اٹھتی ہیں ”اُف! میں کس قدر حسین ہوں!“ سمجھنا  
 دلوں اکٹھتی ہیں۔

”نوجوان دوشیزہ اپنے بدن سے نفس پرور محبت کرتی ہے، اپنے آپ سے پیار  
 کرتی ہے، اپنے بوسے لیتی ہے، اپنے برہمنہ کندھوں اور بازوؤں کو چومتی ہے،  
 اپنی ٹانگوں اور چھاتیوں کو گھورتی ہے۔ آغاز شباب ہی سے اُس کے دل و دماغ  
 میں اپنی ذات کی محبت اور مرد کی طرف راغب ہونے کی تفتابیں شمشک پیدا  
 ہو جاتی ہے۔ یہ نرگسیت جنسی بختگی آنے پر رفع ہو جاتی ہے..... نوجوان دوشیزہ  
 عالم حقائق سے منہ موڑ کر اپنے ہی حسین بدن کے جادو پر عقیدہ رکھتی ہے۔  
 جادو جو مردوں کو اس کا مطیع کر دے گا بعض لڑکیاں اپنے برہمنہ اعضاء ایک  
 دوسری کو دکھاتی ہیں، آپس میں چھاتیوں کا مقابلہ کرتی ہیں اور عام و خاص پوروں  
 کا تبادلہ کرتی ہیں۔“

بسا اوقات نوجوان نفسانی میجان کے سیلے میں بے اختیار بہہ جاتے ہیں، اپنے جذبات کی غور  
 پر قابو نہیں پاسکتے اور خود کاری کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ عام حالات میں اُن سے بڑی عمر کے  
 لڑکے لڑکیاں انہیں گراہ کرتی ہیں لیکن بعض دفعہ نفسانی میجان بھی انہیں خود کاری کے طریقے دکھا  
 دیتا ہے اور وہ کسی نہ کسی طرح جنسی خواہش کے جوش و خروش کو رفع کر لیتے ہیں۔ برہمنہ نرگس  
 لکھتے ہیں۔

”پندرہ برس کی عمر میں ڈسک کے ساتھ لگ کر بیٹھتے ہوئے مجھے سخت خیزش ہوتی  
 اور میں جلق لگانے لگتا البتہ اس میں میں نے کثرت کبھی نہیں کی ہیں اس پر  
 شرمسار ہوتا اور اسے ترک کرنے کی کوشش کرتا تاہم میں بیس برس کی عمر تک  
 جلق لگاتا رہا تا آنکہ عشق میں مبتلا ہوا اور میں نے یہ عادت ترک کر دی۔“ جنسی

جذبہ کے اس اُبال کے ساتھ میری مثالیت پسندی کے احساسات وابستہ تھے جن کے بارے میں سبوز مجھے علم نہیں تھا کہ یہ جنسی خواہش پر مبنی ہیں۔ مجھے بادلوں اور شفق، بہار اور خزاں کے درختوں کے صن میں بے حد دلچسپی محسوس ہونے لگی لیکن یہ دلچسپی جذباتی نوع کی تھی اور جنس کے لاشعوری ارتقاع کی ایک صورت تھی میں اس میں خزاں تلاش کیا کرتا تھا۔“

ضی میں سلاطین اور امراء کے بعض گھرانوں میں فوئیز لڑکوں کو حلق سے بچانے کے لئے انہیں بالغ ہونے پر لونڈیاں دی جاتی تھیں۔ مہمدی یوان ہوا تو اس کے باپ منصور نے اسے ایک کیز حیاۃ عطا کی تھی۔ لیوناسٹائے لکھتا ہے کہ اس کا بھائی نکولس سولہ برس کا ہوا تو اس کے باپ نے نکولس کو ایک لونڈی تھی تاکہ وہ بے راہ روی سے محفوظ رہے۔ اس لونڈی کے لہجے سے نکولس کا ایک بیٹا بھی پیدا ہوا تھا۔ جدید تمدن میں جنسی خواہش کو بھڑکانے کے سامان تو بہت ہیں لیکن اس کی آسودگی کے وسائل کم ہیں۔ فوئیز عالیانہ گیت سن سن کر اور موس پر در فلمیں دیکھ دیکھ کر از خود رفتہ ہو جاتے ہیں اور نفسانی عیجان سے نجات پانے کے لئے خود کاری سے رجوع لاتے ہیں۔ کینے کی پورٹ کے مطابق امریکہ میں ۹۲ فی صد لڑکیاں سینڈہ برس کی عمر میں خود کاری کرتی ہیں البتہ جنسی مواصلت میسر آنے پر اسے ترک کر دیتی ہیں۔ کلاسٹر کی تحقیق یہ ہے کہ ناروے سویڈن میں دو تہائی لڑکیاں سولہ برس کی عمر میں خود کاری کرتی ہیں اور اکثر و بیشتر لڑکے حلق لگاتے ہیں۔

حلق کے اثرات کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ریٹے دگورمول اور اس کے ہم خیال کہتے ہیں کہ حلق لگانا عین فطری ہے۔ فوئیزی کے نازک مرحلے پر کبھی کبھار حلق لگانے یا خود کاری کرنے سے لڑکے اور لڑکیوں کو اعصابی آسودگی اور جنسی تسکین میسر آتی ہے۔ ہیو بلاک ایس کے خیال میں حلق لگانے سے جسم کی بہ نسبت ذہن زیادہ مائل ہوتا ہے کیوں کہ اس سے فوئیز احساس جرم میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ جرم یا گناہ کا یہ تلخ احساس نہ ہو تو حلق چنڈاں ضرر رساں نہیں ہوتی۔ فرائد کہتا ہے کہ حلق سے جو ذہنی کرب اور احساس جرم کی اذیت محسوس ہوتی ہے وہ جسمانی حرر سے

کہیں زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ اس کے خیال میں ہر نوعیت کو خود لذتی کے مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے  
 خلق اور خود کاری نوعیتوں کے نفسانی سیمان کی تسکین کا باعث ہوتی ہے۔ شیر خوار بچے بھی خود کاری  
 سے محفوظ ہوتے ہیں اور نوعیتوں میں اسی میلان کا احیاء ہوتا ہے۔ اکثر ڈاکٹروں اور تحلیل نفسی کے  
 طلبہ کے خیال میں کبھی کبھار کی خود کاری یا خلق ضرر رساں نہیں ہوتی البتہ اس کی کثرت و مداومت  
 جسمانی و نفسیاتی صحت کو تباہ کر دیتی ہے۔ اس سے لوگوں کو زیادہ نقصان پہنچتا ہے کیوں کہ مادہ  
 منویہ کا بکثرت اخراج ان کے اعصاب کو مضمحل اور توانائی کو ختم کر دیتا ہے۔ فرائد کہتا ہے۔  
 ”ڈاکٹر خلق کے مضر اثرات کو قابل اہتمام نہیں سمجھتے جب کہ مریض کہتے ہیں کہ ان کے  
 جملہ حواس کا اصل سبب خلق ہی ہے۔ میرے خیال میں مریض ٹھیک ہی کہتے ہیں۔“

ڈاکٹر میری سٹولس لکھتی ہیں ۱۰

”مردانہ کمزوری، سرعت انزال وغیرہ کا ایک اہم سبب خلق ہے۔ اکثر نوعیتوں کے  
 لوگیاں خلق لگاتے ہیں۔ مذی کے اخراج سے مرد کا عضو خاص دخول میں کوئی وقت  
 محسوس نہیں کرتا لیکن ہاتھ یا کسی دوسری شے کی رگڑ سے خشک اور عضو مخصوص کی رگوں  
 کو نقصان پہنچتا ہے اور وہ پوری طرح نشوونما نہیں پاسکتا جس سے آدمی مقاربت  
 کے قابل نہیں رہتا۔ کبھی کبھار خلق لگانے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن نوعیتوں کے  
 دوران میں کثرت و تواتر سے خلق لگانا تباہ کن ہے۔ خلق کے ساتھ گناہ کی الجھن  
 وابستہ ہو جاتی ہے جو اکثر اوقات سرعت انزال کا باعث ہوتی ہے مملوک کو احساں  
 گناہ سے نجات دلانا ضروری ہے۔ جو لوگ کبھی کبھار خلق لگاتے ہیں ان کی صحت پر  
 کوئی ناخوشگوار اثر نہیں پڑتا۔“

عام حالات میں نوعیت کبھی کبھار خلق لگا کر جنسی تسکین حاصل کر لیتے ہیں لیکن بعض نوعیتوں کو لازمی طور پر  
 تحت خلق لگاتے ہیں یا خود کاری سے رجوع لاتے ہیں۔ ان کی اکثریت ایسے نوعیتوں پر مشتمل ہوتی ہے

جو ماں باپ کی محبت سے محروم ہوتے ہیں یا اپنی بد صورتی کے باعث جذبِ توجہ سے قاصر رہتے ہیں۔ اس محرومی کے باعث وہ روزِ خوابی کی حالت میں تخیلاتی معاشقے کرتے ہیں۔ ان کے لئے جلتی یا خودکاری ایک جبری فعل کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ یہی وہ توجیز ہیں جن کے لئے جلتی یا خودکاری نہایت ضرور رساں ہوتی ہے۔

کثرتِ جلتی بلاشبہ ایک توجیز کے جسم اور ذہن کے اکثر عوارض کا سبب بن جاتی ہے۔ بارہ، تیرہ برس کی عمر میں کثرت و تواتر سے جلتی لگائی جائے تو اعضائے تناسل کی نشوونما رک جاتی ہے۔ کوتاہی، لاغرئی اور بکمی کے باعث مخلوقِ مقاربت کے قابل نہیں رہتا، اُس کا نظامِ عصبی ماؤف ہو جاتا ہے اور ذکاوتِ حس کے باعث سرعتِ انزال میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اُس کا بدن کمزور اور ناتواں ہوتا ہے، آنکھیں اندر دھنس جاتی ہیں، اُن کے گرد سیاہ حلقے نمودار ہو جاتے ہیں، آنکھوں کی پتلیاں بے رونقی اور بے نور ہو جاتی ہیں، چہرے کا رنگ مٹایا ہو جاتا ہے، چہرے پر پھنسیاں نکل آتی ہیں، ہاتھ پیرے جھگے اور سرد رہتے ہیں، حافظہ کمزور ہو جاتا ہے، بات کرتے وقت وہ محال سے آنکھ نہیں ملا سکتا نہ کسی مسئلے پر غور و فکر کر سکتا ہے، اُس کا اعتمادِ نفس مجروح ہو جاتا ہے، مزاج سمجور نہیں رہتا، عزم و حوصلہ سے عاری ہو جاتا ہے، متلون مزاج اور چڑچڑا ہو جاتا ہے اور ٹوٹے پھوٹے جملوں میں بات کرتا ہے، دوسرے ہم سنوں کی صحبت سے گریز کرتا ہے اور کھیلوں میں حصہ نہیں لیتا، یکہ و تنہا ادھر ادھر گھومتا پھرتا ہے، لباس کے معاملے میں بے پروا ہوتا ہے، بدن کی صفائی کا خیال نہیں رکھتا، شادی کے نام سے گھبراتا ہے، جوانِ عورت سے بات کرتے ہوئے اُس کے پسینے پھوٹ جاتے ہیں اور دل دھک دھک کرنے لگتا ہے۔ وہ عصبی المزاجی اور تنویش کی الجھن میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ بس میں سفر کر رہا ہو تو ڈنٹا رہتا ہے کہ کہیں اُس کی ٹکڑ نہ ہو جائے، سینما ہال میں بیٹھا ہو تو اوپر دیکھتا ہے کہ کہیں چھت نہ گر پڑے۔ اُس کی اقدام اور پیش رفت کی قوت سلب ہو جاتی ہے اور اُس میں مر لطفانہ جھجک پیدا ہو جاتی ہے۔ نفسیاتی رکاوٹ کے باعث وہ معمولی سا کام بھی سلیقے سے نہیں کر سکتا مثلاً ٹیکسی

ولے کو آواز دیتے وقت، کھڑکی سے ٹکٹ خریدتے وقت، ریل میں سوار ہوتے ہوئے، پبلک بیت الخلاء کو استعمال کرنے وقت گھبرا جاتا ہے۔ وہ نہ کسی کے مذاق پر کھل کر ہنس سکتا ہے اور نہ کسی کی مصیبت میں کسی سے اظہارِ ہمدردی کر سکتا ہے۔ اُس کی خاموشی اور لبِ بستگی کے باعث لوگ اُسے متکبر سمجھنے لگتے ہیں کیوں کہ وہ اُس کے عجیب و غریب طرزِ عمل کے اصل سبب سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اُسے اپنی المناک حالت کا احساس ہوتا ہے اور وہ چوری چھپے اپنا علاج بھی کرتا ہے لیکن مستندِ معالج کے پاس جا کر صاف صاف اپنا حال نہیں بتا سکتا۔ اشتہاری عطائیوں سے دوائیں منگو کر کھاتا رہتا ہے جس سے اُس کی رہی سہی صحت بھی جواب دے جاتی ہے۔ وہ زندگی کے حقائق سے گریز کر کے بڑے بڑے بلندِ نصب العین اپنا لیتا ہے اور ہیر و ہننے کے خواب دیکھنے لگتا ہے، ادبی ذوق سے بہرہ ور ہو تو معیار سے گرا ہوا ادب تخلیق کرتا ہے۔ اُس کے احساس میں جو ذکاوت اور تخیل میں جو خوابِ ناکمی سی آ جاتی ہے وہ اُس کے شعروں اور قصوں میں بھی رقیقِ جذباتیت اور المناک افسردگی کا رنگ بھرتی رہتی ہے۔

نوفیروں کو کثرتِ حلق سے علت سے بچانے کی ذمہ داری باپ پر عائد ہوتی ہے کیوں کہ نوفیری کے مرحلے پر لڑکے سے توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ مناسب جنسی معلومات سے بہرہ مند ہوگا اور کثرتِ حلق کے اثرات و نتائج کا وقوف رکھے گا۔ لڑکا بارہ تیرہ برس کا ہو جائے تو باپ پر لازم ہے کہ وہ اُس پر نگاہ رکھے۔ لڑکے کو غلغلہ کرے میں سونے کا موقع نہ دے بلکہ رات کو اُس کی چارپائی اپنے پاس بچھوائے، اُسے ٹھنڈے پانی سے غسل کرنے کی ترغیب دلائے، اُس کے چھوٹے موٹے عقلمے سلجھانے کی کوشش کرے اور اُسے جا بجا سرزنش نہ کرے۔ ایک نوفیر کے لئے بیکار بیٹھنا زہر ہے۔ اُس کے اوقاتِ عمل ایسے مُعین کئے جائیں کہ وہ ہر وقت مطالعے یا صحت مند قسم کے کھیل تفریح میں مصروف رہے۔ میں یہاں ایک لڑکے کی مثال دوں گا۔

حمید — یہ نام فرضی ہے — پیری جماعت میں پڑھتا تھا۔ وہ اکثر جماعت سے غیر حاضر رہتا یا چُپ چاپ اپنی نشست پر بیٹھا رہتا۔ وہ آنکھوں پر گہرا سیاہ چشمہ لگاتا تھا اور جماعت کی کسی

بحث میں حصہ نہیں لیتا تھا۔ جب کبھی اُس سے کوئی سوال پوچھا جاتا تو وہ سر ہٹائے چپ چاپ اپنی جگہ کھڑا ہو جاتا اور ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑانے لگتا جس پر دوسرے لوگ ہنسے لگتے۔ کالج میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد ایک دن حمید تھکتا، سمٹا ہوا میرے پاس آیا اور دیر تک بیٹھا ادھر ادھر کی بے تکلی بائیں کرتا رہا۔ اُس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا اور آنکھوں میں شکار کئے جانے والے جانور کی کرب ناک وحشت تھی۔ آغز ایسی آوازیں جو معمولی آواز سے چڑھی ہوئی تھی اور جس میں ایک دبی دبی سی چیخ محسوس ہوتی تھی یکبارگی وہ اپنا دکھارونے لگا۔ اُس نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں کم اشاروں کی باتوں میں زیادہ مجھے اپنی پیتا ستانی پھر گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور اجازت طلب کی۔ جلتے وقت وہ اپنی نوٹ بکس میرے پاس چھوڑ گیا اور کہنے لگا کہ جو کچھ میں زبانی نہیں بتا سکا وہ ان میں پڑھ لیجئے گا پھر باجٹیم نم بولا آپ میرے مشفق استاد ہیں میں آپ سے امداد کا طالب ہوں خدا را میری مدد کیجئے آپ میرا آخری سہارا ہیں۔ اس کے بعد وہ پورا ایک سال ہفتے میں ایک بار میرے پاس آتا رہا اور جو باتیں میرے سامنے نہ کہہ سکا وہ اپنے خطوط میں لکھ کر بھیجتا رہا۔ اُس کے خطوط میرے پاس موجود ہیں۔ ان میں سے کچھ اقتباسات درج ذیل ہیں۔

”اس وقت میرے چاروں طرف تفکرات، مایوسیوں، درد و کرب، الجھنوں، پریشانیوں، غمزدگیوں کے بادل چھا گئے ہیں اور میں تھکی ہوئی نڈھال آنکھوں سے انہیں دیکھ رہا ہوں میں ان کا مقابلہ کرتے کرتے اب تھک گیا ہوں۔ میں اب اس بوجھ کو مزید اپنے کمزور و ناتواں کندھوں پر ڈال کر چند قدم بھی نہیں چل سکتا۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے اندر اب موت کی خواہش پیدا ہو رہی ہے۔“

”آج آپ جس شخص کو سامنے بیٹھا ہوا دیکھ رہے تھے اُس کی ان آنکھوں کی اوٹ میں زبردست طوفانی مچل مچل ہوئی تھی۔ میں نے کئی مرتبہ کوشش کی لیکن میں اپنے اس روحانی ودلی کرب و اذیت، تکلیف، زخموں کو مناسب و موثر طریقے سے آپ کو دکھانے میں ناکام رہا۔ میں اس درد و کرب کو ذہنی عیاشی کا ذریعہ بنا سکتا ہوں مگر روحانی عیاشی کا نہیں اس لئے کہ روح کو خوشی سے واسطہ ہے نہ کہ عیش سے۔ جب سے میں نے ظلم زندگی یا طوفان دیکھی ہے میں اتنا پریشان، غمزدہ، درد و کرب میں

مبتلا ہوں کہ میں دنیا بھر کے الفاظ استعمال کرنے کے بعد بھی اس کو درست طریقے پر بیان نہیں کر سکتا۔ میں ایک زندہ لاش ہوں جو ادھر ادھر رنگ رہی ہو اس احساس کے ساتھ کہ آج میں واقعی مُردہ ہوں۔ میں اب مرجانا چاہتا ہوں۔ کاش مجھ میں مرنے کی ہمت ہو جائے۔ اب میری پُرانی لائیٹس ٹوٹ رہی ہیں۔ اب مجھ کو اگر کوئی مناسب بہار نہ ملتا تو میں کمر قہیدہ کے ساتھ نیچے گر پڑوں گا اور پھر کبھی آپ کے پاس نہیں آؤں گا۔“

”میں اپنا دُہلا پتلا جسم دیکھ کر شدید خود ترسی میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ میرے اندر بیخیال ابھرتا ہے کہ مجھے ٹی بی ہو جائے گی اور اب میں مرجاؤں گا لیکن میں یہ نہیں سمجھنے دوں گا۔ میں اس طرح گھٹ گھٹ کر جسمی عذاب کے ساتھ ہرگز مرنے کے لئے تیار نہیں ہوں، میں خود کشی کو ترجیح دوں گا لیکن میں زندگی موت کی اس جدوجہد کے دوران ایک داؤ، آخری داؤ ضرور لگانا چاہتا ہوں میں اب موبوم اُمیدوں کے سہارے زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ کاش کہ آپ اس وقت میرے دل میں بھانک سکتے۔ میں یہ سطور لکھ رہا ہوں۔ میری از حد نمناک، افسردہ آنکھوں میں بھانک کر میری رُوح کی شدید سسکیوں کو سُن سکتے کہ میں کس طرح ان انگاروں پر ٹوٹ رہا ہوں..... میرے اندر کی کسی کیسی عجیب اُمیدیں ہوتی ہیں جو اپنی حسرتوں کے مزاد پر دیے بھی جلاتی ہیں اور زندگی کے نئے سورج کی طرف بھی حسرت ننگ لگا ہوں سے دیکھتی ہیں۔ مجھ سے بڑھ کر مصیبت زدہ شاید ہی کوئی ہو۔ اگر میں اپنے آپ کو بد نصیب کہوں تو وہ اپنے جرائم، پر غلطیوں کی پردہ پوشی کے مترادف ہو گا اللہ بد بخت کہنے میں مجھے کوئی عار نہیں۔ اس مرحلے پر پہنچ کر اب میرے اندر جینے کی کتنا مقصود ہو رہی ہے۔“

”میری آنکھوں میں عجیب سی مدہوشی، مُردگی کا پتہ چلتا ہے، دماغ پتھر کی طرح بے حس اور ٹھس ہے..... میری حالت کتنی تکلیف دہ ہے مگر اس کے باوجود میں ایک عجیب سی بے ہوشی کے عالم میں وہی حرکتیں دہراتا رہتا ہوں..... میرے دل و دماغ پر مبہم سی کیفیات طاری ہیں؛ اُداسی، عجیب سی خلش، بے نام سی بے کیفی، افسوس و رنج۔“

لحہ بیا کھیاں

خود ترسی، رحم طلبی، موت کی آرزو، تشویش اور جرم کی الجھن کثرتِ حلق اور خودکاری میں مبتلا نوجوانوں کے احساس و فکر کی عکاسی کرتی ہیں۔ طوالت کے خوف سے راقم التحریر حمید کے تجزیہ نفس کی تفصیلات، اُس کی رہنمائی اور خودکاری کے جبر کو توڑنے کے سلسلے میں اپنی کوششوں کا ذکر نہیں کرے گا۔ شاید اِس ذکر کا یہ محل بھی نہیں ہے۔ مختصراً یہ کہ حمید بارہ تین برس کی عمر ہی میں خودکاری کرنے لگا۔ وہ ایک امیر باپ کا بیٹا تھا۔ اُس کا باپ ابتدائے عمر میں ایک کم مایہ درزی تھا جس نے سسرال والوں کی مدد سے کاروبار شروع کیا چند ہی سالوں میں لکھتی بن گیا۔ دوسرے نو دولتوں کی طرح وہ نہایت خود غرض، قابوچی، خسیس اور سخی خور تھا اور اپنے بیٹوں کو ایک ایک پائی کا محتاج رکھ کر منفی قسم کی خوشی محسوس کیا کرتا تھا۔ بظاہر وہ بڑا متدین تھا لیکن زُہد و ورع کے پردے میں ذاتی مفاد کی پرورش کرتا تھا۔ یہ سب باتیں اُس کے بیٹے نے مجھے بتائیں حمید اُس کا چوتھا بیٹا تھا اور ایسا بچہ تھا جس کی ذات میں باپ نے کبھی بھی لُپسی کا اظہار نہیں کیا۔ وہ لڑکپن میں باپ کی شفقت کے لئے ترستا رہا۔ اُس کا باپ اپنے کاروبار میں اس قدر مصروف تھا کہ عفتوں تک گھر میں اُس کا چہرہ دکھائی نہیں دیتا تھا اور جب کبھی اتفاق سے وہ سامنے آ بھی جاتا تو حمید کو ڈانٹ ڈپٹ کے کے بولا کچھ نہ ملتا۔ باپ کے اِس تغافل نے حمید کو لڑکپن ہی میں اِک گونہ تشویش اور وحشت میں مبتلا کر دیا۔ اُس کی ماں کو بھی گھر کے کام کاج سے فرصت نہیں ملتی تھی، بڑے بھائی اپنے اپنے چکر بول میں پڑے تھے۔ ناچار جی بھلانے کے لئے نوکروں کے پاس بیٹھنے لگا۔ ایک دن ایک نوکر سے حمید نے پوچھا کہ یہ پریاں کیا ہوتی ہیں جن کا ذکر قصوں میں آتا ہے۔ نوکر نے کہا میں تمہیں پرست کی میر کر اوں گا اور اِس عنوان سے حمید کو اپنی ہوس کا نشانہ بنایا۔ اوائلِ شباب ہی سے حمید کثرت سے فلمیں دیکھنے لگا۔ اِس طرح گھر کے ماحول سے اُسے فرار کا ایک راستہ مل گیا۔ فلموں میں بوس و کنار کے مناظر دیکھ دیکھ کر اور عشقہ گلے سُن سُن کر اُس کی جنسی خواہش میں ابال آگیا اور اُس نے خودکاری کرنا شروع کی جو شدہ شدہ جبر کی صورت اختیار کر گئی اور اُس کے لئے تفریح کا ایک وسیلہ بن گئی۔ اِن دنوں وہ اپنے آپ کو ہیرو سمجھتا تھا۔ وہ فلموں کے مکالمے یاد کر کے تنہائی میں بولا کرتا

اور اُن کے گانے گنگنا کرنا۔ اس کے ساتھ اُس نے ابن صفی وغیرہ کے حامیان ناول پڑھنے شروع کیے۔ ایک دن گلی کی لائبریری سے اُسے وہی وہانوی کا ایک ناول پڑھنے کو ملا جس کی فیس دس روپے وصول کی گئی۔ ان مشاغل کے لئے روپے کی ضرورت تھی چنانچہ حمید گھر میں چوری کرنے لگا۔ اُس نے انگریزی رسالوں سے عورتوں کی نیم عریاں تصویریں کاٹ کاٹ کر ایک البم بنایا جہاں کہیں اُسے کوئی نیم عریا تصویر دکھائی دیتی وہ اُسے حاصل کر کے دم لیتا تھا۔ خود کاری کے وقت وہ اس البم کی تصویریں سامنے رکھ لیتا اور تحصیل میں فرض کر لیتا کہ یہ اُس کی صین محبوبہ ہے جو اُسے ملنے کے لئے آئی ہے۔ وہ اُس سے باتیں کرتا، پرجوش الفاظ میں اُس سے اظہارِ عشق کرتا اور اُسے محبت بھرے فلمی گیت سنایا کرتا۔ اپنے 'حرم' کی ہر عورت سے اُسے عشق تھا۔ اس بڑے کو گدبدی عورتوں کے بوجھل کوئلوں اور بھری بھری راتوں کا ضبط تھا۔ راستہ چلتے ہوئے اُس کی نڈبھڑکسی ایسی عورت سے ہوباتی جس کے کوہے بھاری بھر کم ہوتے تو وہ اُس کے پیچھے پیچھے ہولیتا اور اُس کے منگتے ہوئے کوئلوں پر نظریں گاڑے خاصی دیر تک اُس کا پیچھا کیا کرتا۔ بقول اُس کے وہ کسی ایسی عورت کے پیچھے پیچھا چلتا ہوا دنیا کے آخری سرے تک جاسکتا تھا۔ شبانہ روز کی خود کاری سے اُس کا جسم سوکھ کر کانٹا ہو گیا اور چہرے پر زردی کھنڈ گئی۔ وہ اکثر اوقات اپنے کمرے میں گھسارہتا اور خیالات کی دنیا بسائے رکھتا۔ وہ اپنے تصور میں کسی فلم ایکٹریس یا انگریزی رسالے کی کسی نیم عریا عورت کو بسا لیتا اور پھر ابتدائے عشق سے لے کر انتہائے وصال تک کے مراحل خیال ہی خیال میں طے کیا کرتا۔ اسی زمانے میں اُس نے 'غش' نگاری شروع کی۔ اُس کی نوٹ بکوں میں نہایت فحش افسانے میری نظروں سے گزرے۔ فحاشی کے باوجود مجھے بعض مقامات پر اُس کی فن کارانہ بصیرت اور لطافتِ بیان کا احساس بھی ہوا۔ ظاہراً اپنے تخیلات کی عملی ترجمانی کے لئے اُس نے 'غش' نگاری کا سہارا لیا تھا۔ اُس کی فحش تحریریں دیکھ کر میرا یہ عقیدہ راسخ ہو گیا کہ 'غش' نویس پورے مرد نہیں ہوتے اور فحاشی سے اپنی کوتاہ ہمتی کی تلافی کرتے رہتے ہیں۔

مشورے کے دوران میں ایک دن حمید نے بڑی عاجزی سے مجھ سے قرضِ حسد مانگا اور

وعدہ کیا کہ ایک ماہ تک رقم واپس کر دے گا۔ میں نے ٹال مٹول سے کام لیا کیوں کہ ایک تو مجھے اس بات کا یقین تھا کہ یہ رقم فحش کتابوں اور فلموں پر صرف ہوگی اور دوسرے میں جانتا تھا کہ وہ یہ قرض چندہ واپس نہیں کر سکے گا، دوسرے مقررہوں کی طرح جاگ جائے گا اور مشورہ ادھورا رہ جائے گا بہر صورت ایک برس کے بعد وہ اچانک غائب ہو گیا۔ اُس کا آخری خط جو مجھے ملا اُس میں حمید نے بڑی گرم جوشی سے میرا شکریہ ادا کیا تھا۔ کچھ مدت کے بعد مجھے بتایا گیا کہ اُس کی صحت چلے سے بہتر ہے اور اُس کے باپ نے ایک معقول کاروبار بھی اُس کے سپرد کر دیا ہے۔

نوفیذوں کی ہم جنسی محبت اگرچہ شعوری اور واضح طور پر جنسی نہیں ہوتی تاہم اُس کی تہ میں نیا نیا بیدار شدہ جنسی اُبال ضرور کارفرما ہوتا ہے۔ اس نوع کی محبت کی مثالیں ہر سکول اور کالج میں بالعموم اور طلبہ و طالبات کی اقامت گاہوں میں بالخصوص ملتی ہیں۔ ایک ہی جماعت یا مدرسے میں پڑھنے والے لڑکے بعض اوقات ایک دوسرے سے پُر خلوص محبت کرنے لگتے ہیں خوبصورت اور خوش پوش لڑکے اپنے ساتھیوں کی توجہ کے مرکز بن جاتے ہیں۔ لڑکے اُن کی تالیفِ قلب میں کوشاں رہتے ہیں اور اُن سے باتیں کرنے اور مل کر کھیلنے کے عنوان تلاش کر لیتے ہیں بعض اوقات وہ حسد اور رقابت کے مارے لڑائی جھگڑے پر بھی اُتر آتے ہیں۔ ایرانی ذوق رکھنے والے بعض اُستاد بھی خوبصورت لڑکوں کے دیدار سے آنکھیں سینکتے ہیں۔

بہ مکتب آمد آں طفل پر یزاد      مبارک باد مرگِ نوبہ اُستاد

اُستادوں اور چاہنے والے طلبہ میں رقابت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ سطور قلم بند کرتے ہوئے راقم التحریر کو دو واقعات یاد آرہے ہیں۔ پہلا واقعہ لاہور کے ایک مشہور سکول سے متعلق ہے۔ کئی برس ہونے کو آئے اس سکول کے ایک ماسٹر صاحب ایک خوب رو لڑکے پر فریضہ ہو گئے۔ وہ چھٹی کے بعد اس طالب علم کو اپنے کمرے میں بلا لیتے اور اُس سے محبت بھری باتیں کیا کرتے۔ ماسٹر صاحب کے رقیب طلبہ بھی تاک میں تھے۔ ایک دن ان لڑکوں نے ماسٹر صاحب کو عین حالتِ دگرگوں میں پکڑ لیا اور شور مچا دیا۔ بات دور تک پہنچی لیکن سکول کے وقار کے نام پر اسے دبا دیا گیا۔

اور ماسٹر صاحب کا پتکے سے تبادلہ کر دیا گیا۔ اُستادوں اور طلبہ کی رقابت کا دوسرا واقعہ لاہور کے ایک معروف کالج سے تعلق رکھتا ہے جہاں مخلوط تعلیم رائج ہے اور جہاں نوجوان اُستادوں اور طلبہ میں رقابت کے عنوان اکثر پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ایک نوجوان لیکچرر اپنی ایک حسین طالبہ سے پیار کرتے تھے اور اُسے اپنی جانب ملتفت کرنے کے لئے ناکام کوششیں کیا کرتے تھے کیوں کہ اُن کی محبوبہ اپنے ایک ہم جماعت لڑکے سے محبت کرتی تھی۔ ایک دن لیکچرر صاحب کالج کے باہر گھاس کے میدان میں کھڑے چند لڑکوں اور لڑکیوں سے خوش گپوں میں مصروف تھے کہ وہ لڑکی بھی موجود تھی۔ اچانک وہی لڑکا کار میں آیا تو لیکچرر صاحب کی محبوبہ پلک کر اُس کے پاس بیٹھ گئی اور ہنسی ٹھٹھا ہونے لگا۔ لیکچرر صاحب تادکھا گئے، جوش غضب سے کانپتے ہوئے پرنسپل کے پاس گئے اور لڑکے کی شکایت کرتے ہوئے انہیں بتلایا کہ وہ فلاں لڑکی سے کھلم کھلا معاشرت کر رہا ہے اور کالج کی اخلاقی فضا کو خراب کر رہا ہے۔ پرنسپل صاحب چپ چاپ بیٹھے لیکچرر کی تلخ و تیز باتیں سنتے رہے۔ لیکچرر نے بات ختم کی تو پرنسپل نے مسکراتے ہوئے کہا ”پروفیسر صاحب! اس میں قصور لڑکے یا لڑکی کا نہیں ہے۔ بیان کے GLANDS کا قصور ہے۔“ لیکچرر صاحب خفیف ہو کر کمرے سے باہر نکل گئے کیوں کہ اُن کے اندرون میں بھی تو GLANDS ہی نے گڑ بڑ مچا رکھی تھی۔

اکثر والدین اپنے بچوں کو سکول میں داخلہ دلا کر اپنے فرائض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں اور اس بات کی پروا نہیں کرتے کہ اُن کے بچے کے ہم جماعت کون ہیں اور کیسے ہیں۔ باپ کا فرض ہے کہ وہ اپنے بیٹے کو بدتماش نوجوانوں کی صحبت سے بچائے۔ بُری صحبت میں بچوں کا اخلاق تباہ ہو جاتا ہے اور وہ چھوٹی عمر ہی میں بُری عادتوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

نوفیروزوں میں ہم جنسی محبت کا میلان تیرہ برس کی عمر سے سولہ برس کی عمر تک رہتا ہے اس کے بعد وہ صنفِ مخالف میں دلچسپی لینا شروع کر دیتے ہیں۔ یمن دلو لڑکیوں کی ہم جنسی محبت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں

”کم و بیش تمام نوخیز لڑکیوں میں ہم جیسی دجھان پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سکولوں، کالوں اور نگار خانوں میں لڑکیاں ایک دوسری کے دامنِ محبت میں گرفتار ہو جاتی ہیں، ایک دوسری کو اپنی ہمراز بنا لیتی ہیں، اپنی محبت کا ثبوت دینے کے لئے اپنے اعضا کو داغنے سے بھی گریز نہیں کرتیں، ایک دوسری کو پیارے پیارے ناموں سے بلاتی ہیں اور محبت پھر خطوط لکھتی ہیں۔“

سمون دلوانے اس نوع کے چند خطوط اپنی کتاب میں درج کئے ہیں۔ ان میں سے کچھ اقتباسات درج ذیل ہیں۔

”..... میں وہاں کھڑی تھی، میری کمر کو وہ پھوٹا سا سفید ہاتھ دبا رہا تھا، میرا ہاتھ اس کے گول شانے پر تھا، میرا بازو اس کے برہنہ گرم گرم گلے پر تھا، میں اس کی گداز پھاتوں کے ساتھ لگی کھڑی تھی، میرے سامنے اس کا خوبصورت چہرہ تھا،..... ہونٹ کھلے تھے۔ میں کانپنے لگی اور مجھے محسوس ہوا جیسے میرا چہرہ شرم سے لال ہو رہا ہو گیا ہے۔“

”..... میری دل دجھان سے پیاری محبوبہ! میری حسین پری! آہ! کہو ناں کہ تم مجھ سے پیار کرتی ہو، کہو ناں! کہ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تمہاری پیاری سہیلی ہوں میں اُداس ہوں میری پیاری! مجھے تم سے کس قدر محبت ہے میرے پاس الفاظ کہاں کہ اپنے پیار کا اظہار کر سکوں۔ اپنے پیار کے اظہار سے مجھے کبھی سیری نہیں ہوتی۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں تمہیں پوجتی ہوں تو اس سے بھی میرے احساس کی ترجمانی نہیں ہو سکے گی۔ بعض اوقات یوں لگتا ہے جیسے میرا دل ٹھٹھ جائے گا۔ اس سے زیادہ حسین تصور اور کیا ہو گا کہ تم مجھ سے پیار کرو۔ مجھے اس بات کا یقین نہیں آتا۔ میری جان! مجھے بتاؤ کہ تم ہمیشہ ہمیشہ مجھ سے پیار کرتی رہو گی۔“

لڑکوں اور استادوں کی طرح لڑکیوں اور اُستانیوں میں بھی معاشے ہو جاتے ہیں۔ بعض کنواری اُستانیوں اور لکچر ایس خوبصورت لڑکیوں سے پیار کرنے لگتی ہیں اور اس طرح اپنے دبائے ہوئے جنسی جذبے کی بالواسطہ تسکین کر لیتی ہیں۔ بعض لڑکیاں اپنی خوبصورت، خوش پوش، بہنس مکھ نوجوان اُستانیوں سے دل و جان سے فدا ہوتی ہیں۔ انہیں اپنی جانب ملتفت کرنے کے لئے عجیب و غریب طریقے اختیار کرتی ہیں۔ وہ انہیں روزِ خوابی اور خیال آرائی میں بسا لیتی ہیں، اُن جیسے بال بناتی ہیں، اُن کی پسند کے رنگوں کے کپڑے پہنتی ہیں، اُن کے باتیں کرنے اور مسکرانے کے انداز کی نقالی کرتی ہیں۔ ایک ہی اُستانی یا لکچر سے پیار کرنے والی لڑکیاں آپس میں رقیب بن بیٹھتی ہیں اور ایک دوسری کو اپنی محبوبہ کی نظروں سے گرانے کے لئے طفلانہ سازشیں کرتی رہتی ہیں۔ لڑکیوں کی اقامت گاہوں میں ہم جنسی معاشے خوب پختے ہیں۔ اُن کی جھلک عصمت چغتائی کے ناول ٹیڑھی لکیر میں دکھائی دیتی ہے۔ عام حالات میں نوجوان خود لذتی اور ہم جنسیت کے مراحل سے گزر کر قطری اتفاقیوں کے تحت صنفِ نازک کی جانب مائل ہو جاتے ہیں۔ اوائلِ شباب میں لڑکیاں اسے ہم سن لڑکوں سے زیادہ ذہین اور پختہ مزاج ہوتی ہیں اور اپنی عمر سے بڑے نوجوانوں کو ملتفت کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ نوجوان لڑکے رومان کی تلاش میں لگی کوچوں میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ کوئی لڑکی اچھی چولی نظر سے انہیں دیکھ پائے تو انہیں وہم ہو جاتا ہے کہ وہ اُن پر فریفتہ ہو گئی ہے۔ پھر رُتے اہتمام سے بال سنوار کر اپنا بہترین لباس زیب تن کئے لڑکی کے گھر کے باہر چکر لگانا شروع کر دیتے ہیں یا اسی چھی میں کرکٹ کھیلنے لگتے ہیں۔ اس عمر میں وہ ایسے جذباتی خلفشار میں مبتلا ہوتے ہیں کہ وہ ہمتیں ہمت ہونے کے باوجود لڑکی کے قریب جاسے یا اُس سے بات کرنے کی جرات نہیں کرتے۔ اُن کے پاس طرزِ عمل سے لڑکیاں جیلا جاتی ہیں اور انہیں بچے سمجھ کر اُن سے صرف نظر کر لیتی ہیں۔ یوں اسٹائے اپنے اوائلِ شباب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

”ایک دفعہ مجھے ایک فربہ اندامِ عورت سے عشق ہو گیا جو گھوڑے پر سوار سڑے ٹاک کے سواری سلکھا

وایے سکول میں آیا کرتی تھی۔ میں بھی ہر منگل اور جمعہ کے دن وہاں جانے لگا کہ انہی ایام میں وہ سواری کیا کرتی تھی۔ میں اُسے گھورنے جایا کرتا تھا لیکن اس ڈر سے کہ کہیں وہ مجھے دیکھ نہ لے دور دور رہتا تھا۔ جب کبھی میں یہ محسوس کرتا کہ وہ میری جانب سے گذرے گی تو میں بھاگ نکلتا تھا۔ جب کبھی وہ میری طرف دیکھتی میں لاپرواہی سے دوسری طرف دیکھنے لگتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں اُس کا چہرہ بھی اچھی طرح نہ دیکھ سکا اور آج تک مجھے معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ عورت خوبصورت بھی تھی کہ نہیں؟

نوخیز اس نوع کے بادِ مہوائی رومانوں کو اہم سمجھتے ہیں۔ وہ کسی درخت کے نیچے لیٹ کر روزِ خوابی کے عالم میں اپنی خیالی محبوبہ سے باتیں کیا کرتے ہیں لیکن عملی اقدام سے عاجز رہتے ہیں۔ ایک نوخیز کسی خوبصورت لڑکی کو ایک نظر دیکھنے کے لئے پہروں ایک جگہ کھڑا رہے گا لیکن جب وہ دُور سے نمودار ہوگی اور اُس کی جانب قدم بڑھائے گی تو وہ گھرا کر شک جائے گا۔ وہ سائیکل پر سوار کسی تانگے کے پیچھے آئے گا جس میں کوئی لڑکی بیٹھی ہوگی لیکن قریب آکر بھپاک سے دوسری طرف نکل جائے گا۔

نوخیز لڑکیوں کا محبوب مشغلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ لڑکوں کو اپنی جانب مائل کر کے بھاگ جاتی ہیں، اگرچہ بقول ہولیاک ایس ہرنی کی طرح دائرے میں بھاگتی ہیں، نگاہوں سے اوچھل نہیں ہوتیں۔ آنکھ مچولی کا یہ کھیل بعض اوقات سنجیدہ صورت اختیار کر لیتا ہے اور جنسی کشش عشق کی آگ بن کر بھڑک اٹھتی ہے۔ لڑکا لڑکی ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کا ہو جانے کے خواب دیکھتے ہیں۔ اس مرحلے پر فلموں کے عشقہ گیت اُن کے آڑے آتے ہیں، خطوط کا تبادلہ ہوتا ہے جن میں ازلی ابدی پیار کے قول ہمارے جاتے ہیں اور تن من تباد کرنے کے عہد کئے جاتے ہیں محبت کی اس منزل میں لڑکوں اور لڑکیوں کی اختراعی صلاحیتیں پورے عروج پر پہنچتی ہیں اور لاکھ پابندیوں کے باوجود وہ ایک دوسرے سے ملنے کی سبیل نکال ہی لیتے ہیں۔ سہیلیاں اپنے معاشقوں میں ایک دوسری کی ہمرائز بن جاتی ہیں اور اپنے عشاق کی ملاقات کے لئے ایک دوسری کی امداد کرتی ہیں۔ ہمارے معاشرے میں بوڑھی قسطاً بھی اُن کی ملاقات کے لئے راہ ہموار کر دیتی ہے۔ اس زمرے میں بچے اور اعلیٰ دونوں طبقوں کی عورتیں شامل ہوتی ہیں۔

البتہ اسٹیل طے کی عورتیں نقد معارضہ لینے کی بجائے نوجوان عشاق سے متبع کرتی ہیں۔

ایک نوخیز دوشیزہ جنسی ملاپ کے تصور سے خائف ہوتی ہے۔ بیاتہ عورتوں سے شب سروتی کی واردات سن سن کر جہاں اُس کے ذوق وصال کو تحریک ہوتی ہے وہاں ڈر بھی لگتا ہے لیکن دلائل سمیلیوں اور بوڑھی قدامت کی میٹھی میٹھی باتیں بالآخر اُسے رام کر لیتی ہیں۔ نصرت کے تقاضے پورے ہوتے ہیں اور عشق و محبت کے چکر میں آکر وہ اپنی بکارت کھو بیٹھتی ہے۔ پہلے جنسی تجربے کے بعد اکثر لڑکیاں ندامت اور جرم کے شدید احساس میں مبتلا ہو جاتی ہیں اور سمجھنے لگتی ہیں کہ انہوں نے اپنی زندگی کی عزیز ترین متاع نادمی ہے۔ بعض لڑکیاں اس لئے بھی سپردگی پر آمادہ ہو جاتی ہیں کہ وہ اپنے چاہنے والے کی خواہش پر اپنی دوشیزگی کی ہیٹھ پڑھا کر اپنے سچے پیار کا ثبوت دینا چاہتی ہیں۔ انہیں یہ اندیشہ بھی لاحق ہوتا ہے کہ اگر انہوں نے اپنے چاہنے والے کا مطالبہ پورا نہ کیا تو وہ انہیں پھوڑ کر کسی دوسری لڑکی سے پیار کرنے لگے گا۔ ایسے معاشقوں کا انجام اکثر لڑکیوں کے لئے المناک ہوتے ہیں۔ یہ بات مرد کی سرشت میں ہے کہ وہ ایک عورت سے فیضیاب ہونے کے بعد جوثرے کی طرح دوسری کھلی کا طواف شروع کر دیتا ہے۔ بعض عید نوجوان شادی کا بچہ دے کر لڑکیوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ جب اپنی مراد پالیتے ہیں تو طرح طرح کے جیلے بہانوں سے اپنا سچا ٹھکانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں لڑکیوں کی بے راہ روی کی ذمے داری بدرجہ اولیٰ اُس کی ماں پر عائد ہوتی ہے۔ ماں اپنی لڑکی پر نظر رکھے تو وہ کبھی بھٹک نہیں سکتی۔ ماں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی نوخیز بیٹی کو غلط قسم کی پڑوسنوں اور سمیلیوں کی صحبت سے محفوظ رکھے اور جب کسی تقریب میں شرکت کرنا ہو تو بیٹی کے ساتھ جائے اور اپنے ساتھ اُسے واپس لائے۔ شادی بیاہ، عرس، میلوں، ٹیلیوں پر لڑکیوں کو بہکانے کے سامان کئے جاتے ہیں۔ یہ مشورہ متوسط گھرانوں کے لئے ہے۔ سب سے اونچے اور سب سے نیچے طبقات کی گمراہی ماؤں سے ممکن نہیں ہو سکتی۔ بعض مائیں اپنی جوان بیٹیوں کے ساتھ نہایت بے رحمی اور درشتی کا برتاؤ کرتی ہیں۔ ان کے ہر کام میں کیڑے نکالتی ہیں، بات بہت پرسرزنش کرتی ہیں، کبھی بھولے سے بھی پیار کا ایک لفظ منہ سے نہیں نکالتیں۔ ایسی ماؤں کی

بیسیاں پیار کے لئے ترستی رہتی ہیں اور جب کوئی نوجوان اُن سے پرہیز محبت کا اظہار کرتا ہے تو وہ بے اختیار پردگی پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ بعض لڑکیاں جن کے والدین قیمتی مہوسات اور پُر تکلف کھانوں کی فراہمی کی استطاعت نہیں رکھتے، روپے پیسے کے لالچ میں گراہ ہو جاتی ہیں۔ میری محض زندگی کا مصنف لکھتا ہے کہ ایک دن اُس نے ایک ایسی ہی لڑکی سے پوچھا کہ تم غیر مردوں کے پاس کیوں جاتی ہو۔ لڑکی نے جواب دیا میری ماں بہت غریب ہے اور مجھے کیلک خرید کر نہیں دے سکتی۔ مجھے کیلک کھانے کا شوق ہے جسے پورا کرنے کے لئے میں مردوں کے پاس جاتی ہوں۔

شباب کی سرحد میں قدم رکھتے ہی لڑکی کو دو پریشاں لاحق ہو جاتی ہیں، رومان کی تلاش اور شادی کی تمنا۔ وہ کسی قسم کے تعلق کا رومانی عنصر کے بغیر تصور ہی نہیں کر سکتی۔ اُس کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ جو نوجوان اُس سے پیار کرتا ہے وہ ہمیشہ کے لئے اُس کا ہو جائے۔ ایک نوجوان لڑکی کا واحد نصب العین کسی خوبصورت، متمول پیار کرنے والے نوجوان سے بیاہ کرنا ہوتا ہے جس لڑکی کی منگنی نہ ہو پائے وہ اپنے آپ کو بے روزگار محسوس کرنے لگتی ہے اور بے روزگاروں ہی کی طرح ذہنی پریشانی اور جذباتی خلفشار میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ پیام آنے میں دیر ہو جائے تو وہ نور عشق و محبت کے توسط سے اپنی شادی کا اہتمام کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ کسی نوجوان سے محبت کر کے وہ اپنی سہیلیوں پر یہ واضح کر دینا چاہتی ہے کہ میں بھی کسی سے بیٹی نہیں ہوں، مجھ پر بھی کوئی مہر ہے۔ اس نوع کے معاشرے بسا اوقات سنگین صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ یہاں میں اپنے مشاہدے سے ایک مثل درج کرتا ہوں۔

سلیم — نام فرضی ہے — میرے ایک دوست کا چھوٹا بھائی تھا اور ایک خوشحال معزز گھرانے کا فرد تھا۔ وہ میری جماعت میں داخل ہوا تو اُس کی صحبت قابل رشک تھی۔ گھٹا ہوا مضبوط جسم، چہرے پر شباب کی سرخی، آنکھوں میں اعتماد نفس کی جھلک تھی۔ خاندانی روایات کے مطابق اس نے اپنی موچھیں بڑھالی تھیں جس سے اُس کے چہرے پر مردانگی کے آثار دکھائی دیتے تھے۔ ایک دو ماہ تو وہ باقاعدگی سے کالج آتا رہا اور کام کرتا رہا اس کے بعد غائب ہو گیا۔ ایک دن میں نے اُس کے بڑے بھائی سے اُس کی طویل غیر حاضری کا سبب پوچھا تو اُس نے بیزار سی اپنے کندھے جھٹکا

اور موصوف گفتگو بدل دیا۔ مجھے اُس کی یہ حرکت ناگوار گذری کہ یہ کیسا بھائی ہے جسے اپنے چھوٹے بھائی کا ذکر تنگ گوارا نہیں ہے۔ کم دیش ایک برس کے بعد ایک دن اچانک سلیم کا بڑا بھائی میرے آیا۔ رہ سخت گھرایا ہوا تھا۔ میرے پوچھنے پر اُس نے مجھے جو قصہ سنایا وہ مختصراً درج ذیل ہے۔

دو سال گذرے سلیم کے بڑے میں ایک کھاتا پیتا گھرانہ آکر ٹھہرا جس کی ایک مڑی بڑی خوب رو اور شوخ و شنگ تھی۔ لڑکی کے مکان کی ایک کھڑکی گلی میں کھلتی تھی جس پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ سلیم گلی میں سے گذرتا تو یہ پردہ ہلنے لگتا۔ چند روز کے بعد یہ پردہ ہلنے پلٹنے اُٹھنے لگا اور لڑکی سامنے کھڑی ہونے لگی۔ دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں۔ سلیم کے چکر توں میں اضافہ ہو گیا، آنکھوں ہی آنکھوں میں اظہارِ شوق ہوا، لبوں پر مسکرائیں کھیلنے لگیں، اشارے ہوئے، سلام ہوئے اور پھر رقعوں کا تبادلہ ہونے لگا۔ ایک رات کو سلیم لڑکی کی دعوت پر کھڑکی کے اندر کود گیا اور یہ رومان اپنے منطقی انجام کو پہنچ گیا۔ یہ ساری باتیں افشائے راز اور فضیحت کے بعد سلیم نے اپنے بھائیوں کو بتلائی تھیں۔ اس دوران میں لڑکی نے سلیم سے کہا کہ کیوں نہ ہم عمر بھر کے لئے ایک ہو جائیں۔ اُس نے یہ بھی بتلایا کہ اُس کی امی سب کچھ جانتی ہے اور کہتی ہے کہ تم دونوں کا آپس میں بیاہ نہ ہوا تو بڑی رسوائی ہوگی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ لڑکی کی ماں نے لڑکی کی ہمت افزائی کی تھی تاکہ عشق و محبت کے عنوان سے اُس کا رشتہ سلیم سے طے پا جائے۔ سلیم نے جواب میں کہا میں بے بس ہوں، شادی کے بارے میں فیصلہ امی جان اور بڑے بھائی کریں گے۔ یاد رہے کہ سلیم کا باپ فوت ہو چکا تھا۔ اس نوع کے معاشرے طشتِ ارباب ہو ہی جایا کرتے ہیں چنانچہ محلے میں چھ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ایک دن لڑکی کی ماں سلیم کی امی کے پاس گئی اور اُسے سارا کچھ چٹھا کہہ سنایا اور کہا کہ اگر سلیم کی شادی اُس کی بیٹی سے نہ ہوئی تو وہ کہیں کے نہ رہیں گے۔ یہ سن کر سلیم کی امی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اُس نے کہا تم اپنی بیٹی کو سنبھال کر رکھو ہم کسی دباؤ میں آ کر رشتہ نہیں کریں گے اور پھر ہمارا ارادہ سلیم کو اپنے ہی عزیزوں میں بیاہنے کا ہے۔ اس پر ان میں تکرار ہو گئی جیسی کہ صرف عورتوں ہی میں ہو سکتی ہے اور ان کی چھین گھر کے باہر گلی میں بھی سنائی دینے لگیں۔ لڑکی کی ماں

کہتی تھی کہ تمہارا بیٹا بد معاش ہے، آوارہ سے جس نے میری بیٹی کو درغلا کر عارت کیا ہے۔ سلیم کی  
 اسی نے کہا تم اور تمہاری بیٹی دونوں چھٹال ہو اور تم نے میرے بیٹے کو پھانسنے کے لئے یہ ڈھونگ  
 رچایا ہے۔ لڑکی کی ٹل ٹپھڑ کر اپنے گھر چلی گئی۔ اب بات زیادہ بڑھ چکی تھی اور اس پر پردہ ڈالنا  
 ممکن نہیں رہا تھا۔ اُسے یہ خوف ستانے لگا کہ اگر لڑکی کے آبا نے کہیں باہر سے یہ بات سن پالی  
 تو وہ بچے جھڈ کر اُس کے پیچھے بڑھ جائے گا کہ تم نے جانتے بوجھتے ہوئے مجھے خبر کیوں نہ کی چنانچہ  
 اپنے بچاؤ کے لئے اُس نے رو رو کر اپنے شوہر کو ساری رات کہانی کہہ سنائی۔ اُس کا شوہر غصہ نہ  
 ہو گیا۔ اُس نے اپنی بیٹی کی خوب دھنائی کی، اُسے ایک کمرے میں بند کر دیا اور دو ایک لائیں  
 بیوی کو بھی رسید کر دیں۔ اُس کا پولیس میں رُخ تھا۔ اُس نے پولیس والوں سے مل کر منصوبہ  
 بنایا کہ سلیم کو کسی چکر میں لا کر اُسے اُس کی نابکاری کی عبرت ناک سزا دلانی جائے۔ ایک دن جب  
 کہ سلیم کے بھائی کہیں باہر گئے ہوئے تھے اور سلیم بھی گھر میں نہیں تھا لڑکی کے باپ نے محکمہ  
 خا کر وہ کو کچھ دے دلا کہ سلیم کے گھر میں اپنا ایک قیمتی ریڈیو سیٹ رکھوا دیا اور پولیس میں سرفے  
 کی رپورٹ درج کرا دی۔ پولیس نے پچھاپہ مار کر ”مسٹر ذوال“ برآمد کر لیا اور سلیم کو گرفتار کر لیا۔  
 سوالات میں سلیم کو اس بے زردی سے زد و کوب کیا گیا کہ وہ چند روز نے لئے چلنے پھرنے سے بھی معذور  
 ہو گیا۔ اس پٹائی کے ہفتہ عشرہ بعد میں نے اُسے دیکھا تو بہ مشکل اُسے پہچان سکا۔ مقدمہ کا چالان  
 عدالت میں پیش ہوا تو سلیم کا بڑا بھائی ہانتا کانتا ہوا میرے پاس آیا۔ ساری روئد کہہ سنائی اور  
 مجھ سے استمداد کی کیوں کہ اُن دنوں میرا ایک عزیز اُس شہر میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ میں  
 اسے ساتھ لے گیا اور عزیز موصوف کو سارا قصہ کہہ سنایا۔ اتنے میں سلیم کے دوسرے بھائی اُسے  
 ضمانت پر رہا کرانے کے لئے دوڑ دھوپ کرنے لگے۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ سلیم کو لڑکی سے  
 معاشرہ کرنے کی سزا دی گئی ہے۔ سلیم کے بھائیوں نے لڑکی کے رقعے میرے عزیز کو دکھائے جو اُس  
 نے وقتاً فوقتاً سلیم کو لکھے تھے اور اُس کے ہکس میں پائے گئے تھے۔ ان میں کچھ میرے پاس  
 محفوظ ہیں۔ حکام متعلقہ نے لڑکی کے باپ سے کہلوا یا کہ مقدمہ جاری رہا تو اخباروں میں اس کی

کاروائی چھٹنے لگے گی اور جس نے نہیں سنا اسے بھی علم ہو جائے گا۔ لڑکی کے رقعے عدالت میں پیش کئے جائیں گے اور آپ کی بیوی اور بیٹی کو بھی وکیلوں کی جرح کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ان حالات میں بہتر ہوگا کہ آپ صلح کر لیں، سلیم کو اپنے کئے کی سزا کافی مل چکی ہے۔ لڑکی کا باپ مان گیا اور فریقین کی صلح پر اس قضیے کا خاتمہ ہو گیا۔

اس واقعے میں باقی باتیں تو وہی ہیں جو اس نوع کے معاشقوں میں عام طور سے پیش آتی ہیں۔ ایک بات غور طلب یہ ہے کہ لڑکی کی ماں بھی اس میں ملوث تھی۔ اس سے راقم الحروف کے اس خیال کو تقویت ہوئی کہ کوئی لڑکی اپنی ماں سے چھپا کر معاشقہ نہیں کر سکتی۔ بعض مائیں مصلحتاً خاموش رہتی ہیں کہ لڑکی کو سمرزئش کی تو وہ بھاگ جائے گی یا خودکشی کرے گی اور بعض شوہروں کے ڈر سے چپ رہتی ہیں۔ بہر حال مائیں دانا دینا ہوں تو ان کی بیٹیاں بڑی حد تک اس نوع کی رسوائی سے محفوظ رہتی ہیں۔

نویز عشق و محبت کے عالم میں کیا کچھ محسوس کرتے ہیں اس کا اندازہ اس لڑکی کے رقعوں سے لگایا جاسکتا ہے جن سے چند اقتباسات ذیل میں دیئے جاتے ہیں۔

”میرے محبوب شہزادہ! سدا کا میاں بی آپ کے قدم چڑھے آمین! ہم تم سے جدا ہو کر مر جائیں گے رو رو کر..... بدلیسیبی سلام حسرت ہے

میری تنہائیں مر گئیں میرے محبوب رگوں میں زہریلی بوندیں اتر گئیں میرے محبوب افسوس..... میری امیدوں کے چمن..... کیا اب یہ چمن اجڑ جائے گا..... آپ چاہتے ہیں۔ میرا خیال ہے آپ مجھے اچھا نہیں سمجھتے۔ پھر آپ سوچنے لگیں گے کہ یہ اس نے کیوں لکھا۔ وہ مسئلہ میں حل کئے دیتی ہوں سنئے! آرزوں کا مرکز! بدلیسیبی ناکامی، بے عزتی، رسوائی، بے مروتی، نفرت۔ اب لکھتی ہوں میرے محبوب! آپ نے آج تک میری کوئی بات نہیں ٹھکرائی تھی مگر افسوس کہ کل کا دن میری آرزوؤں

لے یہ نویزوں کی آدھ کچری شاعری کا نمونہ ہے۔

کے خون کا دن تھا۔ اس کے بعد کوئی آرزو نہیں ہوگی۔ کبھی نہیں.... کبھی نہیں.....  
 ہوگی۔ کل میں نے آپ کو جو چیز بھی دینی چاہی آپ نے ٹھکرا دی۔ آپ نے  
 میری چیز کو نہیں ٹھکرایا بلکہ مجھے ٹھکرا دیا ہے جس وقت آپ نے کہا تھا کہ میں نہیں  
 لوں گا اُس وقت ہی میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے کوئی کیا سمجھے کہ پھر کتنا  
 رونی مگر کسی کو کیا پروا؟ کوئی روئے مڑے یا غرق ہو جائے میری آج تک خوش  
 قسمتی تھی۔ آپ نے آج تک میری کوئی بات نہیں ٹھکرائی تھی مگر اب آپ نے وہ  
 سہانی امید مجھ سے چھین لی ہے۔ آپ کی مرضی میں خود جل رہی ہوں، میرا دل  
 رو رہا ہے آپ کی بے اعتنائی پر اور پھر جس بے نیازی سے آپ گلی سے واپس  
 گئے تھے وہ بھی میں جانتی ہوں۔ میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں آپ کی عادات کو۔  
 جان تمنا! آپ جب بھی آئیں میری نظریں ہمیشہ آپ کے چہرے پر  
 ہوتی ہیں۔ جب آپ پہلی بار آئے تھے جب کہ میں نے پہلا خط دیا تھا اُس وقت  
 آپ کے تاثرات اور حقے مگر جب آپ نے انکار کیا اُس وقت مختلف تھے جان میں!  
 چہرہ دل کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔ میں تو چہرہ دیکھ کر ہی سب کچھ سمجھ لیتی  
 ہوں۔ میں جانتی ہوں دنیا میں بہت زیادہ حسین لڑکیاں ہیں اور دولت مند بھی  
 مگر میرے محبوب! آپ کو دولت بھی مل جائے گی اُن سے اور خوبصورتی بھی مگر حقیقی  
 خلوص نہیں ملے گا۔ میں خوبصورت نہیں ہوں امیر بھی نہیں ہوں مگر میرے پاس خلوص  
 ضرور ہے مگر اس کی آپ کو ضرورت نہیں۔ آپ کے اس رویے نے میرا دل توڑ کر  
 رکھ دیا ہے۔ آپ نے کوئی پروا نہیں کی۔ آپ کی تحریر سے کچھ ظاہر ہوتا ہے اور  
 آپ کے رویے سے کچھ اور ظاہر ہوتا ہے۔ مجھے آج تک فخر تھا آپ پر کہ آپ نے  
 میری بات نہیں ٹھکرائی جس کسی کو پتہ تھا ہمیشہ اسے یہی کہا کرتی تھی کہ میرا محبوب  
 اتنا اچھا ہے کہ آج تک اُس نے میری کوئی بات نہیں ٹھکرائی۔ اگر میں کہتی ہوں کہ

دن ہے تو وہ کہتا ہے کہ دن ہے اگر میں کہتی ہوں رات ہے تو وہ کہتا ہے رات ہے مگر کل وہ فخر خاک میں مل گیا۔ اب کیا ہو سکتا ہے وقت گزریگا دل ٹوٹ گیا مگر زخم جو ٹل گیا ہے وہ ہمیشہ تازہ رہے گا وہ کبھی نہیں مٹ سکے گا۔

اپنا دکھ ہے جیون بھر کا پل پل کی بات نہیں۔ رونے سے جو کٹ جائے گی ایسی تو یہ رات نہیں بلکہ تمام زندگی کا رونا ہے۔ میرے محبوب کو ذلیل ٹھکراؤ کہ پھر شاید وقت کبھی ہاتھ نہ آئے۔ مجھے ہر روز اپنی سہاؤنی شکل ضرور دکھایا کرو۔ میرے دیکھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ دنیا میں بہت زیادہ حسین لڑکیاں ہیں۔

”جب ہوا جلتی ہے پتے ٹوٹ جاتے ہیں جب شے ساتھ ملتے ہیں پرانے چھوٹ جاتے ہیں۔“  
میرے سویت شہزادے سدا مسکراؤ۔

تمہارا نام ہے عنوان میرے فتنے کا تمہارے نام سے پہلے کسی کا نام نہیں سلام پر خلوص! سنائیے جناب کل کہاں سارا دن غائب رہے گو کہ مجھے خود بُری مری لگ گئی تھی کچھ نہ پوچھے مگر پھر بھی میں نے شام کے قریب کھر دی سے دیکھا تھا مگر آپ مجھے کہیں نظر نہیں آئے۔ کیا وجہ تھی جان تمنا! کچھ سوچا بھی ہے کہ نہیں، کیوں آپ اتنی بے نیازی سے کام لے رہے ہیں۔ مجھے آپ کی باتوں کی کچھ سمجھ نہیں آتی جناب کا خود میرے ساتھ شادی کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔ اگر ارادہ ہو تو پھر آپ کچھ کام نہ کریں؟ آپ تو ہر روز یونہی وقت ضائع کر دیتے ہیں کسی کے مستقبل کا فیصلہ ہے مگر آپ نے شاید مذاق سمجھ رکھا ہے۔

نوٹ :- میں رومل دے رہی ہوں استعمال کیجئے رکھنے کے لئے نہیں آپ کو میری قسم استعمال کیجئے

”خُن بیا میں نے تمہیں سارا جہاں رہنے دیا

جان آرزو! اب بتائیں کب آنا ہے۔ اگر بارش نہ ہوئی تو پھر آج رات ضرور شریف لائیں میں انتظار کروں گی۔ اب بچے ہی آنا ہو گا۔ مجھے آپ پر اعتماد ہے کہیں میرا اعتماد

کوٹھیس نہ پہنچائیں۔ اب اجازت دیجیے خدا حافظ! میرے محبوب!“

”میرے دلربا شہزادے! سدا مسکراؤ۔“

یہ ہماری بالخصوص جو نہیں تو اور کیا ہے ہم اُس کے ہو گئے جو نہ ہو سکا ہمارا سلام انتظار! اگر ہم عرض کریں گے تو شکایت ہوگی۔ ہاں ہی یہ سن لیجیے کہ آج رات کو اسی وقت اُسی راستے آنا ہوگا کیوں کہ میرے ابا جان باہر گئے ہونے میں اور کل آئیں گے۔ یہ اتنا حسین موقع نہ کھو دینا..... آپ میری ہر بات کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ مجھے اب محسوس ہوتا ہے کہ پہلے جیسی آپ کے دل میں میری قدر نہیں رہی۔ یہ آپ کا حق ہے کہ آپ مجھے مٹی میں بھی ملا دیں۔ پہلے میری بات پوری کی جاتی تھی اب دس خط لکھوں تو ایک کا جواب نہ کواں بیکار ہے۔ یہ آپ صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ میرا دل نہیں چاہتا اب تمہارے ساتھ بولنے کو۔“

اول شہزادہ میں بعض لڑکے اپنی عمر سے کہیں بڑی عورتوں سے محبت کرنے لگتے ہیں اور بعض لڑکیاں ادھر عمر کے مردوں سے پیار کرنے لگتی ہیں۔ علمائے نفسیات کہتے ہیں کہ ایسا لڑکا اپنی محبوبہ میں بہ یک وقت اپنی ماں اور محبوبہ کی جستجو کرتا ہے اور لڑکی اپنے محبوب میں باپ کو تلاش کرتی ہے۔ اس کی معرّفہ مثال میرین کا گونٹے سے عشق ہے۔ میرین نو عمر دوشیزہ تھی جب کہ گونٹے اس وقت ساٹھ برس سے متجاوز تھا۔ میرین نے اپنی نظموں میں بڑے پرجوش انداز میں گونٹے سے اظہارِ محبت کیا ہے۔ میں ایک نوجوان کو جانتا ہوں جو اپنی عمر سے کہیں بڑی ایک بیامتا عورت کے عشق جنوں پرور میں مبتلا ہو گیا۔ اس عورت کا شوہر اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ اُسے اپنے گھر میں ہر قسم کی آسائش میسر تھی اور اُس کے بچے سکول جانے کی عمر کے تھے۔ وہ اس نوجوان کے ساتھ ہوٹلوں میں جایا کرتی لیکن اُس کا رویہ عجیب و غریب تھا۔ وہ اُس نوجوان کی ہزار کوششوں کے باوجود سپردگی پر آمادہ نہیں ہوتی تھی اور کہا کرتی تھی کہ میں اپنے شوہر کی امانت میں خیانت نہیں کروں گی۔ جب وہ نوجوان پوچھتا کہ تم میرے

لے اصطلاح میں اسے CALF-LOVE کہتے ہیں۔

ساتھ ہوٹلوں میں جاتی ہو، باغوں میں گھومتی پھرتی ہو، مجھے گلے لگ کر ملتی ہو، مجھے بوسے دیتی ہو۔ کیا اس طرح امانت میں خیانت نہیں ہوتی تو وہ سُکرا دیا کرتی تھی۔ اس نوجوان کی شیفنگی کا یہ عالم تھا کہ اُس پر دن رات مدھوشی کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ وہ اُسے دیکھ دیکھ کر جیتا تھا اور مجر د وصال کے آشوب میں پڑا جلتا تھا۔ ایک دن مشورے کے دوران میں وہ اپنی محبوب کو میرے پاس لے آیا۔ وہ ایک خوش پوش، گول مٹول، خوبصورت عورت تھی جس کے جسم کے زاویوں کا تناسب اچھی باقی و جمال تھا۔ وہ بہانے سے اٹھ کر چلا گیا تو میں نے اُس عورت سے پوچھا "کیا آپ کو اس نوجوان سے کچھ بھی ہمدردی اور اُلس نہیں ہے؟" وہ بولی "ہے تو" میں نے کہا "تو آپ اس سے ملنا ترک کر دیں۔ اس سے بڑا احسان آپ اس پر اور کوئی نہیں کر سکتیں" وہ خیف سی ہو کر میری باتیں سنتی رہی اور گو لوگوں کے عالم میں اٹھ کر چلی گئی۔ اس کے بعد بھی وہ اُس بے چارے سے بلی پوہے کا کھیل کھلتی رہی۔ معلوم ہوا کہ اس عورت کا شوہر ایک بد صورت ٹھنڈا سا آدمی تھا جب کہ اُس کا چاہنے والا خوش رو کشیدہ قامت جوان رہتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنی جنسی تشفی اپنے شوہر سے کرتی ہے اور ذوقی تسکین کے لئے اس نوجوان کے پاس آتی ہے۔ اس عشق کا انجام ناکامی اور نامرادی پر ہوا۔ مجھے اس بات کا یقین تھا کہ اگر یہ عورت پہرگی پر آمادہ ہو جاتی تو وہ نوجوان کبھی کا اُسے چھوڑ کر کنارہ کشی کر لیتا۔ وہ ایک کائیاں عورت تھی اور یہ بات جانتی تھی اسی لئے رومان کو طول دے رہی تھی۔ نوجوان نے ایک دن مجھے بتایا کہ وہ ادھر عُم کی گول مٹول عورتوں میں بے پناہ شش محسوس کرتا ہے۔ ایک دن وہ کہنے لگا کہ اس عورت سے متعارف ہونے سے قبل وہ ایک عورت سے غائبانہ پیار کرتا رہا جو اپنے بچوں کو میرے کرانے کے لئے روزانہ مال روڈ پر آیا کرتی تھی۔ باتوں ہی باتوں میں اُس نے بتایا کہ اُس کی ماں نے اس سے کبھی بھی پیار نہیں کیا جس کے لئے وہ بچپن میں ترسنا رہا تھا۔ اس انکشاف سے بات کھل کر سامنے آگئی۔ وہ ادھر عُم عورتوں میں محبت اور مامتا دونوں کی تلاش کیا کرتا تھا۔

نوفیروں کو بڑے بڑے کٹھن مسائل اور الجھنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مساعد حالات میں ہی وہ بلاغت کے آشوب سے محفوظ نہیں رہ سکتے اور حالات نامساعد ہوں تو بعض اوقات انہیں ایسے

کرب ناک اور رُوح فرسا تجربات ہوتے ہیں کہ جن کے اثرات اُن کی ساری زندگی کو مسموم کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر میں یہاں ایک لڑکی کی سہ گزشتہ مختصر بیان کروں گا جس نے ماں ہی میں بھڑے مشورہ لیا تھا۔ زرنینہ — یہ نام فرضی ہے — ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئی۔ وہ سُرخ اور سفید خوب رُو لڑکی تھی اور کئی بھائیوں کی ایک بہن تھی۔ وہ دس برس ہی کی عمر میں بالغ ہو گئی۔ لکھتی ہے۔

” — میں دس برس کی عمر ہی میں جوان ہو گئی۔ اُن دنوں امی سخت بیمار تھیں اور میری ناک جو مجھ سے چند سال بڑی ہیں آئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے مجھے سمجھایا۔ چند بڑی عمر کی لڑکیوں نے بتایا تھا۔ میں نے امی سے چھپا مگر انہیں پتہ چل گیا۔ وہ بہت روئیں، یقین نہ آیا اور مجھے ایک ماہر انگریز لیڈی سے گئیں، معائنہ کرایا۔ وہ بھی حیران رہ گئی۔“

زرنینہ کے مصائب کا آغاز اسی وقت سے ہوا۔ ایک دفعہ اس کی امی کو کسی کام کے لئے کسی دوسرے شہر کو جانا پڑا۔ زرنینہ گھر میں اکیسی رہ گئی۔ انہی ایام میں اس کے سگے ماموں نے اس بھولی بھالی لڑکی کو بہلا پھینکا کر اپنی ہوس کا نشانہ بنایا۔ جب اس کے بڑے بھائی کو اس بات کا علم ہوا تو وہ بھی اپنی بہن کی اکبر و ریزی پر کمر بستہ ہو گیا اور یہ سلسلہ دور تک چلا گیا۔

” — میں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ درندوں اور لیٹروں کا ماحول تھا۔ میں کس جگہ سے بناؤں کہ میرا سگا بھائی، سگا ماموں، سگا چچا مجھے اپنی ہوس کا نشانہ بناتے رہے۔ میں کچھ نہیں جانتی کہ یہ حادثہ کب اور کس طرح پیش آیا اور نہ ہی ان حادثات کی تعداد کا اندازہ ہے۔ میں آپ کو ان دنوں کی ذہنی کیفیت رتی رتی بتا سکتی ہوں۔ ان باتوں کو اتنی کم عمری میں کیونکر سمجھتی تھی کہ یہ بڑی اور گناہ ہیں۔ پھر بھی کسی کو بتا نہیں سکتی تھی۔ ہاں چند ہم جویاں اور ایسی لڑکیاں جو خود ان باتوں سے دوچار تھیں، دافن تھیں بری مصیبتوں سے۔ مگر مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان کے ذہن پر تو میری طرح بوجھ نہ رہتا تھا۔ وہ تو میری طرح پریشان ہو کر خود کو بچانے کے ایسے جتن نہ کرتی تھیں جب کہ ماضی کے یہ روپ سامنے آتے ہیں تو جنس سے نفرت ہو جاتی ہے۔ یقین کیجئے کہ میں نے

ایسے ہوسناک بھیانک چہرے دیکھے ہیں کہ میں آن بھی کانپ اٹھتی ہوں۔“

زرتینہ کی ماں گھر لوٹی تو زرتینہ کے ماموں نے زرتینہ کے بھائی کی شکایت کی اور اپنی بہن کو بیٹے کے خلاف خوب بھڑکایا۔ زرتینہ کی ماں نے بیٹی سے پوچھ گچھ کی کہ تمہارا ماموں یہ کہتا ہے۔ زرتینہ نے رو رو کر کہا کہ وہ خود بھی تو ایسا ہی کرتے رہے ہیں۔ یہ سُن کر زرتینہ کی ماں بیٹی کو گلے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مشورے کی ابتداء میں مجھے شک تھا کہ زرتینہ جنس زدہ ہے اور جو بھی مرد اس سے ملے ہو تا ہے وہ اس کے بارے میں خیال ہی خیال میں فرض کر لیتی ہے کہ میرا اس سے جنسی تعلق ہے لیکن بعد میں مجھے یقین آ گیا کہ جو کچھ اس نے لکھا ہے حرف بہ حرف صحیح ہے۔

سکول اور کالج میں زرتینہ بڑی ذہین اور قابل سمجھی جاتی تھی اور ادبی ذوق سے بہرہ وافر رکھتی تھی۔ اُس کے افسانے شائع بھی ہوئے ہیں۔ کالج جا کر اُسے جنسیات کے بارے میں کتابیں پڑھنے کا شوق بھی پیدا ہو گیا۔ اُس نے تحلیل نفسی میں بھی کچھ شدید پیداکرنی۔ اس زمانے میں اُسے خود کاری اور ہم جنسی اختلاط کے تجربات بھی ہوئے۔ اوائل شباب کے تلخ واردات کے باعث جنس کے بارے میں اُس کا نقطہ نظر مریضانہ ہو گیا۔ احساسِ جرم کی تلخی اور ذہنی کربِ ناک سے نجات پانے کے لئے اُس نے ایک نام نہاد ماہر نفسیات سے رجوع کیا جو اخباروں اور رسالوں میں جنسی مسائل پر مشورے دیتا ہے۔ جب زرتینہ نے اپنی روداد اس عطائی کو لکھ کر بھیجی تو وہ نفسیاتی مشورے کے پردے میں خود اُس سے اظہارِ عشق کرنے لگا۔ اُس نے زرتینہ کو بار بار لکھا کہ جنسی خواہش کی تندی و تیزی سے نجات پانے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ فوری طور پر اُس کی آسودگی کی جائے۔ اُس نے زرتینہ کو خود کاری اور فر زہ کرنے کے طریقے بھی بتائے اور اُن پر عمل کرنے کی تلقین کی۔ زرتینہ کہتی ہے کہ کچھ عرصے کے بعد یہ حضرت اُس کے شہر میں آئے، ایک ہوٹل میں ٹھہرے اور اُسے بلا بھیجا۔ زرتینہ اُس سے ملنے کے لئے چلی گئی۔ ماہر نفسیات کو زرتینہ کے ماضی کا علم تو تھا ہی اُس نے کسی جھجک کے بغیر اُس سے اظہارِ مذاک کیا اور چند خوش تصویریں دکھا کر اُسے سپردگی پر آمادہ کر لیا۔

ستم ظریفی یہ ہوئی کہ جناب ماہر نفسیات 'خود کوتاہ ہمت نکلے اور بالفاظ سعدی شیرازی درحملہ اول عصائے شیخ بستگست۔ زینتہ لغزت اور حقارت کے جذبات لے کر واپس لوٹی۔ بقول اُس کے "اپنی توقعات کے عمل سمار کر کے اور خود پر ایک اور داغ لگا کر واپس لوٹ آئی۔"

اس بات کا ذکر زینتہ نے اپنی چند سہیلیوں سے کیا جو اس ماہر نفسیات سے مشورے یا کمرتی تھیں۔ ان سب نے مل کر منصوبہ بنایا کہ اس عطائی کو اخباروں میں بے نقاب کیا جائے۔ زینتہ نے ماہر نفسیات کو لکھا کہ ہمیں آپ کی اہمیت کا علم ہو گیا ہے، دوسری لڑکیوں کو تمہارے چنگل سے بچانے کے لئے تمہارے خلاف مہم چلائی جائے گی۔ اس پر اُس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے اور اُس نے بڑی عاجزی سے لکھا کہ خدا را مجھ پر رحم کرو ہمیں تو میں ملک چھوڑ کر کہیں چلا جاؤں گا یا کسی تکیے پر مجاور بن کر بیٹھ رہوں گا۔ زینتہ کو رحم آگیا اور اُس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا البتہ مجھے اُس کا نام اور پتہ بتا کر کہا کہ آپ اُسے بے نقاب کرنا چاہیں تو میں اُس کے خطوط آپ کو دے دوں گی لیکن یہ ملک تو اس نوع کے بے سواد عطائیوں سے بھرا پڑا ہے جو نفسیات کی اجد سے بھی ناواقف ہیں لیکن دھوم دھڑلے سے تحیل نفسی اور مابعد النفسیات کے چکر چلا رہے ہیں۔ میں کس کس کی نشان دہی کر دوں گا۔

زینتہ نے ایک ڈاکٹر کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ اُس کے کان میں درد رہتا تھا ایک دن وہ اپنی ایک سہیلی کو ساتھ لے کر ایک ڈاکٹر کے یہاں گئی۔ کمپوٹر نے اُس کی سہیلی کو باتوں میں لگا لیا اور زینتہ ڈاکٹر کے کمرے میں چلی گئی۔ اُس وقت کوئی دوسرا مریض وہاں موجود نہیں تھا۔ زینتہ کہتی ہے کہ مجھے دیکھ کر ڈاکٹر کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اُس نے کہا آپ کے مرض کی تشخیص کے لئے فردری سے کہ میں آپ کا پورا ملاحظہ کر دوں، آپ لباس اتار دیں۔ زینتہ اُس کی نیت کو بھانپ گئی اور کہا نہیں آپ میرے کان کا معائنہ کریں۔ ڈاکٹر بضد ہوا کہ کان کے پٹھوں کا دوسرے اعضاء سے بھی تعلق ہوتا ہے اس لئے سارے جسم کا معائنہ ضروری ہے۔ زینتہ نے انکار کیا تو ڈاکٹر نے اُسے بڑھ کر اپنی باہیں اُس کے گلے میں جامل کر دیں اور محبت کا اظہار کرنے لگا۔ زینتہ نے غصے سے اُس کے ہاتھ جھٹک دیئے اور اُسے سخت سخت کہا تو ڈاکٹر فرس پر دو زانو بیٹھ گیا اور گڑگڑا کر کہنے

لگا "خدا کے لئے یہ بات کسی کو نہ بتائیے گا۔ مجھ سے سخت حماقت ہوئی۔ میں معافی چاہتا ہوں" اور وہ زرتشت کے قدموں میں گر کر گھلکیانے لگا۔ زرتشت کہتی ہے کہ میں نے اُس مسخرے کو معاف کر دیا اُس نے بتلایا کہ یہ ڈاکٹر شاعر بھی ہے پھر مجھے اُس کا نام بتلا کر پوچھا کیا آپ اُس کو جانتے ہیں میں نے مصداقی نفی میں جواب دیا لیکن ساتھ ہی کہا شاعر ڈاکٹروں کے پاس نہ جایا کر خدا معلوم کب ڈاکٹری کرتے کرتے شعر کہنے لگیں یا شعر کہتے کہتے ڈاکٹری کرنے لگیں۔

زرتشت کی سرگذشت سے بلوغت کی الجھنیں اور معاشرے کے نامور سامنے آجاتے ہیں جیسا کہ زرتشت نے لکھا ہے کئی لڑکیاں اپنے ہی عزیزوں کی ہوس کا نشانہ بن جاتی ہیں ظاہر ہے کہ جب ہوس کی آگ بھڑک اٹھتی ہے تو محرمات بھی اُس کی زد میں آجاتی ہیں۔ ابن حزم لکھتا ہے۔  
 "ایک بدوی عورت اپنے کسی عزیز سے حاملہ ہو گئی۔ کسی نے پوچھا "ہند! تیرے شکم میں کیا ہے۔ وہ بولی "یہ پھل ہے تکیوں کے قریب ہونے کا اور رات کے طویل ہونے کا۔"

ماں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی کنواری جوان لڑکیوں کو اپنے سے جدا نہ ہونے دیں چچا زاد، ماما زاد وغیرہ سے بطور خاص احتیاط لازم ہے۔ اس کے بارے میں معمولی سی غفلت لڑکی کے لئے عمر بھر کی ذہنی و جذباتی اذیت کا سبب بن جاتی ہے جیسا کہ زرتشت کے احوال سے ظاہر ہے۔ بلوغت کے ابتدائی دور میں فویزوں سے ذمے دارانہ رویے کی توقع کرنا عجیب ہے۔

ہمارے زمانے کے اوائل شباب اور شباب کے مسائل اکثر بیشتر صنعتی معاشرے کی پیداوار ہیں۔ قبائلی اور زرتشتی معاشرے میں جوہنی ایک لڑکا شباب کی سرحد میں قدم رکھتا ہے اُسے بالغ تسلیم کر کے اُس کا بیاہ کر دیا جاتا ہے۔ لڑکے بچپن ہی میں پیشہ دروں کے پاس شاگرد بٹھا دیے جاتے ہیں اور نوعمری ہی میں اُن کی شادی کر دی جاتی ہے۔ آج بھی ہمارے دیہات میں جب ایک لڑکا ہل چلا لگتا ہے تو اُسے بالغ سمجھ کر اُس کا نکاح کر دیتے ہیں۔ اسی طرح لوہاروں، بڑھیوں، نائیوں، موچروں

لے طوق الحمار

کے بیٹے اوائل عمر ہی میں کمانا شروع کر دیتے ہیں اور اُن کا نکاح کر دیا جاتا ہے۔ صنعتی انقلاب کے شیوع اور تعلیم و تربیت کے رواج سے صورتِ حالات بدلتی جا رہی ہے۔ نوجوانوں کو تعلیم و تربیت کے مراحل طے کرنے کے لئے کئی برس درکار ہوتے ہیں۔ ڈاکڑ یا انجینئر بننے یا لکینیکی پیشہ وارانہ تربیت کے حصول میں لڑکوں اور لڑکیوں کو طویل عرصے تک مجبور رہنا پڑتا ہے اور بسا اوقات تیس تیس برس کی عمر تک شادی کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ تیرہ چودہ برس کی عمر کا لڑکا لڑکی بالغ ہو جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ چودہ پندرہ برس تک وہ تجرد کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہی وہ طویل وقفہ ہے جس میں وہ گونا گوں الجھنوں کے شکار ہو جاتے ہیں۔ اس دوران میں اکثر نوجوان خود کاری سے ربورع لاتے ہیں جس سے اُن کی صحت پر ناخوشگوار اثر پڑتا ہے یا کبھیوں کے پاس جاتے ہیں جو اور زیادہ خطرناک ہے۔ پڑھے لکھے نوجوان لڑکے لڑکیاں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد قد زنا یہ توقع کرتے ہیں کہ انہیں اپنے جیسا پڑھا لکھا جیون ساتھی ملے۔ اس میں ناکامی ہو تو بعض اوقات ساری عمر مجرّد رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں ایسے پڑھے لکھے مجرّدوں اور کنواریوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ ان میں اکثریت کنواریوں کی ہے۔ ناآسودہ جنسی خواہش کی قبرمانی اُن کی شخصیت اور کردار کو مسخ کر کے رکھ دیتی ہے۔ برٹرینڈ رسل لکھتے ہیں: ”

”اکثر نوجوان جنسی جذبے کے ہاتھوں آغازِ شباب ہی سے ایسے گونا گوں مہاسب کے شکار ہو جاتے ہیں جن سے پہلو بچایا جاسکتا ہے۔ کوئی نوجوان پاکبازی کی زندگی بسر کرے تو ضبطِ نفس کی مشکلات اُسے کم محبت بنا دیتی ہیں اور اُسے قوتِ اقدام سے محروم کر دیتی ہیں۔ شادی کے بعد بھی وہ ضبطِ نفس سے نجات نہیں پاسکتا یا نجات پالیتا ہے تو اُس کا رویہ اتنا جاہلانہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی بیوی سے محبت کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ کوئی نوجوان کبھیوں کے ہاں جائے تو اُس کے ذہن میں محبت کے نفسانی اور مثالیاتی پہلوؤں کے مابین ایک خلیج سی حامل ہو جاتی ہے اور وہ ابتدائی دور کی یہ

خلج پائے میں ناکام رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعد میں عورت کے ساتھ اُس کے تعلقات یا تو جنسی محبت سے عاری ہوتے ہیں یا اُن کے ساتھ پستی اور گراؤ کا احساس وابستہ ہو جاتا ہے۔

ان شکلات پر قابو پانے کے لئے اضلاع متحدہ امریکہ میں رفاقت کی شادی کا چرچا ہوا۔ جج لنڈے نے یہ تجویز پیش کی کہ نوجوان لڑکے لڑکیاں چند سالوں تک نکاح کے بغیر میاں بیوی بن کر رہیں تاکہ طویل تجربہ کے احساسِ جُرم جنسی محرومی اور بے راہ روی سے محفوظ رہ سکیں۔ یورپ میں صرف سویڈن ہی میں اس نوع کی شادی کا تجربہ کیا گیا ہے۔ دوسرے ممالک میں بوجہ اس کی ترویج ممکن نہیں ہو سکی۔ تاریخ تمدن میں رفاقت کی شادی کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ وحشی اقوام میں اس کا رواج قدیم زمانے سے موجود ہے۔ جزیرہ ٹروبریڈ میں قبیلے والوں کی بستی سے الگ تھلک ایک جھونپڑا تعمیر کر دیا جاتا ہے جسے لوکا ٹولا کہتے ہیں۔ رات کے وقت کنواری لڑکیاں لڑکے اس میں اکٹھے ہوتے ہیں اور اپنے اپنے ساتھی کے ساتھ رات گزار کر صبح سویرے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔ فرسینڈو ہنریک لکھتا ہے کہ ہندوستان کی ریاست بستر (سی پی) میں موریا قبائل میں لوکا ٹولا نہایت منظم صورت میں موجود ہے۔ موریا اُسے گھوٹل کہتے ہیں۔ جو لڑکا لڑکی اس میں جنسی ملاپ کرتے ہیں انہیں ایک دوسرے کا 'جوڑی دار' کہتے ہیں۔ کوئی لڑکا کسی ایک لڑکی پر ٹکلی حق نہیں جتا سکتا۔ دوسری قسم کا گھوٹل وہ ہے جس میں کوئی لڑکا لڑکی ایک دوسرے سے مستقلاً وابستہ نہیں ہوتے بلکہ جس کے ساتھ چاہیں خلوت میں جا سکتے ہیں۔ اسے 'مندی بدنا' کہتے ہیں۔ گھوٹل میں عام طور سے بیس لڑکیاں لڑکے رہتے ہیں۔ لڑکے کو 'چیک' اور لڑکی کو 'میار' کہتے ہیں۔ گھوٹل میں جانے کی اجازت صرف رات کو ہوتی ہے۔ دن کو یہ جگہ ویران پڑی رہتی ہے۔ گھوٹل کے باہر کسی لڑکے لڑکی کو جنسی ملاپ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ کوئی لڑکی حاملہ ہو جائے تو اسے اپنے منسوب سے بیاہ دیا جاتا ہے جسے اُس کے حمل پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا کیوں کہ جس لڑکے کا حمل رہ جائے

اُسے حاملہ کے ساتھ شادی کرنے کی سخت مخالفت ہے۔ فرنیڈونبرگ کہتا ہے کہ موریہ قبیلے نے بوکھا ٹولا کی صورت میں نوخیزوں کے جنسی مسائل کا حل تلاش کر لیا ہے جب کہ مہذب اقوام اس کے بارے میں نمونہ قیل و قال میں مصروف ہیں۔

بچوں اور نوخیزوں کو جنسی تعلیم دلانے کے بارے میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس کے مخالف کہتے ہیں کہ جنسی تعلیم سے بچے اور نوخیز جنس میں قبل از وقت دلچسپی لینا شروع کر دیتے ہیں اور اُن کے سروں میں جنسی تجربات کرنے کا سودا سہا جاتا ہے۔ اس کے حامیوں کے خیال میں بچوں کو اوائل عمر ہی میں ضروری جنسی معلومات بہم پہنچا دی جائیں تو وہ بے راہ روی سے محفوظ رہیں گے۔ برٹریڈ رسل کہتے ہیں کہ اِس نوع کی تعلیم خالص علمی اور تحقیقی انداز میں دی جائے، وعظ، نصیحت سے کام نہ سونے کی بجائے اُنٹا بگڑ جاتا ہے۔ اُن کے الفاظ میں:

”بچپن کی اخلاقی تلقین جنسی پہلو سے ضرر رساں ثابت ہوتی ہے بچے کو کسی سخت گیر آیا یا والدین نے رسمی رواجی تعلیم دلائی ہو تو چھ برس کی عمر کو پہنچنے تک اُس کے ذہن میں گناہ اور اعصائے نہانی کا ربط و تعلق اِس درجے محکم ہو جاتا ہے کہ وہ ساری عمر اُس سے پھینچا نہیں چھڑا سکتا.... نتیجہ بہت سے بالغ مرد محسوس کرتے ہیں کہ جنس عورت کی اخلاقی لپٹی کا باعث ہوتی او وہ اپنی عورتوں کی عزت اُس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک کہ وہ جنسی ملاپ سے نفرت کا اظہار نہ کریں۔“

میو لاک ایس نے اپنی ضخیم نفسیات جنس کی چھٹی جلد میں یہ تجویز پیش کی ہے کہ بچوں کو اوائل عمر ہی میں مصورتی اور سنگ تراشی کے عریاں شاہ کار دکھانا چاہیے۔ اِس سے اُن کا جمائاتی ذوق پختہ ہو گا اور وہ ہوس پرور عریانی کے منفی اثرات سے محفوظ رہیں گے کیوں کہ اُن پر حسین اور خش کا فرق واضح ہو جائے گا۔ آج کل کے اکثر علمائے جنسیات جنسی تعلیم کے حق میں ہیں۔ راقم الحروف بھی بچوں کی جنسی تعلیم کا حامی ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ جنسی معلومات سے بے بہرہ ہونے کا عث

# حُسن و جمال

جنسیات میں حُسن نسوانی کو بھی معرض بحث میں لایا جاتا ہے۔ بعض عورت دشمن عورت کے حُسن و جمال کے قابل نہیں ہیں مثلاً شوہنہاں کہتا ہے کہ تنگ کندھوں، بھدھی ٹانگوں اور چوڑے گولہوں والی اس مخلوق کو حسین کہنا صریح بدذوقی ہے لیکن اکثر ارباب ذوق و نظر حُسن نسوانی کے راگ الاپتے رہے ہیں۔ بی، آر ہیڈن کہتا ہے۔

”حُسن و جمال صرف عورت ہی کے جسم میں ہوتا ہے“

بھرتری ہری نے کہا تھا۔

”چراغ، آگ، بستادوں، چاند، سورج کے ہوتے ہوئے بھی ایک آہو چشم حینہ کے بغیر میری دنیا تاریک ہے۔“

ایک حسین عورت کا چہرہ اور جسم نہ صرف مردوں کے لئے جذب کشش کا باعث ہوتا ہے بلکہ خود عورتیں بھی اپنے پر شباب، گدرائے ہوئے اعضاء اور موزوں خد و خال کو دیکھ دیکھ کر حفا اندوز ہوتی ہیں۔ حُسن ازل اور فطرتی مناظر کے حُسن کا شعور بھی حُسن نسوانی ہی کے حوالے سے ارزانی ہوتا ہے۔ صوفیہ نے حُسن ازل سے عشق کا اظہار کرتے ہوئے وہی پیرایہ بیان اختیار کیا ہے جس سے کوئی چاہنے والا اپنی حسین محبوبہ کو مخاطب کرتا ہے۔ مائسٹر اکہارٹ، میراں، غلام فرید، سیفان جارج وغیرہ نے عشقِ حقیقی کا اظہار کرتے وقت مجاز ہی کی زبان سے کام لیا ہے۔ انسانی ذہن و قلب میں فطرتی مناظر کے حُسن کا شعور اس وقت پیدا ہوتا ہے جب آغاز شباب کے ساتھ جنسی خواہش از سر نو بیدار ہو جاتی ہے۔ ایک بچہ دہکتی ہوئی شفق یا اُڑتے بادلوں کے مناظر سے محفوظ نہیں ہو سکتا لیکن نو فیزی کے دور میں جنسی خواہش کی بیداری کے ساتھ جب وہ عورت کے حُسن و جمال

میں شش محسوس کرتا ہے تو اس کے ساتھ ہی وہ فطرتی مناظر کے حسن سے بھی لطف اندرز ہونے لگتا ہے۔ ارباب بصیرت نے بد صورت عورت کے وجود سے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ جس عورت کو لوگ بد صورت سمجھتے ہیں وہ بھی اپنے چاہنے والے کے بازوؤں میں حسین بن جاتی ہے۔  
فرانس کے مشہور ننگ تراش روداں نے کہا ہے کہ

”نیچر کے مشاہدے سے مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ میں صرف جسمانی حسن کے حوالے سے زور کے حسن کی جھلک دیکھ سکتا ہوں، میرے بعد ایسا شخص ضرور آئے گا جو اس بات کی تفصیل بتا سکے گا جس کی میں صرف جھلک ہی دیکھ پاتا ہوں کہ تمام دنیا حسین ہے اور تمام بنی نوع انسان خوبصورت ہیں۔ ایک جیسی یا ایک منگولی کا بھی حسن کا ایک معیار ہے خواہ وہ ہمارے معیار سے کتنا ہی مختلف کیوں نہ ہو اور اُن کے کردار کی بھی یہی کیفیت ہے۔ بد صورتی کا کوئی وجود نہیں ہے جب میں جوان تھا تو میں نے بھی دوسروں کی طرح یہ غلطی کی تھی۔ میں صرف خوبصورت عورت ہی کی پھاتیاں تراش سکتا تھا۔ آج میں کسی بھی عورت کی پھاتیاں تراش سکتا ہوں اور وہ اتنی ہی خوش وضع ہوں گی کوئی عورت خواہ وہ بظاہر کتنی ہی بد صورت ہو اپنے چاہنے والے کی آغوش میں حسین بن جاتی ہے۔ اُس کے کردار میں، اُس کے پُر جوش شباب میں ایک حسن ہوتا ہے جو محض اظہار میں آتا ہے کیوں کہ عورت تو وہ سانچا ہے جس میں پُر جوش جذبات متشکل ہوتے ہیں اگر جذبات نہ بھی ہوں تو بھی رگوں میں خون تو ہر سال دوڑتا ہے اور ہوا ہے جو پھیپھڑوں میں جاتی ہے۔“

فارسی والے کہتے ہیں لیلا راجشیم بمنوں باید دید۔ ایک دن عبدالملک بن مروان نے لیلا کو دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب قیس عامری مرچکا تھا اور لیلیٰ کا حسن و شباب رختِ سفر لے یہ اقباس ہیریلک ایلس کی نفسیات جنسِ ملکہ چہارم میں درج ہے۔

باندھ چکا تھا۔ لیلے کو دربار میں پیش کیا گیا تو عبد الملک نے حقدت سے اُس کی جانب دیکھ کر کہا  
 ”تیرے عاشق نے تجھ میں کیا دیکھا کہ تیرے عشق میں مبتلا ہو گیا“

لیلے نے برجستہ جواب دیا

”لوگوں نے تجھ میں کیا دیکھا تھا کہ تجھے خلیفہ بنا دیا“ عبد الملک بن مروان اپنا سامنے لے کر  
 رہ گیا۔

سٹراٹن کے خیال میں حُسنِ نسوانی کا معیار ہر کہیں ایک جیسا ہے البتہ طبعی ماحول اور نسلی روایت  
 کے باعث کم و بیش مختلف بھی ہو گیا ہے۔ ہم ذیل میں مختلف اقوام سے چند تصویریں پیش کریں گے۔  
 سمجھتانی کی داستان حمزہ بن مغیرہ میں ایک حسینہ کے حُسن و جمال کا نقشہ اِن الفاظ میں کھینچا  
 گیا ہے۔

”ایک کم سن عاتون یکا یک پردے میں سے نکلی جس کے قدرِ عنایت شاخِ بید کی طرح  
 نازک تھا، آنکھیں سُرملیں اور بڑی بڑی، بھوس چوڑی، پیشانی کشادہ، ہنڈ  
 کی سفیدی قمیض کی سُرخ پر غالب تھی، چھاتیاں ابھری ہوئی، پیٹ گویا حریر  
 کا تھان پٹا ہوا، اس کی شکنیں کاغذ کی تہ سے مشابہ تھیں، سر کے بالوں سے  
 مُشک کی خوشبو اڑ رہی تھی، ناک ستواں، ٹھوڑی موتی جیسی گول، دانت موتیوں  
 کی طرح، منہ سے خوشبو کی لپٹیں اڑ رہی تھیں“

الف لیلہ ولیلہ سے ایک لڑکی کا سراپا

”نوعمر لڑکی، بلند بالا، سینہ ابھرا ہوا، حُسن و جمال اور آب و تاب اور قد و اعتدال  
 میں لا جواب، روشنی پیشانی، نیل گائے کی آنکھیں، شعبان کے چاند کی کمان کے  
 ابرو، شقایق النعمان کے سے رُخسار، سلیمان کی انگوٹھی کا سا منہ، مرجان کی طرح  
 سُرخ ہونٹ، موتی کی لڑی کی طرح دانت، غزال کی سی گردن، شامیانے کی  
 طرح سینہ، پستان جیسے دو انار، پیٹ ریشم کی طرح نرم..... اس کے بدن کے

اعضاء، خوبصورت، جلد ملائم اور چہرہ حسین ہے گویا وہ اچھے قلم کی مہری کی ٹلی ہے۔  
 عرب حسنِ نسوانی کے بہت بڑے مُبصر تھے۔ انہوں نے اس موضوع پر مستقل کتابیں تالیف کی ہیں۔  
 ان میں سلامہ بن دھون کی کتاب ”المقالہ فی مذهب ابدان النساء اور جاحظ کی کتاب القیان  
 قابلِ ذکر ہیں۔ عربوں کی طرح قدیم دور کے ہندو بھی حسنِ نسوانی کے قدردان تھے۔ بھرتری ہری ایک  
 حسینہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے۔

”چاند سا سُندر مکھڑا، کنول کو شرمانے والی مخمور آنکھیں، سونے کی دمک کو ماندخ  
 والا کُندن سا بدن، بھونرے سے بڑھ کر سیاہ گھنی زلفیں، طلائی گلس کی طرح  
 پھاتوں کا اُبعد، ہاتھی کی سونڈ کی طرح گدرائی ہوئی رانیں، رسیلی آواز۔“  
 دیشتی کا حسن ہے

”دیشتی کی چال ہنس کی ہے، اُس کی باتوں سے اُمت ٹپکتا ہے، ہرن کی سی  
 آنکھیں جن سے لُٹ پھمکتا ہے، چہرہ چاند کی طرح روشن، اُس کے چہرے سے  
 حُسن کی شعاعیں چاند کی کرنوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر نکلتی ہیں۔“  
 سیتا کا سراپا ہے

”تیرے دانت سفید ہیں، تیری آنکھیں بڑی بڑی، پتلیاں سیاہ، ان کے کنارے  
 سُرخي مائل، رانیں ہاتھی کی سونڈ کی مانند، تیری پھاتیاں اُبھری ہوئی گول، سر  
 پستان اُوپر کی جانب اُٹھتے ہوئے۔“  
 کالی داس شکنتلا کے حُسن کے بارے میں کہتا ہے۔

”شکنتلا کے ریشے ہونٹ نو فیز کو نیل کی سُرخي لئے ہوئے ہیں۔ اُس کے بازو  
 نرم پلکیلی ہُنسیوں کے مشابہ ہیں اور جوشِ شباب غنچہ ناسگفتہ کی طرح اُس کے  
 انگ انگ سے نمایاں ہے۔“

لے بھرتری ہری، بے کشن چوہدری لے حکایاتِ پنجاب آر، سی ٹیوٹ لے رامائن

دینتی، سینا، شکستہ ہندوؤں کی مثالی حسین عورت پر مبنی کا نمونہ ہیں جس کی تعریف میں قلیان کہتا ہے۔

”پر مبنی کی جلد سرس کے پھول کی طرح نرم، چال راج ہنس کی، آواز گول کی، بدن میں خوشبو ہوتی ہے۔“

چینی حسن کا نمونہ۔

”ہاتھوں کی انگلیاں جیسے گھاس کی نرم پتیاں، جلد نرم جیسے سیال مرہم گردن ریشم کی طرح سفید، دانت ہموار جیسے کہ تربوز کے بیج، آنکھیں خوش وضع جن میں سیاہی اور سفیدی ایک ساتھ چمک رہی ہیں، کیشہ قامت۔“

جاپانی حسینہ کا نقشہ خان لکین لگ نے ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

”سرخ چھوٹا، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، لمبی پلکیں، محرابی ابرو، چہرہ گول، رخسار نرم و نازک جن کا رنگ ہلکا گلابی، ناک سیدھی، دہن چھوٹا، ہونٹ تروتازہ جن میں چمکتے ہوئے سفید دانت، بھری بھری گردن، گد ریا ہوا بدن، چھاتی گول اور سخت، سرین زیادہ فریب نہیں، ہاتھ پاؤں نازک۔“

جے، دیوہی نے سنگھالی حسینہ کی وصف نگاری کرتے ہوئے لکھا ہے۔

”اُس کی ناک باز کی چوڑی کی مانند ہے، ہونٹ سرخ مونگے کی طرح، گردن بھری ہوئی، سینہ چوڑا، چھاتیاں گول زرد ناریل کی مانند، گد ریا ہوا بدن، جلد کوئل، کمر تپتی، اتنی تپتی کہ ایک ہاتھ کی گرفت میں آجائے۔“

پشتو کا مشہور شاعر خوشحال خان خٹک ایک نظم میں آفریدی عورتوں کے حسن و جمال کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

”آدم خیل آفریدی دوشیزا میں سرخ و سفید رنگ کی ہیں، اُن کے حسن اور ادائیں دلکش ہیں، مست آنکھیں لمبی پلکیں، سیاہ ابرو، ریشم ہونٹ، گلابی رخسار، چمکتی پیشانیاں، اُن کے دہن ننھی کلیاں ہیں، دانت ننھے موتی ہیں، اُن کے سیاہ

بال مغز میں، جلد ہاتھی دانت کی طرح سفید ہے۔ اُن کا قد الف کی طرح سیدھا ہے۔  
یورپ کی نور دک نسل کے اقوام میں سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں کو خوبصورت سمجھا جاتا ہے جنوی  
یورپ کی لاطینی اقوام میں سیاہ بال اور سیاہ آنکھیں کشش کا باعث ہوتی ہیں، ایرانی کشیدہ قامت،  
پتلی کمر، ساق سیمیں، انارپستان، غنچہ دہن، سبب زخار کے شیدائی ہیں۔

ان تصویروں میں جس حینہ کا تصور آنکھوں کے سامنے ابھرتا ہے وہ کشیدہ قامت ہے،  
اُس کا بدن گدرا یا ہوا، اعضاء سانچے میں ڈھلے ہوئے، لمبی زلفیں، قوسی ابرو، بڑی بڑی مرست  
آنکھیں، ترشے ہوئے لب و دہن، زخاروں پر شباب کی سُرخ، پھاتیوں اور سُرنیوں کا اُبھار نمایاں  
ہاتھ پاؤں چھوٹے چھوٹے اور گداز، جسم کے خطوط میں گولائی عورت کے جسم کے بعض اعضاء زیادہ  
پُرخشش ہوتے ہیں اور خاص طور سے جنسی خواہش کی ترغیب کا باعث ہوتے ہیں انہیں نفس پرور  
اعضاء کہا جاتا ہے۔ علمائے جنسیات کے خیال میں گھنیزی زلفیں، رگسی آنکھیں، بھرے بھرے  
سرخ ہونٹ، ابھری ہوئی چھاتیاں اور کوہے اور بدن کی خوشبو خاص طور سے نفس پرور ہوتی ہیں۔  
زلف پرپیچ اور گیسوئے دراز کو حُسن کا لازمہ سمجھا جاتا ہے۔ عورت کے چہرے کے لئے گھنیرے  
بال چوکھے کا کام دیتے ہیں جس میں اُس کے چہرے کا حُسن نکھر آتا ہے اور چہرہ دمک اٹھتا ہے۔  
بعض عورتوں کے سر کے بال اتنے لمبے ہوتے ہیں کہ ساق سیمیں کی خبر لاتے ہیں۔ فردوسی کہتا ہے  
کہ جب ایک رات کو زال اپنی محبوبہ رودادہ سے ملنے گیا تو اس نے اپنے سر کے بال کھول کر شہر  
پناہ کے نیچے لٹکا دیئے اور کہا انہیں پکڑ کر اوپر آجاؤ۔ ایرانی شاعر نے زلف مغنیرے گیسوئے مشکیں  
زلفِ دوتا، زلفِ سچاں اور طرۂ مشکبو کا ذکر کیا ہے۔ مغربی عورت نے سر کے بال کٹوا دیئے ہیں  
جس سے اُس کا حُسن گہنا گیا ہے۔

ایک حینہ کی کٹوری وار مست و مخمور آنکھوں میں ہلاکی کشش ہوتی ہے۔ اربابِ نظر خد و خال  
اور قد و قامت کے حُسن و رعنائی کے ساتھ عشوہ و ادا کو بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ عشوہ و ادا اور

نازد غزہ کا تعلق آنکھوں سے ظاہر ہے۔ ایک حسینہ ایک نگاہ غلط انداز یا ایک نگاہ دُور دیدہ سے  
 دلوں میں آگ لگا دیتی ہے۔ پیر نگاہ، کمان ابرو، نگاہ ناز، چشمِ نرگس، چشمِ غزال، چشمِ فقاں،  
 چشمِ سرگس، چشمِ خمارِ آلودگی ترکیبِ نہایت یلغ ہیں۔ اقبال ۛ

نظر آئیں مجھے تقدیر کی گہرائیاں اُس میں نہ پوچھ لے ہمشیں مجھ سے وہ چشمِ سر نہ کیا ہے  
 چشمِ بیار اور چشمِ خوابِ ناک کے بارے میں ایک عرب شاعر کہتا ہے ۛ  
 وَحَاثَهَا دَسْنَىٰ إِذَا نَظَرْتُ أَدْمُذْنِيْفَ لَمَّا يَفِيْقُ بَعْدُ  
 (جب وہ دیکھتی ہے تو یوں معلوم ہوتی ہے جیسے اُد نگہ رہی ہو یا جیسے مدت سے بیمار چلی آ رہی  
 ہو اور ابھی افادہ نہ ہوا ہو)

جبر نے کہا ۛ  
 إِنَّ الْعَيُّونَ الَّتِي فِى ظَرْفِهَا حَوْرٌ قَتَلَتْكُمْ لَمْ يُحْيِيَنَّ قَتَلَاتِنَا  
 يَحْمَرُّنَّ ذَا اللَّبِّ حَتَّى لَا حَرَكَاتٍ بِهِ وَهِنَّ أَضْعَفُ خَلْقِ اللَّهِ إِنْسَانًا  
 (اِن فوہ صورت آنکھوں نے جن کی سیاہی گہری سیاہ اور سفیدی خالص سفید ہے نہایت بے دردی  
 سے ہمیں مار ڈالا اور پھر مقتولین کو زندہ بھی نہ کیا۔ یہ اچھے بھلے خرد مند کو اس طرح کچھاڑ دیتی ہیں کہ  
 وہ بے حس و حرکت ہو جاتا ہے حالانکہ تمام مخلوقات میں یہی سب سے زیادہ کمزور اور نازک ہیں۔)  
 بعض عرب شعراء نے ایک حسینہ کی آنکھوں کو نیل گائے کی آنکھوں سے تشبیہ دی ہے اور انہیں خمارِ  
 آلود کہا ہے۔ مسلم بن ولید الانصاری ۛ

مَا كُنْتُ أَحْسَبُ حَمْرَ الْيَسِّ مِنْ عَيْنٍ \* حَتَّى سَقَيْنِيَهُ صِرْفًا أَعْيُنُ الْبَقْرِ  
 (میرا خیال تھا کہ کوئی شراب ایسی نہیں ہوتی جو انگوروں سے نہ نکلتی ہو یہاں تک کہ اس نیل گائے  
 کی آنکھوں سے میں نے مئے ناب نوش کی)  
 شاعرانہ تواتر و ملاحظہ ہو عراقی کہتا ہے ۛ

غنتین بادہ کاغذ جامِ گردند ز چشمِ مستِ ساقی دامِ گردند

ہسپانیہ کی عورتیں آنکھوں میں آنکھوں میں معاملہ کرنے میں شہرہ آفاق ہیں۔ ہندو آنکھوں کو کنول سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اجنباء کی تصاویر میں عورتوں کی نیم خوابیدہ آنکھیں دیکھ کر ذہن بلاشبہ کنول کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ شیکسپیر خوبصورت آنکھوں کے تاثر کا ذکر کرتے ہوئے ایک سائنٹ میں کہتا ہے۔

”میں نے علم تیری آنکھوں سے حاصل کیا ہے۔ ان کے مشاہدے سے مجھ پر حقیقت منکشف ہوئی کہ حُسن اور صداقت تو اُم ہیں۔“

امریکی عورتیں صرف اپنی آنکھوں کی زیبائش پر ہر سال اڑتالیس ملین ڈالر خرچ کرتی ہیں۔ لب و دہن کی خوبصورتی بھی دلوں کو موہ لیتی ہے۔ عورت کے سُرخ ہونٹوں میں مسرد کے لئے بے پناہ کشش ہوتی ہے۔ لیونٹا سٹائے نے ایام پیری کے روزنامے میں لکھا ہے کہ میری بیوی سونیا کے سُرخ ہونٹ میرے لئے بلائے بے درماں بن گئے تھے۔ اُن پر نگاہ پڑتے ہی میں سپر انداختہ ہو جاتا تھا اور اس کی جنسی کشش مجھ پر غالب آ جاتی تھی۔ عرب لب و دہن کی شیرینی کو شہد اور شراب سے تشبیہ دیتے ہیں۔ الف لیلہ و لیلہ میں لکھا ہے۔

”اُس کی سانس خالص مُشک سے زیادہ خوشبودار ہے۔ اُس کا لعاب دہن شراب سے زیادہ مزے دار اور تریاق سے زیادہ مفید ہے۔“

عمر بن ابی ربیعہ

حَوْرَاءُ آيَتْهُ مُقَبِّلُهَا عَذْبُ كَانَ مَزَاقُهُ خَمْرًا

(سیاہ چشم، منسار جس کا دہن شیریں ہے اور اُس کا مزہ شراب جیسا ہے۔)  
اُس کا شعر ہے

يُزِدُنِي بِهِ الظَّمَانُ حِينَ يَشْوِفُهُ لَذَا الْمُقَبَّلِ بَارِدًا خَمْرًا

(دہن ایسا کہ اُسے دیکھتے ہی ایک پیاسا سیراب ہو جائے، لذیذ ہونٹوں والا، ٹھنڈا شراب کی مستی لئے ہوئے۔)

ابن الرومی ایک کنیز دریرہ کی تعریف میں کہتا ہے

”اُس کے مئے گول ہونٹوں میں آبِ حیات ہے

اُس کی سانس گویا معطر بادِ شمال ہے جو چمنستانوں سے آرہی ہے۔“

دہن کی خوشبو کا ذکر پہلے پہل ابرو و القیس نے کیا تھا

”جب اُس نے پہلے پہل مجھے اپنے حُسن کا دیوانہ بنایا وہ چمک دار موتیوں کے

سے دانت اور لعل لبِ جن کا بوسہ شہد سے زیادہ لذیذ تھا اِس قسم کی خوشبو

اُس کے مُنہ سے آتی تھی گویا کسی تاجر نے قیمتی عطر دان کھول دیا ہو۔“

کالی داس شگفتا میں ہونٹوں کے کس کا ذکر کرتا ہے

”دشمنت (شگفتا سے) جس طرح بھونرا گل تازہ کا مدھو گھونٹ گھونٹ کر پیتا ہے

ایسی طرح تیرے اچھوتے ہونٹوں کا رس ہولے ہولے پی لوں تو چھوڑ دوں گا۔“

دانت ہموار اور چمکتے ہوئے سفید ہوں تو مسکراہٹ سے لب و دہن کی کشش میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے

”الوپ دنی ہستی تو شاخ پھولوں سے بھر جاتی“ لے

لیوناسٹائے نے تو مسکراہٹ ہی کو حُسن و جمال کا واحد معیار قرار دیا ہے کہتا ہے۔ لے

”میرے خیال میں حُسن صرف مسکراہٹ میں ہوتا ہے اگر مسکراہٹ سے چہرے

کی کشش میں اضافہ ہو جائے تو وہ چہرہ حسین ہے اگر مسکراہٹ میں چہرہ ویلے

کا ویسا ہی رہے تو وہ عام سا چہرہ ہے اور اگر مسکراہٹ سے چہرہ بد نما ہو جائے

تو وہ چہرہ بد صورت ہے۔“

ایرانی غنچہ دہن اور پستہ دہن پر فدا ہیں۔ عرب چھوٹے دہن کو انگشتی سے تشبیہ دیتے ہیں۔

اہل مغرب فراخ دہن کو پسند کرتے ہیں۔ دہن چھوٹا ہو یا بڑا بھرے بھرے سُرخ ہونٹ بہر حال

بعضی ترغیب کو ہوا دیتے ہیں اور بوس و کنار کی دعوت دیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ مردوں

کو نبھانے کے لئے عورتیں قدیم زمانے سے اپنے ہونٹوں پر لالی جاتی رہی ہیں۔ لب و دہن کی خوبصورتی کے ساتھ آواز کا سُر ملاپ بھی لازم ہے۔ ایک عورت خواہ کتنی ہی حسین و جمیل ہو اُس کی آواز کرخت ہوگی اور لب و لہجہ درشت ہوگا تو اُس کی کشش جہاں ختم ہو جائے گی۔ کوئی پنجم شاہِ فرانس کی محبوبہ مادام پوپیدو کی آواز اتنی سُریلی تھی کہ اُس کی باتیں سُن کر مرد مست و بے خود ہو جاتے تھے۔ کلیوپیٹرا کی بے پناہ کشش کا راز اُس کے حسین لب و دہن اور جادو بھری آواز میں تھا وہ بات کرتی تو یوں لگتا جیسے کسی سُر کے ہوئے ساز کے تار بھنجھنا رہے ہیں۔ ہندو کہتے ہیں کہ پدمی کی آواز کوئل کی سی ہوتی ہے۔

جنسی کشش کے پہلو سے چھاتیوں اور سُر نیوں کے اُبھار نہایت دلاویز ہیں۔ زمانہ ماقبل تاریخ کے چند نسوانی مجسمے دستیاب ہوئے جنہیں دینس کہا جاتا ہے۔ یہ مجسمے بڈی، پتھر اور ہاتھی دانت سے تراشے گئے ہیں۔ ان میں عورت کے پستانوں اور سُر نیوں کا غیر معمولی اُبھار دکھایا گیا ہے۔ یہ مجسمے مادری نظامِ معاشرہ سے یادگار ہیں۔ ان کے مشاہدے سے مفہوم ہوتا ہے کہ قدیم ترین زمانوں میں بھی عورت کی چھاتیوں اور سُر نیوں کا غیر معمولی اُبھار جنسی کشش کا موجب تھا۔ قدمائے یونان خربہ سُر نیوں کے شیدائی تھے جن کی دیری افزو اتنی کے ایک مجسمے میں اُس کے سُر نیوں کو برہنہ دکھایا جاتا تھا۔ جرمن زبان میں سُر نیوں کو پچھے کے رخسار کہا جاتا ہے افریقی اور عرب بوجھل سُر نیوں کے خبطی ہیں۔ بصفت یہ ہے کہ جہاں تک چھاتیوں اور سُر نیوں کے غیر معمولی اُبھار کا تعلق ہے تمام مردان کے خبطی ہوتے ہیں۔ ایک پُر شباب گد بدی عورت سامنے آ جائے تو مردوں کی نگاہیں اُس کی اُبھرتی ہوئی چھاتیوں پر جم کر رہ جاتی ہیں اور وہ پیٹھ پھر کر گزرے تو اُس کے بھرے بھرے کولہوں کا متوجہ جذب توجہ کا باعث ہوتا ہے چنانچہ جنسی خطیوں میں چھاتیوں اور سُر نیوں کے خطیوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ عرب اور حبشی من حیث القوم

لے سُر نیوں کے غیر معمولی اُبھار کو اصطلاح میں STEATOPYGY کہتے ہیں۔

لے اے KALLIPYGOS کہتے تھے۔ HINTERBACKEN ۷۷

بوجھل سُرنیوں کے شیدائی ہیں۔ افریقہ میں ہر کہیں موٹی تازی عورت کو خوبصورت سمجھا جاتا ہے کیوں کہ حبشیوں کے یہاں حُسن اور فریبی لازم و ملزوم ہیں۔ ریچرڈ برٹن لکھتا ہے کہ صومالیہ کا مرد عورتوں کو قطار میں کھڑا کر دیتا ہے جس عورت کے کوئلے سب سے زیادہ بوجھل ہوں اُس سے بیاہ کر لیتا ہے۔ منگو پارک نے لکھا ہے کہ نائیجیریا میں فریب اندام عورت کو پسند کرتے ہیں۔ وہاں کی بعض عورتیں اس قدر موٹی ہوتی ہیں کہ جب تک دونوں جانب سے عورتیں سہارا نہ دیں وہ چل پھر نہیں سکتیں۔ اینڈریو سمتھ کے بقول افریقہ میں بھاری بھر کم سُرین کو حُسن نسوانی کی سب سے بڑی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اُس نے ایک افریقی عورت کو دیکھا جس کے کوئلے اس قدر بوجھل تھے کہ وہ آسانی سے اٹھ کر کھڑی نہیں ہو سکتی تھی۔ عرب بھی فریب اندام عورت پر جان چھڑکتے ہیں۔ یوحنا امام مالک میں ”ہیت نے کہا تم غیلان کی بیٹی کو ضرور لینا۔ جب وہ سامنے آتی ہے تو اُس کے پیٹ پر چار بیٹیں معلوم ہوتی ہیں اور جب پیٹھ پھیر کر جاتی ہے تو چار کی آٹھ بیٹیں معلوم ہوتی ہیں۔“

عرب عورتیں اپنے کو لہوں کے اُبھار کو نمایاں کرنے کے لئے اُن پر گد بانڈھتی رہی ہیں جسے عربی میں زنجبہ کہتے ہیں۔ عربوں نے بوجھل اور متلاطم کو لہوں کو ذکر نہایت ذوق و شوق سے کیا ہے۔

عمر بن ابی ربیعہ

مَذْحِجَةُ الرِّدْفَيْنِ بِمُكْنَةٍ رُوْدُ الشَّابِّ كَأَنَّهَا قَصْرٌ  
وَسَوْ قَصْرُهَا عَجِزَتْهَا مَمْشَى الضَّعِيفِ يَوْمَ دُؤَالِ الْبَهْرِ  
وہ موجوں کی طرح متلاطم کو لہوں والی، تر و تازہ، پُر شباب، اپنے بھرے بھرے جسم کے ساتھ جیسے ایک قصر اور جب وہ ہمت کر کے اٹھتی ہے تو اُس کے سُرین کا بوجھل اُسے نیچے کھینچتا ہے اور چال اُس کی یوں ہے جیسے کوئی کمزور، تھکا ماندا۔

عرب شاعروں نے بھاری بھر کم کو لہوں کو ریت کے تودوں سے تشبیہ دی ہے۔ مسلم بن الولید الانصاری

كُتِبَانُ رَمَلٍ إِذَا رَجَعَتْ أَسَافِلُهَا مَا لَتْ بِأَنْمَارِهَا مِنْ قَوْحِهَا الْهَضْبُ

(جب اُس کے نچلے حصے (کوہے) تھرتھکتے ہیں تو یوں لگتے ہیں جیسے ریت کے ٹیلے اور اُن کے اوپر  
پلک دار شاخیں (بازو)۔)

ابن حزم قوطاجنی قصیدہ معصورہ میں کہتا ہے۔

”اگر اُس کے صُغ کی شرح جسم کے بالائی حصے سے زیریں حصے کی جانب کی جائے  
تو وہ ایک چاند ہے جو ریت کے تودے پر چمک رہا ہے۔ اگر زیریں حصے سے بالائی  
حصے کی جانب اُس کے صُغ کی شرح کر دو تو وہ ریت کا تودا ہے جس پر ایک شاخ  
اوپر کی طرف نکلتی ہے جس کے اوپر چاند چمک رہا ہو۔“

افریقائی اور عرب ناپچنے والیاں بڑے نفس پرور انداز میں سرخیوں کو حرکت دیتی ہیں۔ سیلی ڈانگ  
عرب ممالک کا مقبول ترین رقص ہے اس میں ناپچنے والیاں اس تیزی سے اپنے کو لہے پھر کاتی  
ہیں کہ دیکھنے والے مست و مدہوش ہو جاتے ہیں۔ ہسپانیہ کے فان دانگو ناچ میں عربی رقص  
کی یہ روایت باقی و برقرار ہے۔ قدیم چین میں لڑکیوں کے پاؤں کس کس پر باندھ دیے جاتے تھے۔  
پاؤں چھوٹے رکھنے کا مقصد یہ تھا کہ جب عورت چلتی تو اُس کے کوہوں میں ہوس پرور جنبش  
ہوتی تھی۔ اونچی ایڑی کا بوتا پسنے میں بھی یہی مصمت ہے کہ اس سے چلتے وقت سرخیوں میں  
پرخشش حرکت ہوتی ہے۔ عورتیں جانتی ہیں کہ اُن کے سرخیوں میں مردوں کے لئے بڑی جاذبیت  
ہوتی ہے اس لئے وہ انہیں شکا شکا کر راستہ چلتی ہیں۔ اناطولیہ فرانس نے کہا ”عورتوں کے سرخیوں  
سے زیادہ دنیا کی کوئی بھی چیز خوبصورت نہیں ہے“ ایک عرب شاعر نے سینے اور سرین کے ابھار پر  
بے مثل شعر کہا ہے۔

أَبَتِ التَّدَادِفُ وَالْمُؤَدُّ لِقَمِيصِهَا مِنْ أَنْ تَمْسَسَ بَطْنُهَا وَظَهْرُهَا

(اُس کے سرین اور چھاتیاں اُس کی قمیض کو اُس کے پیٹ اور پیٹھ کو چھونے سے روکتی ہیں۔)

قدیم کریٹ، ہند، احياء العلوم اور سترھویں صدی کے فرانس اور اطالیہ میں عورتیں اپنی  
چھاتیاں برہنہ رکھتی تھیں اور اُن پر غازہ لگاتی تھیں۔ فرانس کا انشائیہ نگار مان تین کہتا ہے ”ہماری

عورتوں کی چھتیاں بسا اوقات ناف تک بالکل برہنہ ہوتی ہیں۔ " رومر کی ملکہ میسیالینا اپنی چھاتیوں پر سنہرا رنگ لگایا کرتی تھی۔ خوش وضع اور سڈول چھاتیوں کی کشش سے کوئی بھی مرد محفوظ نہیں۔ ول ڈیوائس لکھتا ہے کہ چوتھی صدی قبل مسیح میں ایتھنز کی ایک بیسوا فرنی حُسن و جمال میں یکتائے روزگار تھی۔ مشہور سنگ تراش پراکسی طیلِس نے حُسن و عشق کی دیوی افروڈائی کے مجسمے فرنی کی دلاویز جسمانی زالیوں پر تراشے تھے۔ فرنی ایوینیو جشن پر برسرِ عام بال کھول دیتی اور مادر زاد برہنہ سمندر میں نہایا کرتی تھی۔ ایک دفعہ ایک شہری نے فرنی پر معصیت پھیلانے کا الزام لگایا اور اُس کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ فرنی کے وکیل ہائپرڈیس نے اُس کے دفاع میں تقریر کرتے ہوئے فرنی کے سینے پر سے کپڑا ہٹا کر منصف صاحبان سے کہا: "حضرات! ایک نظر ادھر دیکھئے۔ کیا یہ حُسن معصیت پرور ہو سکتا ہے؟" منصف صاحبان نے فرنی کی حسین چھاتیوں کو غور سے دیکھا اور یہ دلیل تسلیم کرتے ہوئے اُسے بری کر دیا۔ یونان قدیم کی ایک روایت ہے کہ پہلا طلائی پیالہ ہیلن کی چھاتیوں پر ڈھالا گیا تھا۔ ہیلن کے حُسن و جمال کی شہرت میں اُس کی سڈول چھاتیوں کو بھی دخل تھا۔ ٹرائے کی تسخیر پر اس کے شوہر مینی لاس نے قسم کھائی کہ وہ بے وفائیلین کو دیکھتے ہی موت کے گھاٹ اتار دے گا۔ ہیلن سامنے آئی تو وہ غضبناک تلوار سونٹ کر بھڑکا۔ ہیلن نے اپنا سینہ کھول دیا۔ مینی لاس اُس کی خوش وضع چھاتیوں کے نظارے سے بھجک رہ گیا، تلوار ہاتھ سے پھینک دی اور اُسے گلے سے لگایا۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ حسین عورتوں کو اپنی قوت کا احساس ہوتا ہے اور اپنے حُسن و جمال سے جب تک چاہتی ہیں مردوں کو گدھا بناتی رہتی ہیں۔ یونانی خوبصورت چھاتیوں کو سبب سے تشبہہ دیتے تھے، ایرانی انارستان کہتے ہیں۔ وارث شاہ نے انہیں سبب اور لیشم کی گیندیں کہا ہے۔ ہیر کا سراپا بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

چھاتی ٹھاٹھ دی ابھری پٹ کھینوں سبب بلخ دے چترے انہار وچوں  
 برخواستار صاحبان کے حُسن کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے۔

ادھے سینے اُتے دو ڈیال عاشق مست کریں۔ اُپر بھوپھن کڈھواں بیچ تیر چوگ چلن  
 ایک پر شباب عورت کی چھاتیوں کا اُبھار دوپٹے میں بھی نمایاں ہوتا ہے۔ اُس کے چھنے سے چھاتیوں  
 میں جھنک ہوتی ہے۔ بنو خرداد کہتا ہے کہ دوپٹے کے نیچے متھوگ چھاتیاں دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے  
 تیر چوگ چلگ رہے ہیں۔ زولائٹا کے حُن کے بارے میں کہتا ہے ”اُس کی سنہری چھاتیاں یوں  
 دمک رہی تھیں جیسے شمع کی روشنی میں ریشم بھلا رہا ہو۔“ فلاسٹر نے اپنے ایک نسوانی کردار کا ذکر  
 کرتے ہوئے کہا ”اُس کی چھاتیاں اس قدر خوش وضع ہیں کہ اُن پر سر رکھ کر مر جانے کو بھی چاہتا ہے  
 مسلم بن ولید الانصاری کہتا ہے۔

نَدَّعَ الشَّبَابُ لَهْوَةً دُمَانَ الْقَتَبَا فِي الْخَمْرِ قَدْ تَرَبَّتْ بِالنَّوَابِ  
 (شباب نے اُن کے سینوں میں خُب و شوق کے انار اُگائے ہوئے تھے اور یہ اُبھار اُن کی چھاتیوں کی زینت)  
 قدما نے حُسن عورتوں کے بدن کی خوشبو کا ذکر کیا ہے۔ ہندو کہتے ہیں کہ پدمنی کے بدن سے ستوری  
 کی خوشبو آتی ہے۔ چینیوں نے اسے سنگ مرمر کی خوشبو کہا ہے۔ یہ خوشبو مردوں کے لئے بڑی کش  
 ہوتی ہے۔ بعض جوان مردوں کے جسم سے بھی خوشبو آتی ہے جو عورتوں کو حفا بختی ہے۔ بقول  
 پلوٹارک سکندر اعظم کے پسینے سے مُشک کی مہک اُٹھتی رہتی تھی جس سے اُس کے کپڑے مُعطر  
 ہو جاتے تھے۔ فادوسٹ میں عورتوں نے نوجوانوں کے بدن کی دلاویز خوشبو کا ذکر کیا ہے۔  
 عرب کے مشہور شاعر اور عشق باز امرؤ القیس نے بھی عورتوں کی بدن کی خوشبو کا ذکر کیا ہے۔ کہتا ہے۔  
 ”جب وہ دونوں نانینیں کھڑی ہوئی تھیں تو اُن میں سے ایسی خوشبو آرہی تھی  
 گویا بادِ صبا لونگ کے درختوں میں سے گزر کر آرہی ہے۔“  
 ایک عرب شاعر کہتا ہے۔

إِنَّ الْيَسَاءَ رِيَا حَيْنَ مَخْلَعَنَ لَكُمْ وَكُلُّكُمْ يَشْتَهِي شَمَّ الرِّيَا حَيْنِ  
 (عورتیں گلدستے کی مانند ہیں اور تمہارے لئے ہی پیدا کی گئی ہیں اور عالم یہ ہے کہ تم سے ہر شخص گلدستے کو بوگھٹا

پاتا ہے۔)

خوشبو کا جنسی جذبے کے سیمان سے گہرا تعلق ہے۔ اس لئے خوش فطرت عورتیں اپنے سینے، بطنوں،  
اور کنچ ران کو عطریات میں لسا لیتی ہیں۔ الف لیلہ ولیدہ میں قمر کہتی ہے۔

”میں لطیف عطریات سے اپنے سینے، شکم اور بدن کے دوسرے حصوں کو لسانوں  
کی تاکہ میرا بدن شیرینی کی طرح تیرے منہ میں گھل جائے۔“

خوشبو کا اثر عورت پر گہرا ہوتا ہے۔ مانٹا گیزا لکھتا ہے کہ مجھے ایک خاتون نے بتایا کہ میں پھولوں کی  
خوشبو سے اس قدر لذت محسوس کرتی ہوں کہ مجھے لگتا ہے جیسے میں کوئی گناہ کر رہی ہوں۔

ایرانی پھولوں کے شیدائی ہیں اور خوشبو کے اثرات سے بخوبی واقف ہیں۔ طالب آملی ہے  
بتن بویا کند گھٹائے تصویر نہالی را  
بیا بیدار سازد و خفتگان نقش قالی را  
ایک شاعر کہتا ہے۔

ازیں دیار گذشتی و ساہا بگذشت  
ہنوز بوئے تومی آید از منازل ما  
نسوانی حسن و جمال کے مشہور مبصر کسانو نے کسی حسینہ کی مندرجہ ذیل صفات گنائی ہیں۔

”جلد اطلس کی طرح نرم اور چمکتی ہوئی سفید جو گھیری زلفوں کی سیاہی کو اجاگر کر دے،

چہرے کے نقوش موزوں، رخساروں پر سوسن اور گلاب کھلے ہوئے، چھتیاں سڈھل،

ہاتھ سپید اور گداز، چمکتی ہوئی آنکھوں میں دلربا خشکی کی جھلک، ابرو و محرابی، دہن

خنچنے کی مانند، دانت ہموار اور موتیوں کی طرح سپید، ہونٹ گلابی، پاؤں ننھے منے۔“

کسانو کشیدہ قامت حسینہ کو پسند کرتا ہے البتہ یہ کہتا ہے کہ ایک کشیدہ قامت حسینہ کے ہاتھ پاؤں چھوٹے

چھوٹے گداز ہونا ضروری ہیں جس کشیدہ قامت عورت کے ہاتھ پاؤں بڑے بڑے اور کرخت ہوں

گے اُس میں مردانگی کا عنصر ہوگا اور اُس کے جسم کے زاویوں میں گولائی اور گداز خشکی نہیں ہوگی۔ وہ کہتا

ہے کہ حسینوں کی روح بھی حسین ہوتی ہے۔ عربوں کے خیال میں حسین لوگ فیاض ہوتے ہیں۔

## اَطْلُبُوا الْحَاجَاتِ بِعِنْدَ حِسَانِ الْوُجُوهِ -

(اپنی حاجات خوبصورت لوگوں سے طلب کرو)

مالک انجو کہتا ہے ”باعدت عورت کا چہرہ ہمارے عادت کے چہرے سے زیادہ شگفتہ و شاداب ہوتا ہے۔“ حافظ شیرازی کے خیال میں عشق محض خود خال سے نہیں بلکہ ”لطیف نہانی“ سے پیدا ہوتا ہے جو کسی عورت کے ناز و ادا اور کشش جہاں پرستل ہوتا ہے۔ ایسی عورتیں جن کے خود خال سے تعلیق نہ ہوں لطیف نہانی کے طغیوں مرکز تو جہن جاتی ہیں۔ عرفی نے کہا ہے کہ ناز و ادا کے بغیر ایک حسین عورت پتھر کی مورتی بن کر رہ جاتی ہے۔

زُبت زگوشتہ چشتہ نہ چین ابروئے بھر تم کہ دل برہمن ز کف چوں شد  
فارسی والے حسین عورت کو نگار بابت کہتے ہیں کیوں کہ وہ تراشی ہوئی مورتی کی طرح متناسب الاعضاء ہوتی ہے۔ اہل مغرب جہانی شاریات میں ۳۶—۲۴—۳۶ کو مثالی سمجھتے ہیں۔  
جدید دور میں حسن نسوانی کا کلاسیکی معیار بدل گیا ہے۔ فی زمانہ چہرے کے نقوش کی بہ نسبت متناسب اعضا، بدن کی گڈرابٹ، رنگ روپ کی فطرتی تازگی اور جنسی کشش کو اہم خیال کیا جاتا ہے۔ جب عورتیں حرم سراؤں اور گھروں کی پار دیواروں میں محصور تھیں اُس وقت چہرے کا حسن زیادہ اہم تھا اور افسانوی عشاق کسی حینہ کے چہرے کی ایک جھلک دیکھ کر عشق کر جایا کرتے تھے۔ اب عورت آزاد ہے اور روایتی پابندیوں کو خیر باد کہہ رہی ہے۔ اُس نے ایسا لباس پہنا شروع کر دیا ہے جو تن کو ڈھانپتا کم ہے اور بدن کی گڈرابٹ اور اعضا کی گڈاٹنگ کو نمایاں زیادہ کرتا ہے۔ کسی عورت کے چہرے کے نقوش خواہ معمولی ہوں متناسب اعضا اور جوہن کے نکھار کے باعث اُسے حسن و جہاں کا پیکر سمجھا جاتا ہے۔ اب یہ حقیقت تسلیم کر لی گئی ہے کہ ہر صحت مند پُر شباب عورت خوبصورت ہوتی ہے خواہ اُس کے چہرے کے نقوش کیسے بھی ہوں۔ بعض نوجوان صحت مند لڑکیاں جن کے بدن سانچے میں ڈھلے ہوئے خوش وضع ہوتے ہیں محض اِس لئے احساس کبہر می میں مبتلا ہو لے۔ انگریزی میں متناسب نسوانی پیکر کو SANDGLASS FIGURE کہتے ہیں۔

جاتی ہیں کہ ان کی آنکھیں پھوٹی ہیں، پیشانی تنگ ہے، دہن فراخ ہے یا رنگ سافلا ہے۔  
یہ ان کی بھول ہے۔ آج کل چہرے کے نقوش سے زیادہ عورت کے پرشاد جسم کو پرکشش سمجھا  
جاتا ہے۔ دینتی نے کہا تھا:

”چڑھتے جو بن نے مجھے یوں گھیر لیا جیسے باغ مالی کو گھیر لیتا ہے۔“  
ہیر نے کہا تھا

”میرا جو بن پھلک پھلک کر راستوں میں گرا پڑتا ہے۔“

آج کل اسی چڑھتے اور پھلکتے ہوئے جو بن کو حسن سمجھا جاتا ہے۔

نسوانی حسن میں غراہت کا عنصر بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اپنے ملک و قوم کی بہ نسبت  
دوسری اقوام کی عورتوں میں اک گونہ زیادہ کشش نامعلوم ہوتی ہے۔ اسی کے تحت اہل مغرب  
ایشیائی عورتوں میں زیادہ جنسی کشش محسوس کرتے ہیں اور ایشیائی مغربی عورتوں کو حسن  
و جمال کا پیکر سمجھتے ہیں۔

## حدیثِ عشق

عشق کے دو پہلو ہیں۔ اُن عشقِ حقیقی جسے اہل مغرب عشقِ روحانی کہتے ہیں۔۔۔ اُن عشقِ مجازی صوفیہ عشقِ حقیقی کے مدعی ہیں اور محبوبِ ازل سے اظہارِ محبت کرتے ہیں عشقِ مجازی کے دو معروف پہلو ہیں۔ اُن روحانی عشق۔ اُن ہم جنسی عشق۔

عشقِ حقیقی کا تصور بنیادی پر فو اشراقی ہے۔ سکندریہ کے ایک عارف فلاطون نے افلاطون کے اشراقی افکار کی نئے سرے سے ترجمانی کی تھی۔ افلاطون نے کہا تھا کہ کائنات کی جملہ اشیاء حسنِ ازل کی جانب کشش محسوس کرتی ہیں۔ اسی کشش کو اُس نے عشق کا نام دیا۔ افلاطون کے نظریہ عشق سے بحث کرتے ہوئے فلاطینوس نے کہا کہ انسانی رُوح عالمِ ہست و بود میں آکر مادے کی اسیر ہو گئی ہے اور اپنے مبداء کے فراق میں تڑپتی رہتی ہے۔ تجرد اور ریاضت کی زندگی گزارنے سے رُوح مادے کی قید سے آزاد ہو جاتی ہے اور دوبارہ ذاتِ حقیقی میں جذب ہو جاتی ہے عشق کا یہ تصور فلاسفہ اسلام میں بڑا مقبول ہوا اور اُن کے واسطے سے صوفیہ تک پہنچا۔ فارابی کا قول ہے ”خدا خود عشق ہے اور تخلیق و تکوین کا اصل سبب بھی عشق ہی ہے۔“

سنائی، عطار، رومی، جامی اور حافظ شیرازی نے ولولہ انگیز پیرائے میں اسی عشق کی گونا گوں کیفیات کو نظم کیا تھا۔ ہندو ویدانتی برہمن آتما ایکتا کے قائل ہیں۔ اُن کے خیال میں آتما ملا کے جال سے آزاد ہو جائے تو وہ دوبارہ برہمن میں جذب ہو جاتی ہے۔ جگت شاعر داس رادھا (آتما) اور کرشن برہمن کے حوالے سے اس نظریے کی ترجمانی کی ہے۔ گووند، میراں، سور داس وغیرہ کی شاعری میں رادھا کرشن سے والہانہ اظہارِ محبت کرتی ہے اور اُس سے دال کی خواہاں ہوتی ہے۔ المانوی اشراق میں نو فلاطونی نقطہ نظر کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔

جرمن شاعر ریکے جو اپنے ہم قوم مائسٹر الہارٹ کے عرفانی افکار سے متاثر ہوا تھا اپنی ایک نظم میں لکھا ہے  
 ”خدا یا! میری موت کے بعد تو کیا کرے گا؟“

میں وہ سانچا ہوں جس میں تو موجود ہے، اس کے ٹوٹ جانے کے بعد تیرا کیا بنے گا؟

میں وہ مئے ہوں جسے تو پیتا ہے، اس کے سڑ جانے کے بعد تیرا کیا ہوگا؟  
 میں تیرا لباس ہوں، تیرا شغل ہوں، تجھے کھوکھلی تیری اپنی ذات بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔“  
 تخیل انسانی کی رُو سے عشق لازماً جنسی ہوتا ہے۔ عشق رُوحانی یا عشق حقیقی بھی اسی کی ایک صورت ہے کہ مثنوی عشق حقیقی کا اظہار ہمیشہ مجاز ہی کے پیرائے میں کرتے رہے ہیں حافظ شیرازی کی غزلیات، میراں کے بھجنوں، ولیہ تریا کے مراقبات اور مثنوی کی مثنوی میں اظہار عشق کے لئے جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ خالصتاً مجاز کی زبان ہے۔ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے محبوب کی آواز سنے، اسے دیکھے، اسے چھوئے اور گلے سے لگائے۔ غالب ؎

تکلف برطرف لبِ شبنم بوس و کنار ترم      ذرا ہم باز چیں دامِ نوازش ہائے پنہاں را  
 یہی وجہ ہے کہ ایک ذات مجرد و بسیط و یحیون و یحیون سے جو شعور و ادراک کی گرفت سے آزاد ہو عشق کرنا محال ہے اس لئے انسان حقیقت کو لباس مجاز میں دیکھنے کا متمنی ہوتا ہے اس لئے محبوب حقیقی کا تصور بھی مجاز کے پیرائے میں کرتا ہے تاکہ وہ اُس سے عشق کر سکے۔

رومانی عشق کا تصور تحریک جو انرٹی کے ساتھ وابستہ ہے جس کا آغاز عرب سے ہوا تھا اور جو فلسطین، صقلیہ اور ہسپانیہ سے مغربی ممالک میں پھیلی تھی۔ اس تحریک کے آداب تھے شجاعت، حماست، مروت، مہمان نوازی اور عورتوں کی حفاظت۔ مورخین اس کا آغاز عنبر بن الشداد سے کرتے ہیں جس نے عورتوں کی حفاظت کرتے ہوئے جان دی تھی اور جو جاملی دور کا مشہور جوانمرد اور شاعر تھا۔

لے عربی میں اسے فتوت یا فرویت کہتے ہیں۔ فرانسیسی میں شوہر کا معنی ہے شہسوار اور لفظ شوہری فرویت (شہسواری) کا لغوی ترجمہ ہے۔

عہد جاہلیت کی عورتیں اس قسم کے مضمون کے اشعار پڑھ پڑھ کر میدان جنگ میں اپنے مردوں کی ہمت بندھاتی تھیں۔

”ہمت! ہمت!! اسے عورتوں کے محافطوں! ہمت سے کام لو۔ اپنی تلواروں کی دھار سے دشمن کو کاٹ ڈالو، ہم طارق (ستارہ سحر) کی بیٹیاں ہیں جن غایلوں پر ہمارے پاؤں پڑتے ہیں وہ نرم ہیں ہمارے گلوں میں موتیوں کے ہار ہیں۔ ہماری زلفیں غنبریں ہیں جو ہمارے دشمن سے لڑیں گے ہم انہیں گلے لگائیں گی لیکن جو بزدل ہو کر بھاگ نکلیں گے ہم انہیں ٹھکرا دیں گی اور ہماری باہیں اُن کے گلے میں بڑھیں گی۔“

اشاعت اسلام کے بعد جناب امیر المومنین علی بن ابی طالب فتوت کے مثالی نمونے بن گئے۔ شامی لشکریوں نے عورتوں پر دست باندی دراز کیا تو آپ نے فرمایا۔

مجھے تو یہاں تک خبر ملی ہے کہ اس شکر کا ایک آدمی مسلمان عورت کے گھر میں اور دوسرا ذمی عورت کے یہاں گھس جاتا تھا اور اُس کے خنجر، دست بند، بندے، گوشوارے چھین لیتا تھا..... یہ واقعہ سن کر اگر کوئی مرد مسلمان غم سے ہلاک ہو جائے تو اس پر تعجب نہیں کیا جاسکتا۔“

دُنیاۓ اسلام میں الناصر عجائبی، صلاح الدین ایوبی اور سلطان رکن الدین میرک بدوق باری، جو انفرادی کی درخشاں روایات کے پاسبان تھے۔ مرورِ زمانہ سے تحریک جو انفرادی سے مسلکِ نسائیت نے جنم لیا یعنی عشق میں عورت کی پرستش مشمول ہوئی عشاق اپنی محبوبہ کی ادنیٰ سی خواہش کی تکمیل کو بھی فرض عین سمجھتے تھے اور اُس کے دیئے ہوئے رُومال کا پھریرا اپنے نیزے کے سرے پر لہرا کر اکھاڑوں میں اُترتے تھے۔ اس مسلک میں عورت کو ایک مافوق الطبع مخلوق تسلیم کیا جاتا تھا اور نہایت پرجوش انداز میں اُس سے اظہارِ عشق کرتے تھے۔ محبوبہ بنتی عالیٰ نژاد ہوتی تھی اتنی ہی شیفتگی سے اُس

لے تاریخ اندلس ڈوزی ترجمہ عنایت اللہ دہلوی لے بیج البلاغہ ترجمہ رئیس احمد جعفری

کے سن و جمال کے گیت گاتے تھے۔ پاکبازی کے عشق کی روایت بدوؤں کے ایک قبیلے بنو عذرا سے یادگار ہے۔ مسعودی نے بنو عذرا کے بے لوث عشق کو الہوی العذری کہا ہے اور اس قبیلے کے دو عاشق عطرہ اور عروہ کی انساں عشقہ داستان بیان کی ہے جلیل بن معمر العذری اور اس کی محبوبہ شبنم اسی قبیلے کے افراد تھے۔ عذری عورتیں اپنے عشاق سے توقع کرتی تھیں کہ وہ ان کی تعریف میں شعر کہیں تاکہ ان کے سن و جمال کا شہرہ دور دور تک ہو جائے عشق عذری کا یہ تصور بغداد سے ہسپانیہ تک پھیل گیا ہسپانیہ کی شاعری بلکہ تمام رومانی شاعری میں عذری لُغَب العین دکھائی دیتا ہے۔ ابن داود اصفہانی اور ابن فرج جاسٹی عذری اس تصور عشق کے مشہور پاسبان تھے۔ ابن فرج عذری کہتا ہے۔

”اگرچہ وہ سپردگی پر آمادہ تھی لیکن میں نے ضبط سے کام لیا۔ رات کو وہ کھلے منہ آئی۔ رات کے سایوں میں اُس کا چہرہ چمک اٹھا۔ اُس کی ایک ایک نگاہ دل کو بے قرار و بے خود کرنے کے لئے کافی تھی لیکن میں نے ہوس کے منہ زور گھوڑے کو بے قابو نہیں ہونے دیا۔ میں نے رات اُس کے ساتھ گذاری جیسے اونٹنی کا بچہ جس کا منہ رسیوں سے باندھ دیا جائے اور وہ اپنی ماں کے تھن سے دودھ نہ پی سکے۔ میرے جیسے لوگ پھولوں بھرے باغ میں صرف اُن کا نظارہ کرتے ہیں۔ اور خوشبو سونگھنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ میں آوارہ و وحوش سے نہیں ہوں جو اس باغ کو اپنی چراگاہ بنالیتے ہیں۔“

اس کے دوستوں میں بعد مرید کے شاعر صفوان بن ادریس نے کہا۔

”وہ کس قدر حسین ہے۔ سن تو اس کی محض ایک صفت ہے۔ اُس کی حرکات نہایت جادو بھری ہیں۔ وہ چاند کی طرح خوبصورت ہے۔ چاند سے پوچھا جائے تم کیا چاہتے ہو تو وہ جواب دے گا میں اُس کا ہالہ بننا چاہتا ہوں چاند اُس کے چہرے کے سامنے آجائے تو گویا وہ مکس ہے اُس کے چہرے کا جو آئینے میں پڑ رہا ہے۔ رات کے وقت میں اُس سے ملا۔ میرے بچے کے نیچے آگ سلگ رہی

تھی جیسی کہ تمنائے گالوں میں سُلگتی ہے۔ میں نے اُسے گلے لگا کر ہینچا جیسے کہ بچہ اپنے خزانے کو ہینچتا ہے۔ میں نے اُسے بازوؤں میں جکڑ لیا کیوں کہ وہ خال ہے، میں ڈرتا ہوں وہ بھاگ نہ جائے لیکن میری پاکبازی نے مجھے اجازت نہ دی کہ میں اُس کا منہ چوموں اور میرا دل جھڑکتے ہوئے شعلوں میں جلتا رہا اُس شخص کا دھیان کرو جس کا اندرون پیاس کی شدت سے جل رہا ہو لیکن وہ پانی سے اپنا حلق تر نہ کرے۔“

تاریک زمانوں کے دوران میں یورپ میں ایک بھی عشقیہ نظم نہیں کہی گئی کیوں کہ ایک تو عشقیہ شاعری مذہباً ممنوع تھی دوسرے یورپ کی اُجڑ، وحشی اقوام جذباتِ عشق کی لطافت اور حُسنِ نسوانی کی قدر و قیمت سے نا آشنا تھیں چنانچہ ۱۱ویں صدی سے پہلے یورپ میں رومانی عشق کا تصور ناپید تھا۔ اسی دوران میں ہسپانیہ اور صقلیہ کے عرب شاعروں نے بے قیطر عشقیہ نظمیں کہیں جن میں موسیخ اور زجل کے اصناف کو خاص شہرت حاصل ہوئی۔ عرب طراپ کا کرشنر نے والے (عشق ناکام اور حرام نصیبی کے مضامین) دلدوز پیرائے میں گا کر سُنا تے تھے۔ تحریکِ جوانمردی کی اشاعت کے ساتھ یہ روایت فرانس کے ایک صوبے پروونس میں سرسبز ہوئی جو ہسپانیہ کی سرحد پر واقع تھا۔ مغربی اقوام کی عشقیہ شاعری پروونس کی شاعری ہی سے متفرع ہوئی ہے۔ ابنِ قزمان کی کتاب الاغانی میں ایک سو سے زیادہ عشقیہ قصائد ہیں جو عام فہم عربی روزمرے میں لکھے گئے تھے۔ ولیم نیم جو یورپ کی اس دور کی شاعری کا باوا آدم تھا، ابنِ قزمان ہی کا معاصر تھا اور عربی اصنافِ شعر سے متاثر ہوا تھا۔ بعد میں آنے والے شاعر گویوں نے اُس کی تقلید میں رومانی نظمیں لکھیں۔ پروونس کی اس دور کی رومانی شاعری کا خاتمہ ری کوئس پر ہوا یعنی دو سو برس تک (۱۱۰۰ — ۱۳۰۰ م) فرانس کی عشقیہ شاعری پر عربی شاعری کے اثرات ثبت ہوتے رہے۔ پروونس کے شاعروں نے موضوعات

۱۔ انگریزی کا لفظ TROUBADOUR اور فرانسیسی کا لفظ TROVIER لفظ طراپ ہی کی بدلی ہوئی صورتیں ہیں۔ یہ لوگ عشق و محبت اور جنگ و جدال کے گیت سازوں کے ساتھ گا کر سُنا تے تھے۔

کے ساتھ عربی شاعری کے لسانیب بھی اپنالے۔ عربوں نے جنس اور تقدس کے امتزاج سے رومانی شاعری کی بنیاد رکھی تھی۔ اندلس کے شاعروں نے اس روایت کی آبیاری کی اور عشقِ ناکام کی حسرت ناک پر پر جوشِ نقلیں لکھیں لیکن مغرب کی اُمّت اقوام میں جنس اور تقدس کا تعلق برقرار نہ رہ سکا۔ مغربی سُر ماعربوں کی طرح عالی ظرف اور پاک ہیں نہیں تھے اس لئے اُن کے یہاں مسلکِ نسیئت کی پاکیزگی مجروح ہو گئی۔ یہ سُر ما اپنی محبوب خواتین سے متع کرنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے تھے۔ جو سُر ما کسی حینہ کو دشمن کے چٹکل سے پھڑٹا وہ اُس کے ساتھ خلوت میں جانے کا مشتاق سمجھا جاتا تھا۔ گول میز کا ایک سُر ما سر لائیبلاٹ شاہ آرتھر کی ملکہ گینور سے کھلم کھلا معاشرت کرتا تھا۔

صوفیہ کے عشقِ حقیقی کی طرح رومانی عشق بھی جنسی جبلت ہی کی مرقع صورت ہے۔ شیخ اکبر ابن عربی اندلس کے مشہور وجودی صوفی تھے۔ انہوں نے اپنی حسین محبوبہ نظام سے عشق کیا تھا اور اُس کے حسن و جمال کی تعریف و توصیف میں پر جوش قصائد لکھے تھے۔ اُن کا قول ہے ”جس نے عشق کیا اور مرتے دم تک پاک منش رہا وہ شہید کی موت مرا۔“

یاد رہے کہ رومانی عشق ایسے معاشرے میں پنپ سکتا ہے جس میں مردوں عورتوں کو آزادانہ میل ملاپ کے مواقع نہ ملیں۔ اس تفریق سے دونوں ایک دوسرے کی ذات کشش نامعلوم محسوس کرتے ہیں۔ مرد عورت کو کوئی آسمانی منلوق سمجھنے لگتا ہے اور عورت مرد میں بطلِ جمیل کو تلاش کرتی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس معاشرے میں عورتیں مرد بلا تکلف اور بے محابا ایک دوسرے سے ملتی ہیں اُس میں رومانی عشق کا کھوج نہیں ملتا۔ وحشی قبائل میں جن کے ہاں آزادانہ جنسی ملاپ کا رواج ہے، رومانی عشق کا تصور ناپید ہے۔ آسٹریلیا، افریقہ اور جزائرِ مغرب الہند کے وحشی قبائل میں لڑکے لڑکیاں شادی سے پہلے جنسی تعلق قائم کر لیتے ہیں اور محبت کے نام ہی سے نکاح ہوتا ہے۔ جب مشنز یوں نے الگ کون قبیلے کے وحشیوں کی زبان میں بائبل کا ترجمہ کرنا چاہا تو انہیں مقامی بولی میں لفظ عشق کا کوئی مترادف نہ مل سکا۔ مارگریٹ میڈ لکھتی ہیں کہ سوان و وحشیوں کو رومیو جولیٹ کی کہانی سنائی گئی تو وہ مائے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو گئے اور کہنے

لگے ان نادانوں کو خودکشی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ باہم مل کر ہنسی خوشی زندگی گزار سکتے تھے۔ اس سے مفہوم ہوتا ہے کہ رومانی محبت کا آغاز ایسے معاشرے میں ہوا جس میں مردوں اور عورتوں کے مابین شرم و حجاب کی دیواریں حائل کر دی گئی تھیں۔ جدید مغربی معاشرے میں بھی آزادانہ جنسی بلاپ نے رومانی محبت کا خاتمہ کر دیا ہے۔ آج کل کے کسی مغربی نوجوانوں یا لڑکی کے سامنے رومانی عشق کا نام لیا جائے تو ان کے لبوں پر زہر خند چیل جاتا ہے۔

افلاطونی یا ہم جنسی عشق کی روایت یونانی الاصل ہے۔ قدمائے یونان کے یہاں عشق صادق خالصتاً ہم جنسی ہوتا ہے۔ یورپ کے ادباء اور شعراء نے غلطی سے مرد و عورت کے ایسے عشق کو افلاطونی کہنا شروع کیا جس میں عشاق پاک باز ہوں۔ فی الحقیقت افلاطونی عشق سے مراد ہم جنسی محبت تھی جسے اہل یونان مجسمہ محاسن اخلاق کا مصدر سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں نوجوانوں کی مناسب تربیت کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک دوسرے سے عشق کریں کہ اس کے بغیر انسان کردار و شخصیت کی بلندیوں تک پہنچنے سے قاصر رہتا ہے۔ افلاطون سمپوزیم میں کہتا ہے۔

”ایراں (عشق کا دیوتا) کو قدیم ترین دیوتا سمجھا جاتا ہے۔ ہم اس کے فیوض و برکات کے لئے اس کے ممنون احسان ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کسی نوجوان کا اس سے بڑا فائدہ اور کس بات میں ہو سکتا ہے کہ اس سے عشق کیا جائے یا وہ کسی سے عشق کرے جو لوگ شریفانہ زندگی گزارنا چاہتے ہیں ان کی زندگی کی تکمیل نہ دولت سے ہو سکتی ہے نہ اعزاز سے نہ کسی اور شے سے۔ عشق ہی اس مقصد کے حصول میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔“

اسی مکالمے میں عشق کی ماہیت سے بحث کرتے ہوئے افلاطون دیوتیمیک زبان میں کہتا ہے۔

”وہ لوگ جن کی تخلیقی جبلت جسمانی ہوتی ہے عورتوں سے رجوع لاتے ہیں اور ان سے پیار کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ بچے پیدا کر کے وہ اپنے پیچھے غریبانی یادگار چھوڑ جائیں گے لیکن بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی تخلیقی تہمتا روحانی

ہوتی ہے۔ چنانچہ ان کی تحقیقات جسمانی نہیں روحانی ہوتی ہیں کہ رُوح انہیں عالم وجود میں لاتی ہے۔ اگر تم پوچھو کہ وہ تحقیقات کیا ہوتی ہیں تو میں کہوں گی کہ وہ دانش اور نیکی ہیں جن کے خالق شاعر اور دوسرے فن کار ہوتے ہیں۔ دانش

کی اعلیٰ صورت ملکوت اور خاندان کی تنظیم ہے جسے ہم توافق اور عدل کا نام دیتے ہیں۔“

یہ کلمہ قائم کر کے افلاطون کہتا ہے کہ ایک حسین دوست کا عشق روحانی حُسن کی جانب رہنمائی کرتا ہے حتیٰ کہ وہ حُسنِ مطلق کے نصب العین کو پالیتا ہے۔ اس عشق کا آغاز بقول اُس کے خوبصورت نوجوانوں کی محبت سے ہوتا ہے، اس میں عورت کی محبت کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ مرد اور عورت کا باہمی عشق ایک مرض ہے اور جنوں کی ایک قسم ہے جس سے غور و فکر کی صلاحیتیں سلب ہو جاتی ہیں۔ جیو کریٹس نے مرضِ عشق کا علاج یہ تجویز کیا تھا کہ مریض کو گانا سننے کی ترغیب دلائی جائے۔ افلاطون کے خیال میں حسین لڑکوں کا عشق جسمانی پہلو سے شروع ہوتا ہے اور حُسن، صداقت، عدل اور خدمتِ خلق کے نصب العین پر منتهی ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مذہب، آرٹ اور اخلاق کی بنیاد اسی عشق پر استوار کی گئی ہے۔ سمپوزیم کے مباحثے میں شرکت کرنے والے اس بات پر متفق ہو جاتے ہیں کہ مرد کی مرد سے محبت مرد و عورت کی محبت سے کہیں زیادہ شریفانہ اور ارفع ہوتی ہے ایک اور مکالمے فیدرس میں بھی افلاطون نے ہم جنسی عشق کی تعریف و توصیف کی ہے۔ یہ ہے وہ افلاطونی عشق جسے شیلی، براؤنگ اور دوسرے شعراء نے غلط مفہوم دیا تھا۔ ہمارے ہاں صوفیہ بھی عشقِ مجازی کو عشقِ حقیقی کا پیش خیمہ سمجھتے رہے ہیں، ایک صوفی کا قول ہے ”المجاز قنطرۃ الحقیقۃ“ (مجاز حقیقت کا پل ہے) یہ مرحلہ بعض اوقات نو عمر حسین مردوں سے عشق کر کے طے کیا جاتا تھا۔

عشق کے تمام پہلوؤں کا ذکر کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہو گا کہ آخر عشق کیا ہے؟ راقمِ تحریر

اے ہندوؤں کے ہاں مرضِ عشق کے در، مراحل ہیں۔ آنکھ کی محبت، دل کی کشش، خواہش کا ابھار، بے خوابی، دُہلا پن، تمام چیزوں سے بے اعتنائی، شرم و حیا کا اٹھ جانا، خیالات کا انتشار، بے ہوشی، موت۔

کے خیال میں اس کا جواب یہ ہو گا کہ عشق جنسی کشش کی شالٹہ اور ارفع صورت ہے۔ بعض اصحاب فکر عشق کو سر اسر ایک شہوانی ضرورت سمجھتے ہیں۔

”عشق محض اوعیہ منی کو خالی کرنے کی لذت کا نام ہے جس طرح ہم ادرار بول سے اپنا مشانہ خالی کرتے وقت یا رفع حاجت کے وقت بڑی انتہائیوں کے خالی ہونے سے تسکین محسوس کرتے ہیں اسی طرح اوعیہ منی کو خالی کر دینے میں ہمیں اک گوند حفظ نفس محسوس ہوتا ہے۔ قدرت کی ستم ظریفی یہ ہے کہ ہمارے لئے لذت اور غلاظت کو ایک ہی جگہ جمع کر دیا گیا ہے۔“ (مانتین)

”عشق نام ہے محبوب سے مقاربت کی خواہش کا۔“ (مانتین)

”عشق کی تعریف کرنا مشکل ہے عقلیاتی لحاظ سے یہ بھردی ہے اور روحانی پہلو سے یہ دوسرے شخص پر قابو پانے کی خواہش ہے، جسمانی لحاظ سے محبوب سے متمتع ہونے کی آرزو ہے۔“ (راک فوکال)

”عشق اور بقوت کا حال ایک جیسا ہے۔ سب ان کی باتیں کرتے ہیں لیکن کسی نے انہیں نہیں دیکھا۔“ (راک فوکال)

”نظریاتی لحاظ سے عشق مثالیاتی رفعت طلبی ہے، عقلاً یہ بدترین قسم کی ہوس کاری ہے جس سے متعلق بات کرنے اور سوچنے سے بھی ننگ و عار محسوس ہوتا ہے۔“ (لیو ٹالسٹائے)

”مرد کا عشق اس کی جنسی آسودگی کے ساتھ ہی ماند پڑ جاتا ہے جب وہ اپنی محبوبہ سے فیض یاب ہوتا ہے تو دوسری عورتوں کی طرف مائل ہو جاتا ہے اس لئے عشق فطرت کے حصول مقصد کا ایک وسیلہ ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ یہ مقصد پورا ہونے پر عشق کا جذبہ بھی سرد پڑ جاتا ہے۔“ (شو پنہاٹر)

”اکثر لوگ اپنی محبوبہ سے فیض یاب ہونے کے بعد عشق و محبت کو بالائے طاق رکھ دیتے

ہیں یہ عین فطرتی ہے۔ کیا ایسا عشق بھی ممکن ہے پس میں یہ بات  
 نہ ہوں۔“ (ژنگ)

۱۔ عشق میں لذت کم اور درد زیادہ ہے۔ لذت ایک واہمہ ہے عقل کا تقاضا یہ  
 ہے کہ عشق سے اجتناب کیا جائے۔ یہ محض جنسی جذبہ کی کار فرمائی ہے۔ اس  
 سے بچنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اکتھ کرے۔“ (ہارٹ مائن)

۲۔ بعض گمراہوں کو عشق سو بھتا ہے اور اس سے کمال درجے کی جہالت غرض  
 اصلی جماع سے پائی جاتی ہے اور قوتِ بہیمی میں چوپایوں سے بھی بڑھ جاتا ہے  
 اس لئے کہ چوپایہ اپنی شہوت کو کسی نہ کسی طرح دور کر دیتا ہے اور عاشق  
 ایک خاص شخص کے سوا اور کسی طرح اپنی شہوت رفع نہیں کر سکتا یہاں تک کہ  
 اُس کے لئے ذلت پر ذلت اور غلامی اٹھاتا ہے۔“ (غزالی، احیاء العلوم)

۳۔ عشق کے نام پر بہت کچھ بکواس کی جاتی ہے اور اسے ضرورت سے زیادہ  
 اہمیت دی جاتی ہے۔ لوگ ایسے باتیں کرتے ہیں جیسے عشق دنیا کی عظیم ترین  
 قدر ہے۔ افلاطون نے دلکش پیرائے میں جذباتی نفس پروری کا ذکر کیا ہے۔  
 قدماء کا یہ رویہ عشق سے متعلق مناسب اور قابل فہم تقاضا مسلمانوں کے صحت مند  
 حقیقت پسندانہ نقطہ نظر سے اسے ایک جسمانی ضرورت ہی سمجھا جاتا ہے عیسائیت  
 میں فو فلاطونی جذبات ممنوع ہوئے جس نے اسے زندگی کا ایک اہم مقصد اور  
 جواز بنا دیا لیکن عیسائیت غلاموں کا مذہب تھا۔ اس نے کچلے ہوئے ستم رسیدہ  
 لوگوں کو بہشت کی بشارت دی تاکہ ان کی حالیہ زندگی کے مصائب و آلام کی  
 تلافی ہو سکے۔ دوسرے منشیات کی طرح عشق کے نشے نے بھی نشہ کرنے والوں  
 کو مضمل اور بے حس کر دیا۔ اس نشے نے ہماری قوتِ ارادی کو سلب کر لیا ہے  
 اور ہمیں بزدل بنا دیا ہے۔ جدید دور میں ہم جان گئے ہیں کہ ہمیں دنیا کی اور

بہت سی چیزیں عشق کی بہ نسبت زیادہ عزیز ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ صرف احق اور کمزور طبع لوگوں کے اعمال ہی عشق سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود ہم اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ کتابوں میں ہنر پر عشق و محبت کے بارے میں واپسی تباہی کے بارے ہیں جس سے سکندریہ کے غلاموں نے دھوکا کھایا تھا۔

جیاتیاتی پہلو سے جنسی خواہش کھانے کی جبلت سے پیدا ہوئی ہے۔ بوسے میں دونوں کا امتزاج موجود ہے۔ فرائد کہتا ہے کہ عشق اور بھوک ماں کے پستانوں میں جمع ہو جاتے ہیں۔ بوسہ لینے کی تمنا اور محبوب کے رخسار و گلو وغیرہ کو چومنے کی خواہش اس بات کا ثبوت ہے کہ منہ میں خوراک اور انسانی جبلتیں جمع ہو گئی ہیں۔ اُس کے خیال میں جب جنسی جبلت اپنی اصل منزل یعنی جنسی تشفی سے جھٹک جاتی ہے یا اُس تک پہنچ نہیں پاتی تو اس محرومی کو عشق کا نام دیا جاتا ہے۔ وہ عشق کو مردِ رُخا سمجھتا ہے یعنی جذبہ محبت میں نفرت بھی شامل ہے۔ ایک دفعہ ایک شخص نے فرائد سے لکھ کر استفسار کیا کہ آیا جنسی جبلت سے علاحدہ بھی عشق کا کوئی وجود ہے۔ فرائد نے جواب میں لکھا۔

”جناب من میں آپ کی درخواست پوری کرنے سے قاصر ہوں۔ آپ بہت زیادہ کا

مطالبہ کرتے ہیں۔ آج تک مجھے اس بات کی جرات نہیں ہو سکی کہ میں عشق کی مابیت

پر کوئی مفصل بیان دے سکتا۔ میرے خیال میں اس کے بارے میں ہمارا علم بہت محدود ہے۔“

فرائد کے اس خط سے مفہوم ہوتا ہے کہ وہ جنسی خواہش سے الگ عشق کا تصور کرنے سے قاصر ہے۔ ایرک فروم اور کرن ہورنی نے فرائد سے اختلاف کیا ہے۔ ایرک فروم کہتا ہے کہ جنس ہی عشق کی بنیاد نہیں ہے نہ محض جنسی جذبے کی تشفی یا محرومی سے انسانی کردار کی تشکیل ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان معاشرتی وجود ہے، اُس کے جذبہ عشق میں جنس کے علاوہ معاشرتی علاقائی بھی دخل ہوتے ہیں۔ کرن ہورنی کہتی ہیں کہ عشق کا مطلب خود پُر دگی ہے کسی شخص کا اپنے آپ کو بے اختیار اپنے محبوب کے پُر د کر دینا، یہی عشق ہے جو شخص جتنا زیادہ خود پُر دگی کا اہل ہوگا اتنے ہی زیادہ

لے سومرٹ مام، کمرسمس ہالیدے۔

عشق سے بہرہ مند ہو گا۔ جو عورت یا مرد کامل سپردگی کے قابل نہ ہو وہ کسی سے حقیقی محبت نہیں کر سکتا۔ اس نوع کی عورت سرد مہر ہوتی ہے اور اس قسم کا مرد کسی کا مخلص دوست نہیں بن سکتا۔ فرائد کے خیال کے برعکس کرن ہورنی انا کی شکست کو عشق کا لازمہ سمجھتی ہیں۔ کئی ارباب نظر عشق کو محض حیوانی جذبے کی آسودگی ہی نہیں سمجھتے بلکہ ایک اعلیٰ و ارفع جذبہ خیال کرتے ہیں جس کے اثرات انسان کے ذہن و قلب پر صالح اور رفعت بخش ہوتے ہیں۔

- ”عشق بے مایہ اور گھٹیا چیزوں کو باوقار بنا دیتا ہے۔“ (شیکسپیر)
- ”عشق سب سے بڑا معجزہ ہے۔ یہ ایک معمولی کلرک کو فرشتہ بلکہ دیوتا بنا دیتا ہے۔“ (وکرڈ ہیملنگ)
- ”عشق پاکیزہ ترین جذبہ ہے اور بے شمار غموں اور نیکیوں کا مصدر ہے۔ یہ اعلیٰ کارنامے انجام دینے کی تحریک کرتا ہے اور تمام عظماء اس سے متاثر ہوئے ہیں۔“ (مولیئر)
- ”عشق دنیا کا سب سے سُریلا نغمہ ہے۔“ (بالزاک)
- ”ایک فرومید، دنی الطبع شخص عشق اور فلسفے سے بہرہ یاب نہیں ہو سکتا۔“ (ول ڈیورل)
- ”عشق قوت ہے، توانائی ہے، رُوح کے تمام عوارض کا واحد علاج ہے، عشق ہر شخص کی دسرس میں ہے۔ اس پُر آشوب عالم میں صرف عشق ہی ایک مستقل اور محکم عفر ہے عشق ایسی لازوال دولت ہے جس میں دوسرے حصہ نہیں بنا سکتے۔ فیلمڈز نے کہا ہے کہ عشق نہ صرف فرد کے دل کو گرماتا ہے بلکہ ہر اس شخص کو متاثر کرتا ہے جو اس کے قریب آتا ہے۔“ (فرینک کارپو)
- ”میں ان عورتوں کا شکر گزار ہوں جن کے عشق سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ اگر میں محبت نہ کر سکتا تو نہایت تنگ نظر ہوتا۔“ (برٹنڈرسل)
- ”ایک عورت نے کہا ”جب میں عشق کر رہی ہوں تو میرا اعتماد انسانیت پر بحال

ہو جاتا ہے، ہر شے کامل و اکمل دکھائی دیتی ہے، ہر چیز حسین لگتی ہے، ہر شے  
میں خواب ناک شعرت پیدا ہو جاتی ہے۔“ (فرانڈ)

”عشق جنسی خواہش اور دوستی کے امتزاج کا نام ہے۔“ (سورسٹ نام)

”فرانڈ کا یہ خیال صحیح نہیں کہ خلل ذہن جنسی فاقہ زدگی کا نتیجہ ہے۔ فی الاصل خلل  
ذہن عشق و محبت سے محرومی کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔“ (تھیوڈور رائٹ)

برٹنڈ رسل نے پرمغز بحث کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ عشق محض جنسی خواہش ہی نہیں ہے  
بلکہ اس احساس تنہائی کا مداوا ہے جو اس بے کراں کائنات اور معاندانہ معاشرے میں تمام عورتیں اور مرد  
محسوس کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

”عشق صرف جنسی خواہش تک محدود نہیں ہے۔ یہ اس احساس تنہائی کا جو اکثر مردوں  
اور عورتوں کے لئے زندگی بھر کا عذاب بن جاتا ہے سب سے بڑا مداوا ہے۔ اکثر لوگ  
ارباب دنیا کی سردہری سے دہشت محسوس کرتے ہیں اور اپنا زمانہ کے  
ظلم و ستم سے ڈرتے ہیں۔ انہیں محبت کی آرزو ہوتی ہے جسے اکثر اوقات مرد دوستی،  
سرکہ چینی اور غنڈے پن میں چھپاتے ہیں اور عورتیں اس پر بد مزاجی اور عیب  
جوئی کے پردے ڈال لیتی ہیں۔ پُر جوش باہمی محبت اس احساس تنہائی کا خاتمہ کر  
دیتی ہے، اتنا کی سنگین دیواروں کو توڑ پھوڑ دیتی ہے اور ایک نئے آدمی کو جنم دیتی  
ہے جو یک جان دو قالب ہوتا ہے۔ فطرت نے انسان کو تنہا رہنے کے لئے پیدا  
نہیں کیا کیوں کہ بنی نوع انسان فریق ثانی کے بغیر حیاتیاتی تقاضے پورے نہیں کر  
کر سکتے نہ مہذب اشخاص عشق کے بغیر جنسی جبلت کی بھرپور تشفی کر سکتے ہیں۔  
اس جبلت کی کامل تسکین نہیں ہوتی جب تک کہ انسان پوری خود سپردگی سے فریق ثانی  
سے تعلق پیدا نہ کرے جن لوگوں کو پُرمسرت محبت کی دلی رفاقت اور بے تکلفی کا

تجربہ نہیں ہوا وہ زندگی کی بہترین نعمت سے محروم رہے ہیں، شعوری طور پر نہ  
 سہی لاشعوری طور پر انہیں اس محرومی کا احساس ہوتا ہے اس کے نتیجے میں انہیں  
 جو مایوسی ہوتی ہے وہ انہیں رشک و حسد، غور و غم اور جبر و تشدد کی طرف مائل کر دیتی ہے۔

برٹرینڈ رسل کا یہ خیال نہایت قابلِ قدر اور فکر انگیز ہے کہ انسان عشق کی بدولت اپنے احساسِ تنہائی پر قابو پا کر  
 سچی محبت سے بہرہ اندوز ہو سکتا ہے عشق کے موضوع پر بات کرتے ہوئے مارسل پروسٹ کہتا ہے کہ ہم کسی  
 حقیقی شخص سے پیدا نہیں کرتے بلکہ اُس آدمی سے محبت کرتے ہیں جسے خود ہمارے تخیل نے تخلیق کیا ہو۔ ایک  
 عاشق صادق اپنے محبوب کی خامیوں اور کوتاہیوں سے قطع نظر کر لیتا ہے اور اُسے مثالیاتی مقام عطا کرتا ہے۔  
 والٹر نے اپنی لغاتِ فلسفہ میں کہا ہے کہ انسان بالبطع ہر شے کو مثالیاتی رنگ دے دیتا ہے چنانچہ اُس نے  
 عشق کو بھی مثالیاتی بنا دیا ہے۔ اوّل کہتا ہے کہ محبوب کی صورت میں ہم اپنی ہی ذات سے عشق کرتے ہیں۔  
 ہماری پہلی اور آخری محبت اپنی ہی ذات کی محبت ہوتی ہے جب کسی عاشق کی محبوبہ اُسے دھتا بتا دیتی ہے  
 تو اس سے جو سمد وہ محسوس کرتا ہے وہ اس لئے نہیں ہوتا کہ اُس کی محبوبہ اُسے چھوڑ کر چلی گئی ہے بلکہ اس  
 لئے ہوتا ہے کہ اُس کی انا کو ٹھیس لگتی ہے اور اُس کا اعتماد اپنی کشش پر سے اٹھ جاتا ہے جس عشق کا لازمہ  
 اسی لئے ہے کہ عاشق کے دل میں یہ شبہ گھر کر لیتا ہے کہ اُس کا رقیب اُس سے زیادہ کشش اور خوبصورت  
 ہے۔ اس احساس سے اُن کی جراحت ہوتی ہے جو عذاب ناک تلخی کا سبب بن جاتی ہے۔

جن جن لوگوں نے عشق کیا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ عشق کیا ہے اور جو بد نصیب اس سے محروم  
 رہے ہیں انہیں سمجھانے کی کوشش بے سود ہے یہ کیف جیسا کہ ہم نے کہا تھا علمی سطح پر عشق جنسی کشش  
 کی شالستہ اور ارفع صورت ہے ظاہراً ایک مہذب معاشرے میں جنسی جبلت کے اظہار میں شائستگی اور  
 رفعت پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ انسان مہذب معاشرے کا فرد ہونے کی حیثیت سے عشق کا اہل ہوا ہے۔ جوشی  
 قبائل کے افراد جو تہذیب و تمدن کے برکات اور اخلاقی قدروں سے نا آشنا ہیں عشق کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔  
 انسان ذی عقل و ذی شعور ہونے کے باعث عشق و محبت سے روشناس ہوا جب جنسی جبلت میں عقل شعور  
 کا شمول ہوا تو انسان نے حیوانی جنسیت سے انسانی عشق کی طرف پہلا قدم اٹھایا تھا۔ اس کے قبل وہ

بھی دھوش کی طرح اپنی جنسی تشفی کر لیا کرتا تھا گویا جذبہ عشق و خرد ہی کا پروردہ ہے۔ فرائد اور اُس کے پیرو جو انسان کے تمام ذہنی و معاشرتی عوارض کا علاج بے محابا جنسی ملاپ میں تلاش کرتے ہیں یہ نہیں سوچتے کہ بے مہری اور سرد دلی کی مقادبت انسان کو دوبارہ چوپایہ بنا دے گی۔ انسانی سطح پر جنسی خواہش کی تسکین کے لئے عشق و محبت ضروری ہے کیوں کہ عشق انسان کو بھرپور مسرت سے سرشار کر دیتا ہے۔۔۔ ایسی مسرت جو محض جنسی ملاپ سے ارزانی نہیں ہو سکتی۔

برٹنڈ رسل نے کہا ہے کہ بہترین زندگی وہ ہے جو علم سے راہنمائی حاصل کرے اور عشق سے فیضان پائے۔ عشق انسان کی اُنا اور نرگسیت کی بندشوں کو جو کٹر، خود میں، بے رحم، قابوچی اور خود غرض بنا دیتی ہیں، توڑ پھوڑ دیتا ہے اور عشق کے طفیل وہ اشار، بے نفسی، مروت، ہمدردی اور انسان دوستی کے خالص انسانی احساسات سے آشنا ہوتا ہے۔ مولانا روم نے نہایت دلکش پیرائے میں عشق کے صالح اثرات کا ذکر کیا ہے۔

از محبت تلخ ہا شیریں شود	وز محبت مستہا زریں شود
از محبت درد ہا صافی شود	وز محبت درد ہا شافی شود
از محبت خار ہا گل می شود	وز محبت سر کہا گل می شود
از محبت دار تنختہ می شود	وز محبت یار بختہ می شود
از محبت سخن گلشن می شود	وز محبت دیو حورے می شود
از محبت سنگ روغن می شود	وز محبت موم آہن می شود
از محبت خار سوکن می شود	وز محبت تار روشن می شود

## شادی

شادی کا معروف تصور یہ ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت باہم مل جیں گے اور وہ اپنی زندگی گزارنے پر رضامند ہو جاتے ہیں اور ان کے مابین چند مذہبی رسوم کی ادائیگی کے ساتھ یا ان کے بغیر ایک معاہدہ ہو جاتا ہے جس کی پابندی دونوں پر لازم ہوتی ہے۔ تاریخ تمدن میں یہ تصور زرعی انقلاب کے بعد رونما ہوا تھا۔ زرعی انقلاب سے پہلے کی صدیوں سے متعلق اس کے بارے میں قیاس آرائیاں ہی کی جاسکتی ہیں۔ یا موجودہ وحشی قبائل کے طرزِ بود و ماند کے مشاہدے سے نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں۔ ہر کیف یہ طے ہے کہ شادی کا تصور شروع ہی سے کنبہ کے ساتھ وابستہ رہا ہے۔ کنبہ کی تشکیل سے متعلق کئی نظریات ہیں۔ ڈارون اور آگنسٹس کے خیال میں کنبہ کی ابتدا یوں ہوئی کہ ایک تنومند مرد کئی عورتوں اور بچوں کو ساتھ لئے لئے پھرتا تھا اور ان کی کفالت کیا کرتا تھا۔

ویسٹ مارک نے بھی اس خیال کی تائید کی ہے اور دلیل یہ دی ہے کہ جنسی حسد مرد کی فطرت میں شامل ہے اس لئے وہ اپنی عورت یا عورتوں میں کسی غیر مرد کا تصرف گوارا نہیں کر سکتا اسی بنا پر وہ مادری نظامِ معاشرہ کی اولیت سے انکار کرتا ہے جس میں عورت کو معاشرے کا محور یا مرکز سمجھا جاتا تھا لیکن یہ کہہ کر وہ اپنے نظریے کی نفی بھی کر دیتا ہے کہ بعض اقوام میں ایک عورت کے ساتھ متعدد مرد نکاح کرتے رہے ہیں۔ بر فالٹ کہتا ہے کہ پرندوں اور حیوانات میں ماں بچے کا رشتہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ کنبہ ماں بچوں پر مشتمل ہوتا ہے جس میں باپ کی حیثیت محض ثانوی ہوتی ہے۔ اس سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ انسانی معاشرے کا آغاز مادری نظام سے ہوا تھا۔ ڈاکٹر زوکمان نے کہا ہے کہ حیوانات اور پرندے خاص خاص موسموں میں اکٹھے ہو کر بچے پیدا کرتے ہیں کیوں کہ ان کا جنسی اہل خاص موسموں سے وابستہ ہوتا ہے جب کہ انسان ہر موسم میں جنسی ملاپ پر مستعد رہتا

ہے۔ چنانچہ جنسی ملاپ کے اس توازن و مداومت ہی نے انسانی کنبے کو جنم دیا تھا۔ باخوض نے تاریخی شواہد سے ثابت کیا ہے کہ انسانی نظام معاشرہ ابتدا میں مادری تھا۔ اُس نے شادی کے ارتقاء کے تین مراحل گنائے ہیں۔ ۱۔ جنسی آزادی کا دور ۲۔ شادی جس میں عورت کو مرد پر فوقیت حاصل تھی۔ ۳۔ شادی جس میں مرد کو عورت پر برتری حاصل ہو گئی۔ زریعہ انقلاب کے بعد مرد کو عورت پر سیادت حاصل ہو گئی اور پدری نظام معاشرہ معرض وجود میں آیا جو آج بھی اکثر مہذب اقوام میں باقی ہے۔ اگرچہ صنعتی انقلاب کے پھیلنے کے ساتھ اس کی بنیادیں تزلزل ہو رہی ہیں۔ بعض اقوام اور قبائل میں مادری نظام معاشرہ کے آثار صدیوں تک باقی رہے مثلاً مصر قدیم میں عورت کو بڑا معزز مقام دیا گیا تھا۔ وہ املاک کی وارث ہوتی تھی اور ورثہ اُس کی طرف سے بیٹیوں کو منتقل ہوتا تھا۔ چنانچہ ورثے کو محفوظ رکھنے کے لئے سلاطین و امرا اپنی بہنوں اور بیٹیوں سے نکاح کر لیتے تھے۔ جزائر ٹروبرینڈ میں آج بھی عورت کی سیادت برقرار ہے۔ میلی نوسکی کہتا ہے کہ پالی نیشیا میں مادری نظام معاشرہ قائم ہے اور وہاں کے باشندوں میں باپ کے لئے کوئی لفظ موجود نہیں ہے۔ جنسی ملاپ کو مرد کا حق نہیں سمجھا جاتا بلکہ یہ بیوی کا احسان اپنے شوہر پر ہوتا ہے۔ شوہر گھر کے کام کاج میں بیوی کا ہاتھ بٹاتا ہے اور بچوں کی پرورش کرتا ہے۔ بچے اپنے باپ کے بجائے اپنے ماموں کو اپنا سرپرست خیال کرتے ہیں۔ انجلز کے خیال میں شادی ایک بورژوا ادارہ ہے جو اقتصادی ضروریات کے تحت شکل پذیر ہوا تھا، جب دوسری اجناس کی طرح عورت کو بھی ذاتی املاک میں شمار کرنے لگے۔ کھیتی باڑی میں مرد کو عورت اور بیٹیوں کی امداد کی ضرورت تھی جس کے تحت کنبے نے واضح صورت اختیار کی اور شادی کا رواج ہوا اور زمانہ سے عورت مرد کی کینیز بن کر رہ گئی۔ زریعہ معاشرے میں عورت ایک ہی مرد سے وابستہ ہو گئی کیوں کہ مرد اپنی املاک اپنے ہی صلبی فرزندوں کو ورثے میں چھوڑنا چاہتا تھا۔ لیکن مرد خود کئی کئی بیویاں

۱۷ THE RIGHT OF THE MOTHER.

۱۸ SEX AND REPRESSION IN SAVAGE SOCIETY.

اور کمیزیں رکھنے کا مجاز تھا اور کبیسوں سے بھی جی ہلاتا تھا۔ ان حالات میں عورت کا اصل مقام بحال نہ رہ سکا اور وہ گائے، بیل، بھڑبھڑی کی طرح مرد کی ذاتی املاک بن کر رہ گئی چنانچہ حور مجاہد کے قوانین میں عورت کو مرد سے فروتر کہا گیا ہے اور مرد کو اس بات کا حق دیا گیا ہے کہ وہ جیسا سلوک چاہے اپنی زوجہ سے کرے۔ بابل میں شوہر اپنی بیوی کو کسی غیر مرد کے ساتھ ناگفتہ بہ حالت میں پکڑ لیتا تو وہ اسے جان سے مار دینے کا مجاز تھا۔ روم میں کیڑوں کے ضابطہ فوجداری کی رو سے مرد اپنی عورت کو کسی غیر مرد کے ساتھ خلوت میں دیکھ کر اسے بلا تامل موت کے گھاٹ اتار دینے کا حق رکھتا تھا لیکن عورت اپنے شوہر کو کسی غیر عورت کے ساتھ اختلاط کرتے ہوئے پکڑ لیتی تو اسے لب کشائی کی اجازت بھی نہیں تھی۔ بردہ فروشی کا رواج ہوا تو عورت برسر بازار بکتنے لگی۔ لوندی خریدتے وقت گاہک اس کا بدن کھول کر ہر طرح سے اطمینان کر لیتے تھے۔

سلاطین و امراء کی حرم سراؤں میں سیکڑوں لوندیاں رکھی جاتی تھیں اور ان کی تعداد سے کسی بادشاہ یا رئیس کے مرتبے کا تشخیص کیا جاتا تھا۔ شاہان وقت کے لئے حسین منتخب عورتیں محل میں رکھی جاتی تھیں۔ آزاد لکھتے ہیں۔

”تذکرہ کاتورہ (شاہی قانون) تھا کہ جس عورت پر بادشاہ خواہش سے نظر کرے خاندان پر حرام ہو جاتی تھی۔ آج سے پندرہ یا سولہ برس پہلے میں نے خود دیکھا کہ تورہ چنگیزی کا اثر باقی چلا آتا تھا۔ شاہان بخارا بھی جس عورت پر خواہش ظاہر کرتے تھے اس کا وارث اسے آراستہ کر کے حاضر کر دیتا تھا۔ پسند آئی تو حرم میں داخل رہتی ورنہ رخصت ہو جاتی اور جب تک زندہ رہتی اپنے ہم چشموں میں فخر کرتی کہ مجھے یہ برکت حاصل ہوئی تھی۔“

اگرچہ ہند میں بھی تورہ چنگیزی پر عمل کیا جاتا تھا۔ ملا عبدالقادر بدایونی کے بقول عبدالواسع کی بیوی نہایت حسین تھی۔ اگر کو علم ہوا تو کہا اسے طلاق دے کر میرے پاس بھیج دو۔ اس نے ایسا لئے دربار اکبری سے منتخب التواریخ

ہی کیا۔ اگر دلی کے گھر گھر میں خواجہ سرا اور عورتیں بیچ کر حسین لڑکیوں کا کھوج لگایا کرتا تھا اور ان سے منہ کر کے حرم میں داخل کر لیتا تھا۔ وہ سیالپور لکھتا ہے کہ برار کے ملک میں لوگ اپنی خوبصورت بیویاں راہہ یا منتری کو بطور تحفہ دیتے تھے۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے۔

”سماڑ میں یہ دستور ہے کہ کسی امیر یا رعیت یا بازاری کی لڑکی جوان ہوتی ہے تو سلطان کو خریدی جاتی ہے۔ سلطان عورت کو دیکھنے کے لئے بھیجتا ہے۔ اگر پسند آئی تو اس کے ساتھ نکاح کر لیتا ہے۔ لوگ تمنا کرتے ہیں کہ ہماری لڑکی سلطان کو پسند آجائے کیوں کہ بادشاہ کے ساتھ نکاح ہوتے ہی اس کے باپ کا مرتبہ بڑھ جاتا تھا۔“

اقوام قدیم میں بادشاہ یا خاقان کی موت پر اسکی محبوب لونڈیاں اس کی میت کے ساتھ زندہ دفن کر دی جاتی تھیں تاکہ اگلے جہان میں وہ ان سے جی بھلا سکے۔ ہندوؤں کی سستی کی رسم اسی ریت سے یادگار تھی۔ برہمن امیر گھرانوں کی عورتوں کو ان کے زیور وں کے لالچ میں شوہر کی نفس کے ساتھ آگ میں جھونک دیتے تھے۔ سلاطین اور امرا کو حق شب زفاف حاصل تھا یعنی ہر دہن کو اپنی عروسی کی رات بادشاہ یا جاگیردار کے یہاں بسر کرنا پڑتی تھی۔ ازمنہ پہلے کے یادری جاگیردار بھی جو تجربہ کے پابند تھے یہ حق باقا حدگی سے وصول کرتے تھے۔ بابل میں شوہر اپنی سرکش بیوی کو لونڈی بنا کر سر بازار بیچ دیتا تھا۔ جنگ کی صورت میں مفتوح قوم کی عورتیں فاتحین پر مباح ہو جاتی تھیں اور وہ ان سے بلا تکلف فیض یاب ہوتے تھے۔ یہ روایت آج بھی باقی و برقرار ہے۔ نیم مہذب اور مہذب اقوام مثلاً یونانی اور ہندی میزبان اپنی بیوی یا لونڈی کو ازراہ توجہ رات کے وقت مہمان کے پاس بھیج دیتا تھا۔ ویسٹ مارک کہتا ہے کہ مہمانوں کو عورتیں پیش کرنا آداب میزبانی میں شامل تھا۔ حاصل یہ کہ زرعی انقلاب کے بعد پدری نظام معاشرہ میں عورت بھڑ و ذلیل ہو کر رہ گئی اور اسے اپنے جائز فطرتی حقوق سے محروم کر دیا گیا۔ منوسمتری میں لکھا ہے

لے کام شامز سے سفر نامہ

”عورت، بیٹے، غلام کی کوئی املاک نہیں ہوتی۔“

مُلا محسن فانی لکھتے ہیں:۔

” (مجوسیوں کے یہاں) عورتوں کے واسطے نیایش یا عبادت کا حکم نہیں ہے۔ سوائے

اس کے کہ دن میں تین مرتبہ اپنے خاوند کے پاس جا کر اُس کی رضا جوئی کریں۔“

گویا مرد و عورت کا خدا بن گیا۔ ہندوؤں کے یہاں آج بھی عورت اپنے شوہر کو ”پتی دیو“ کہتی ہے۔

علم الانسان کے طلبہ نے شادی کی کئی قسمیں گنائی ہیں جو مختلف قوموں میں رائج رہی ہیں۔

یہودیوں میں یہ رواج تھا کہ کوئی نوجوان کسی شخص کی سات برس تک خدمت کرتا تو وہ شخص اس کے

عوض میں اُسے اپنی بیٹی بیاہ دیتا تھا۔ جناب یعقوب نے اپنے ماموں لابان کی سات برس تک

خدمت کی تاکہ وہ اُنہیں اپنی بیٹی راحل سے بیاہ دے لیکن اُس نے دھوکے سے دوسری بیٹی بیاہ

دی۔ راحل سے بیاہ کرنے کے لئے اُنہیں اپنے ماموں کی سات برس اور خدمت کرنا پڑی، عہد

نامہ قدیم سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں دو سگی بہنوں سے نکاح کرنا جائز تھا جس پر عہد

جاہلیت کے عرب بھی عمل کرتے رہے حتیٰ کہ اسلام نے اسے ممنوع قرار دیا۔ قدیم زمانے کے یہودی

اپنی سوتیلی بہن سے بھی نکاح کر لیا کرتے تھے۔ افریقیہ اور آسٹریلیا کے بعض قبائل میں رواج تھا کہ

وہ اپنی بہنوں یا بیٹیوں کا تبادلہ کر لیتے تھے۔ بعض اوقات شوہر آپس میں گئے بھائی اور ان کی بیویا

سگی بہنیں ہوتی تھیں۔ ایتھنز والوں میں سوتیلی بہن سے نکاح کر لیا جاتا تھا۔ بعض وحشی قبائل

میں ماں اور بیٹی ایک ہی شخص کی منکوحہ ہوتی تھیں۔ فرعون مصر اور کسراے ایران اپنی سگی بہنوں

اور بیٹیوں سے نکاح کر لیتے تھے۔ راہہ داسر والی سندھ نے اپنی سگی بہن رانی بائی سے بیاہ چایا

تھا۔ ایک ہی بیوی کے متعدد شوہر ہونے کا رواج بھی عام تھا۔ آج بھی بنگال کے سنٹالوں،

جنوبی ہند کے نائروں اور ٹوڈوں میں یہ روایت باقی ہے۔ کئی اقوام میں ایک قبیلے کے مرد دوسرے

قبیلے کی لڑکیوں سے گروہی نکاح کر لیتے تھے۔ افریقیہ، جاپان قدیم، چین قدیم، ہند اور امریکہ

لے دبستان مذہب

میں دختر فروشی کا رواج تھا۔ باپ اپنی بیٹی کی قیمت وصول کرتا تھا۔ ایران کے دیہات میں آج  
 بھی ماں شیر بہا یعنی اُس دودھ کی قیمت دلہا سے وصول کرتی ہے جو اُس نے اپنی بیٹی کو پہلایا تھا  
 بروہی قبیلے میں اس قیمت کو شیر پللی کہتے ہیں اور باپ جو قیمت اپنی بیٹی کی وصول کرے اُسے  
 لب کہا جاتا ہے۔ کالیدیوں کے یہاں شادی اپنے ہی گھنے اور ذات میں کرنا پڑتی تھی۔ یہودیوں نے  
 یہ قانون کالیدیوں ہی سے مستعار لیا تھا۔ اُس کے برعکس بعض اقوام میں اپنے ہی طوطم کے ماننے  
 والوں اور قبیلے والوں میں شادی کرنا ممنوع تھا۔ گوتم بدھ نے رشتے کے چھٹے درجے تک شادی  
 کو ممنوع قرار دیا تھا۔ ادریسی کہتا ہے کہ بلہرا کے ملک میں بیاہی ہوئی عورتوں اور منسوبہ لڑکیوں  
 کے سوا جملہ عورتوں سے عارضی تمتع کی اجازت تھی۔ یہودیوں میں یہی رواج تھا لیکن جو شخص کسی  
 کنواری غیر منسوبہ کی آبرو لیتا اُسے اُس کے ساتھ نکاح کرنا پڑتا تھا۔ سکاٹ لینڈ میں ایک قانون  
 یہ تھا کہ جب ایک نوجوان مرد اور عورت شواہد کے سامنے بیان دیتے کہ وہ میاں بیوی کی طرح  
 مل کر رہتے ہیں تو ان کا نکاح خود بخود ہو جاتا تھا۔ نیوگنی کے ماسم اپنی بیویاں بے تکلف  
 دوسروں سے تبدیل کر لیتے تھے۔ سپارٹا میں شادی کا دستور یہ تھا کہ برابر تعداد میں نوجوانوں  
 اور کنواریوں کو ایک تاریک کمرے میں بند کر دیتے تھے۔ جہاں وہ اپنی زندگی کا ساتھی منتخب کر  
 لیتے تھے۔ اہل سپارٹا کا خیال تھا کہ اس نوع کا انتخاب محبت کی شادی سے کہیں بہتر ہوتا ہے۔  
 رومہ میں شادی تین طرح کی ہوتی تھی۔ پہلی صورت میں سادہ مذہبی تقریب ہوتی تھی۔ دوسری  
 میں باپ بھوٹ موٹ اپنی بیٹی کو داماد کے ہاتھ بیچ دیتا تھا۔ تیسری صورت یہ تھی کہ جو لڑکا اور  
 لڑکی ایک برس تک میاں بیوی کی طرح رہتے ان کا نکاح از خود ہو جاتا تھا۔ سسٹربونے  
 ارسٹوپولس کے حوالے سے لکھا ہے کہ ٹیکسا میں ایک عجیب رسم تھی جو لوگ انداس کے باعث  
 اپنی جوان بیٹیوں کا بیاہ نہ کر سکتے وہ ایک دن انہیں اکٹھا کر کے ڈھول باجے بجاتے ہوئے مندر  
 میں لے آتے تھے جہاں لوگوں کا جھگھٹ لگ جاتا۔ جو شخص شادی کا خواہش مند ہوتا اُسے مطلوبہ لڑکی

کا بدن کھول کر دکھایا جاتا تھا۔ بعض اقوام میں یہ رواج تھا کہ ایک قبیلے کے مرد مسلح ہو کر چانک کسی دوسرے قبیلے کی قیام گاہ پر دھاوا بول دیتے اور کنواری لڑکیاں بھگالے جاتے تھے۔ روکوس اور اُس کے ساتھیوں نے اسی طرح ایک تہوار پر سبائیں قبیلے کی پانچ سو ستائیس لڑکیوں کو جبراً اغوا کیا تھا۔ اشتعالی انقلاب سے پہلے مرغیزوں میں یہ رواج تھا کہ ایک دوشیزہ اپنے صبا رقتار گھوڑے پر سوار ہو جاتی اور اُس سے نکاح کرنے والے خواہش مند نوجوان گھوڑوں پر سوار اُسے پکڑنے کی کوشش کرتے تھے۔ جو نوجوان قریب آتا لڑکی اُسے زناٹے کا چابک رسید کرتی تھی۔ آخر وہی نوجوان کاٹیا ہوتا جسے لڑکی چاہتی تھی۔ ہندوؤں میں راجے اپنی بیٹیوں کو بیاہنے کے لئے سو مہر رچاتے تھے۔ لڑکی جس نوجوان کے گلے میں ملا ڈال دیتی وہی اُس کا شوہر ہو جاتا تھا۔ سینا اور درویدی کا بیہ اسی طرح کیا گیا تھا۔ محمود شکر سی آٹوسی نے بلورغ الارلب میں لکھا ہے کہ ماقبل اسلام کے عربوں میں شادی کی مندرجہ ذیل قسمیں رائج تھیں۔

— نکاح الاستبضاع :- خاوند اپنی بیوی سے کہتا کہ حیض سے پاک ہو کر فلاں سردار کے پاس جانا اور اُس سے سمیت کرنا اُس کا مقصد یہ ہوتا کہ کسی شجاع اور نجیب کا لطف لیا جائے۔ ان ایام میں وہ خود اپنی بیوی سے الگ رہتا تھا۔ — نکاح المتعہ :- یعنی ایک مدت مقررہ کے لئے موت سے شادی کرنا۔ مقررہ مدت کے بعد دونوں میں جدائی ہو جاتی تھی۔ اسے نکاح موقت اور میعہ بھی کہتے ہیں۔ — نکاح البدل :- دو اشخاص اپنی بیویاں بدل لیتے تھے۔ — نکاح الشغار :- ایک دوسرے کی بیٹیوں، بھتیجیوں وغیرہ کا تبادلہ کر کے نکاح کر لیتے تھے۔ ایک صورت یہ تھی کہ بہت سارے لوگ مل کر کسی بھنڈے والی (کسبی) کے پاس جاتے۔ وضع حل کے بعد وہ کسبی کسی تیانہ شناس کو بلاتی اُسے بتاتی کہ اُس نے فلاں فلاں مرد سے ایک ہی بار خلوت کی تھی قیاد شناس فو مولود بچے کے چہرے کے نقوش دیکھ کر بتا دیتا تھا کہ یہ فلاں آدمی کا بیٹا ہے اس پر وہ شخص اُس بچے کو اپنا بیٹا تسلیم کر لیتا تھا۔ نکاح کی ان مختلف صورتوں میں اسلام نے نکاح المتعہ کو برقرار رکھا۔ ترجمہ پیر محمد حسن

دکھا۔ جناب رسالت مآب اور شیخِ اول کے زمانے میں صحابہ مُتَعِد کرتے رہے۔ بعض اوقات مُٹھی جھرجھکے عوض مُتَعِد ہو جاتا تھا۔ شیخِ ثانی نے اسے ممنوع قرار دیا لیکن بعض صحابہ کبار اور تابعین بدستور مُتَعِد کے قائل رہے۔ فیروز شاہ ہمنی نے مُتَعِد کے مسئلے پر مختلف فرقوں کے علماء سے تبادلہ خیال کیا تو احناف نے اسے ناجائز قرار دے دیا۔ شیعہ کہنے لگے کہ مُتَعِدِ اخفرت اور شیخِ اول کے زمانے میں ہوتا رہا۔ یہ سن کر فیروز شاہ مُتَعِد کا قائل ہو گیا اور کئی عورتوں سے مُتَعِد کیا۔ جلال الدین اکبر نے بھی مُتَعِد کا مسئلہ اُٹھایا۔ احناف نے اس کی مخالفت کی۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے کہا کہ اگر کوئی مالکی فقیہ مُتَعِد کے جوازیں فتویٰ دے تو مُتَعِد ایک حنفی کے لئے بھی جائز ہو سکتا ہے۔ اکبر نے مالکی قاضی حسین عرب مکی سے فتویٰ لیا اور کئی عورتوں سے مُتَعِد کر لیا۔ اثنا عشری شیعہ اور مالکی سُنی شروع سے مُتَعِد کے جواز کے قائل رہے ہیں۔ جانِ عالم واجد علی شاہ نے بیسیوں عورتوں سے مُتَعِد کیا تھا جن میں بقول شہر لکھنوی بھگنیں بھی شامل تھیں۔ مولوی عبدالرزاق کانپوری لکھتے ہیں؎

”میتا برج میں بھی پریوں کا جگمگٹ ہو گیا اور جملہ گل اندام کنیزوں اور طوائفوں سے

مُتَعِد کیا گیا کیوں کہ مُتَعِد کے بغیر شاہ ان عورتوں کو دیکھنا حرام سمجھتے تھے۔“

ہندوؤں میں بیاہ کی آٹھ قسمیں ہیں جن کی تفصیل دیا شدہ نے لکھی ہے۔ — براہم وواہ :- دوہا دہن کا مجرورہ کہ علم حاصل کرنے کے بعد باہمی رضامندی سے نکاح کیا جائے۔ — آرش وواہ :- دوہا سے کچھ لے کر شادی کرنا۔ — پراجاپتیسہ وواہ :- دھرم کی ترقی کو مد نظر رکھ کر نکاح کرنا۔ — اُسر وواہ :- دوہا دہن کو کچھ دے کر شادی کرنا۔ — سوہمہ :- لڑکی کو زیوروں سے آراستہ کر کے کسی بڑے یگیہ میں رتوک کا کام کرتے ہوئے داماد کے سپرد کر دینا دیو وواہ ہے۔ گاندھرو وواہ :- بغیر کسی قاعدہ یا موقع کے کسی لڑکے لڑکی کا آپس میں مقابرت کر لینا۔ — راکشس وواہ :- جنگ کے ذریعے یا زبردستی یا فریب سے لڑکی حاصل کرنا۔ — پیشاچ وواہ :- سوئی ہوئی یا شرب کے

لے موٹا امام مالک۔ — لے یاد ایام۔ — لے ستیا رتھ پرکاش

نشے میں دھت لڑکی سے باہر مقاربت کرنا۔ ہندوؤں میں سپارٹا والوں کی طرح نیوگ کا رواج بھی تھا۔ منوسمرتی میں لکھا ہے۔

” عورت کے ہاں شوہر سے اولاد نہ ہو تو وہ دیور یا شوہر کے کسی دوسرے عزیز سے اولاد پیدا کر سکتی ہے۔“

منوجی فرماتے ہیں۔

” ہونیوگ کی رو سے بیوی سے ہم بستر ہونے پر مامور ہوا ہے وہ اپنے جسم پر مکھن لگا کر رات کے وقت عورت کے پاس جائے اور ایک بچہ پیدا کرے۔ دوسرا بچہ پیدا کرنے کا وہ مجاز نہیں ہے۔“

نیوگ سے جو بچے پیدا ہوتے تھے وہ بیوی کے اصل شوہر کی اولاد سمجھے جاتے تھے عہد نامہ قدیم میں لکھا ہے کہ جب غیر بیوہ کی بیوہ کو اُس کے دیور اذنان کے پاس بھیج دیا گیا تاکہ وہ اولاد پیدا کرے اور اپنے بھائی کی نسل کو جاری رکھے۔ جاہلی عربوں کی طرح سپارٹا والے بھی شجاع اور نجیب جوان مردوں کا لطف لینے کے لئے اپنی بیویوں کو اُن کے یہاں بھیجا کرتے تھے۔

آج کل مختلف اقوام میں شادی بیاہ کی تعزیم پر جو رسوم ادا کی جاتی ہیں وہ اکثر و بیشتر قدیم زمانے سے یادگار ہیں۔ ہمارے ہاں دولہا کے سہرا باندھنے اور دلہن کے گھونگٹ نکلانے کا مقصد انہیں نظر بد سے محفوظ رکھنا ہوتا ہے۔ دولہا کو جنوں بھوتوں سے محفوظ رکھنے کے لئے اس کے ہاتھ میں لوبے کی پھڑی دی جاتی ہے۔ دولہا دلہن کو عروسی کے دن نہلانے کی رسم اکثر اقوام میں پائی جاتی ہے۔ ہمارے یہاں بیاہ سے چند روز پہلے دولہا دلہن کو مانجھے بٹھایا جاتا ہے۔ اس دوران میں وہ میلے کھیلے کپڑے پہنتے ہیں۔ اس کا ایک مقصد تو انہیں نظر بد سے محفوظ رکھنا ہوتا ہے اور دوسرا یہ کہ بیاہ کے دن نہا کر وہ عروسی جوڑا پہنیں گے تو ان کا رنگ روپ نکھر آئے گا۔ شادی کے لئے منوسمرتی۔

دوران میں دولہا دلہن سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ خاموش رہیں گے کہ اس دن ان کا  
 باتیں کرنا شرم و عیا کے منافی سمجھا جاتا ہے۔ بعض اقوام میں شادی کے موقع پر دولہا دلہن  
 کے ہاتھ آپس میں ملائے جاتے ہیں۔ آرسی مصحف کی رسم کا مقصد انہیں آپس میں متعارف کرانا ہوتا  
 ہے۔ ہندوؤں میں دولہا دلہن کو آگ کے لاد کے گرد چکر لگانا پڑتا ہے۔ ساتویں چکر پڑنا حاکم  
 محکم ہو جاتا ہے۔ چکروں کے دوران میں دلہن کا بھائی اُسے کھیل دیتا جاتا ہے جو وہ آگ میں  
 پھینکتی جاتی ہے۔ انڈیا میں دولہا کو دلہن کی گود میں بٹھاتے ہیں۔ بشرتی افریقہ کے بنیادوں دلہن  
 کو رے سے بازو دیتے ہیں۔ دونوں طرف اُس کے سسرال اور میکے والے کھڑے ہو جاتے ہیں  
 اور رس کشی ہوتی ہے۔ یہ کشمکش محض علامتی ہوتی ہے۔ آخر سسرال والے دلہن کو لے جاتے  
 ہیں۔ افریقہ کے ہیویا قبیلے میں برات آئے تو دولہا دلہن کو زبردستی اٹھا کر لے بھاگنے کی کوشش  
 کرتا ہے۔ دلہن کی سہیلیاں ڈٹ کر مقابلہ کرتی ہیں۔ آخر دولہا دلہن کو لے جانے میں کامیاب ہو جاتا  
 ہے۔ برات اُس زمانے سے یادگار ہے جب ایک قبیلے والے دوسرے قبیلے پر حملہ کر کے ان کی لڑکیاں  
 لے بھاگتے تھے۔ ایسے موقعوں پر اکثر جنگ ہوا کرتی تھی۔ ہمارے دیہات میں برات آنے پر باجے  
 گرجے کا اہتمام کیا جاتا ہے تاکہ شادی کی شہرت دور دور تک ہو جائے۔ برات آنے پر عورتیں چھوٹی  
 پر بیٹھ جاتی ہیں، براتیوں پر خشک اُپلے پھینکتی ہیں اور انہیں بے تحاشہ گالیاں دیتی ہیں۔ شادی  
 کے دن دولہا کو سسرال کی عورتیں اندرون خانہ بلاتی ہیں اور طرح طرح سے اُس کی آزمائش  
 کرتی ہیں۔ بعض اوقات دولہا کو دلہن کی بند مٹھی کھولنی پڑتی ہے یا پتھر کی سِل اٹھانی پڑتی ہے  
 جو دولہا اس کوشش میں ناکام رہے اُس پر عورتیں آوازے کستی ہیں کہ بھلی ڈبولی تھے شاید تیری ما  
 نے دودھ نہیں پلایا۔ دولہا کھارے سے نیچے اُترے تو اسے چھوڑیاں توڑنا پڑتی ہیں۔ مطلب یہ ہے  
 کہ وہ اسی آسانی سے عورت پر قادر ہوگا۔ مہر اور جہیز کی رسوم بھی قدیم زمانے سے چلی آ رہی  
 ہیں جب دلہن کو خریداجانا تھا یا دولہا کو زرد مال دینا پڑتا تھا۔ ایک رومن عورت نے جہیز کا  
 ذکر کرتے ہوئے کہا تھا ”عجیب بات ہے کہ ہمیں اپنا آقا بھی خریدنا پڑتا ہے“ بنگالی ہندوؤں

میں جہیز کے فراہم نہ ہو سکنے کے باعث کئی لڑکیاں ساری عمر کنوارپن میں بتاوتی ہیں کیونکہ ان کے والدین دُلہا خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ رخصتی کے وقت اکثر اقوام میں دُلہن با آواز بلند رو کر اپنے غم کا اظہار کرتی ہے کیونکہ وہ ماں باپ اور بہن بھائیوں سے بچھڑ رہی ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں اس موقع پر باپ کے پُرسوز گیت گائے جاتے ہیں جنہیں سن کر متعلقین کی آنکھیں بھیگ بھیگ جاتی ہیں۔

روم میں شادی کی فال پرندوں کی اڑان یا قربانی کے بمبے کی اندڑیوں سے لی جاتی تھی۔ آخری رسم یہ تھی کہ دُلہا اور دُلہن کو قربانی کے گرد چکر لگانا پڑتے تھے۔ اس کے بعد شادی کا جلوس دُلہا کے گھر روانہ ہو جاتا تھا۔ اس جلوس میں نہایت فحش گیت گائے جاتے تھے جو بکارت کے دیوتا کی حمد میں ہوتے تھے۔ دُلہا کے گھر پہنچ کر دُلہن چوٹھ پر چربی یا تیل گراتی تھی پھر دُلہا اُسے کو ملی میں بھر کر اندر لے جاتا تھا اس موقع پر یہودیوں میں دُلہن پر چادر یا گندم کے دانے نثار کئے جاتے تھے تاکہ دُلہن کے ہاں کثرت سے اولاد پیدا ہو۔ ہمارے ہاں پالکی پر لے کر نثار کرتے ہیں جنہیں لوٹنے کے لئے بچے پی پڑتے ہیں بخجند عروسی کو اہتمام سے سجایا جاتا ہے۔ دُلہن سہل سے لگ کر بیٹھ جاتی ہے اور عورتیں اس کا مکھڑا دیکھنے اور سلامیاں دینے کے لئے ہجوم کر آتی ہیں۔ بعض اقوام میں عورتیں مرد بخجند عروسی کے دروازے پر دھن دے کر بیٹھ جاتے ہیں جب دُلہا انہیں بتاتا ہے کہ وہ اپنی دُلہن سے مطمئن ہے تو خوشی کے نعرے بلند کئے جاتے ہیں شب عروسی کی صبح کو سامی اقوام میں بستر کی چادر ملا خطہ کی جاتی تھی۔ دُلہن کی بکارت کا ثبوت ملنے پر یہ چادر برادری کے گھر گھر میں پھرائی جاتی تھی۔

جو شادی مذہبی رسوم کے ساتھ رچائی جائے اُس میں شواہد کا موجود ہونا ضروری ہوتا ہے لیکن مستثنیٰ حالات میں شواہد کے بغیر بھی سیاہ ہو جاتا ہے۔ مندوؤں میں گندھرو دواہ اس کی مثال ہے۔ دُشنت اور سُگنتلا کا بیاہ اسی نوعیت کا ہوا تھا۔ مصر کے دیہات میں کوئی مرد کسی

بالغ کنواری سے شادی کا خواہش مند ہوا اور وہ عورت کہہ دے وہ بہت لک نفسی (میں اپنا تن تجھے بخشی ہوں) تو خواہ گواہ نہ بھی ہوں عورت اُس کے نکاح میں آجاتی ہے۔ پنجاب کے دیہات میں بھی "تن بخشی" کی شادی کا ذکر کبھی کبھار سننے میں آتا ہے۔ ایران اور افغانستان کے بعض دیہات میں نوجوان اپنی منسوبہ سے نکاح سے قبل جنسی ملاپ کرنے لگتا ہے جسے "نامزد بازی" کہتے ہیں بعض اقوام میں صغیر سنی کی شادی کا رواج بھی رہا ہے۔ اس پہلو سے ہندو رسوائے دہر ہیں۔ منوسمرتی میں ہے۔

"تیس برس کا مرد بارہ برس کی لڑکی سے اور چوبیس برس کا مرد آٹھ برس کی لڑکی سے شادی کرے۔"

اس نص کی آڑ میں ہندو کمسن لڑکیوں پر بے پناہ ظلم توڑتے رہے ہیں۔ اگر نے اس لعنت کو دور کرنے کی کوشش کی اور حکم دیا کہ کوئی لڑکا سولہ برس اور کوئی لڑکی چودہ برس سے پہلے نہ بیاہی جائے لیکن ہندوؤں نے اُس کی ایک نہ چلنے دی۔ آٹھ نو برس کی بیوی پر جو مظالم ڈھائے جاتے تھے ان کی تفصیل مس کیتھرین میو نے لیبسیسٹرا سمبلی کی یادداشتوں کے حوالے سے دی ہے ان یادداشتوں سے معلوم ہوا کہ سیکڑوں کم سن لڑکیاں اپنے درندہ صفت پتی دیو کی ہوس کا شکار ہو گئیں۔ بے شمار لڑکیاں عمر بھر کے لئے ٹولی لنگڑی ہو گئیں یا موت کے گھاٹ اتر گئیں۔ مس میو نے اپنے اعداد و شمار ہسپتالوں کے رجسٹروں سے حاصل کئے تھے۔ وہ لکھتی ہیں کہ ایک آٹھ سالہ دلہن کو بھوبھان ہسپتال میں لایا گیا۔ وہ درد کی شدت سے رات بھر اڑیاں رگڑتی رہی۔ دوسرے دن صبح اُس کا "پتی دیو" آیا اور اُسے واپس لے جانے کا مطالبہ کرنے لگا۔ ان حقائق کے انکشاف سے اقوام عالم میں کھرا مچ گیا۔ ہندوؤں نے مسز گاندھی کی قیادت میں مس میو کے خلاف محاذ قائم کر لیا۔ لیکن گرد اڑا کر حقائق پر پردہ نہیں ڈالا جاسکتا۔ اچھوتوں، بیواؤں اور کم سن دلہنوں پر جو بے پناہ مظالم ہندوؤں نے روا رکھے ہیں ان سے ہندوؤں کی ایذا کوشی اور

اخلاقی بے حسّی کا ثبوت ملتا ہے۔ اسلام میں نابالغ لڑکی کا نکاح جائز ہے لیکن اُسے بلوغت کے بعد ہی رخصت کیا جاتا ہے اور بالغ ہو کر چاہے تو اپنا نکاح منسوخ بھی کر سکتی ہے۔

میاں بیوی میں اگر موافقت نہ ہونے پر اکثر اقوام میں طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ زری معاشرے میں طلاق دینے کا حق صرف مرد کو حاصل رہا ہے۔ وہ جب چاہے اپنی بیوی کو طلاق دے سکتا ہے۔ چین قدیم میں طلاق وارد ہونے پر دہن کا جہیز اُسے واپس مل جاتا تھا۔ رومہ میں شوہر اپنی بیوی کو طلاق دے سکتا تھا لیکن بیوی شوہر کو طلاق دینے کی مجاز نہیں تھی۔ یہودیوں کے ہاں بھی طلاق کا رواج تھا لیکن جو مرد کسی غیر منسوبہ کنواری کو ورغلا کر اُس سے مقاربت کرتا، اُسے اُس لڑکی سے نکاح کرنا پڑتا تھا اور وہ عمر بھر اُسے طلاق نہیں دے سکتا تھا۔ عربوں میں تین طرح سے طلاق دی جاتی تھی۔ ظہار، ایلاء، طلاق۔ ظہار یہ کہ کوئی مرد اپنی زوجہ سے کہتا کہ تو میری ماں بہن ہے۔ ایلاء یہ کہ شوہر قسم کھاتا تھا کہ میں چھ ماہ یا ایک برس تک زوجہ کے ساتھ خلوت میں نہیں جاؤں گا۔ طلاق تین بار جدا جدا دی جاتی تھی۔ تین طلاقیں پوری ہونے سے پہلے شوہر اپنی زوجہ سے رجوع کر سکتا تھا۔ اسلام میں تین طلاق کو طلاق بتہ (کاٹنے والی) کہا گیا ہے۔ اس سے بعض کے ہاں ایک طلاق پڑتی ہے اور بعض کے ہاں تین پڑتی ہیں۔ شیخ ثانی نے فیصلہ دیا کہ تین طلاقیں بیک نشست یا بیک لفظ تین طلاقیں مانی جائیں گی۔ شوہر اپنی زوجہ سے دوبارہ رجوع کرنا چاہے تو اس صورت میں کر سکتا ہے کہ اُس کی مطلقہ کسی اور شخص سے نکاح کرے اور وہ شخص اُس کے ساتھ خلوت صحیح ہونے کے بعد اُسے طلاق دے۔ اسے حلالہ کہتے ہیں اور جو شخص ایسا نکاح کرتا ہے اُسے مستحل یا محلل کہا جاتا ہے۔ تین طلاق ایک نشست میں بائن قرار دینے میں قباہت یہ ہے کہ اس میں شوہر کو سوچ بچار کا موقع نہیں ملتا۔ وہ ایسا اوقات غیظ و غضب کے عالم میں تین طلاق دے دیتا ہے اور بعد میں پچھتائے۔ اگر رجوع نہیں کر سکتا جب تک کہ اُس کی بیوی مستحل سے نکاح نہ کرے اور اُسے طلاق نہ دی جائے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ مستحل اُسے طلاق بھی دے دے گا۔ اس مشکل سے بچنے کے لئے مہر اور ترمکی

کے اُمراء نے بد صورت غلام یا اندھے کو لے نوکر رکھ چھوڑے تھے جن سے حملے کا کام لیا جاتا تھا۔ انہیں معمولی اجرت دے دی جاتی تھی۔ اس سے ایک ضرب امثل مشہور ہو گئی کہ الف مشق ولا مستحق۔ اسی طرح بعض لوگوں میں طلاق مذاق بن کر رہ گئی۔ بلوچ اور پٹھان تین کنسکر زمین پر گراتے جلتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں یک طلاق، دو طلاق، سه طلاق۔ سمارا کے مسلمان بالک قبیلے میں شوہر اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہے تو یکے بعد دیگرے اُسے تین پان تھما دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یک طلاق، دو طلاق، سه طلاق۔ عورت غصے میں آجائے تو اپنے شوہر سے کہتی ہے ”لاؤ دے دو مجھے تین پان“۔ اس نوع کی طلاق کے خلاف بعض علماء نے سخت احتجاج کیا ہے۔ ابن تیمیہ اس کے سخت مخالف تھے۔ وہ کہتے تھے کہ سلف میں سے صحابہ کے ایک بڑے گروہ حضرات علی بن ابی طالب، زبیر بن العوام، عبدالرحمن ابن عوف، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس اور دوسرے بہت سے صحابہ کا مسلک تھا کہ ایک نشست میں تین طلاق دی جائے تو صرف ایک ہی طلاق وارد ہوگی۔ امام داؤد ظاہری کے پیروؤں اور اثنا عشری شیعہ نے بھی یہی مسلک اختیار کیا تھا۔ قاسم امین مصری کے خیال میں طلاق صرف قاضی کے روبرو اور گواہوں کی موجودگی ہی میں ہو سکتی ہے۔ اس کی نواسی با حنہ البادیہ نے روایتی طلاق کے خلاف تحریک جاری کی اور مطالبہ کیا کہ عورت کو بھی طلاق کا حق ویسا ہی ملنا چاہیے جیسا کہ مرد کو حاصل ہے۔ فی زمانہ اکثر مسلم ممالک میں طلاق کی وہی صورت رائج ہے جو عہد سعادت میں تھی۔ یعنی ایک ایک ماہ کے وقفے کے بعد طلاقیں دی جاتی ہیں اور طلاق بائن وارد ہونے سے پہلے میاں بیوی ایک دوسرے سے رجوع کر سکتے ہیں۔ اس دوران میں میاں بیوی کو سوچ بچار کا موقع مل جاتا ہے اور وہ ٹھنڈے دل سے جدا ہونے یا رجوع کرنے کا فیصلہ کر سکتے ہیں اور حملے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ طلاق کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ مرد اپنی زوجہ کو زنا کی تہمت کرے تو قاضی کے روبرو دونوں سے قسمیں لے کر تفریق کر دیتے ہیں۔ اسے لعان کہتے ہیں۔ ماقبل اسلام

کے عربوں میں عورت بھی مرد کو طلاق دے سکتی تھی۔ اس کا طریقہ یہ تھا مرد باہر جاتا تو وہ اپنے خیمے کا رخ بدل لیتی واپس لوٹنے پر مرد جان لیتا کہ عورت اُس سے جدا ہونا چاہتی ہے اور وہ علیحدہ ہو جاتا تھا۔ اسلام میں عورت کو خلع کا حق حاصل ہے لیکن اسے حاصل کرنے میں اُسے خاصی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کلیسیائے روم اور ہندومت میں طلاق ممنوع ہے جس سے بڑی قباحتیں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ میاں بیوی کو طبعی و جسمانی موافقت میسر ہو یا نہ ہو انہیں ہر صورت نبھانا پڑتی ہے۔ ہندو اس معاملے میں متشدد رہے ہیں۔ بیوہ کا سر مونڈ دیا جاتا ہے۔ اُسے پٹھے پلنے کپڑے پہنا پڑتے ہیں۔ نوجوان بیوائیں ذلت کی زندگی سے تنگ آکر اکثر قبیح خانوں کا رخ کرتی ہیں۔ کلیسیائے روم میں مرد ایک ہی عورت سے نکاح کر سکتا ہے۔ جو میاں بیوی ناموافقت کے باعث ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگتے ہیں وہ ادھر ادھر جھک مارتے پھرتے ہیں چنانچہ یورپ میں دیوتوں اور زانیوں کی بھرمار رہی ہے۔ عورتوں کی آزادی کی تحریکوں نے ہندوستان اور کیتھولک ممالک کے معاشرے کو بھی متاثر کیا ہے اور ہر کہیں طلاق کا حق عورت کو دیا جا رہا ہے۔

شادی ایک عین فطرتی ادارہ ہے جو معاشرۂ انسانی کا مرکز اور تہذیب و تمدن کا محور ہے۔ ایک نوجوان اور ایک دوشیزہ اپنی رضا مندی سے مل جل کر زندگی گزارنے کا معاہدہ کرتے ہیں جنسی ملاپ ان میں لگا لگت پیدا کر دیتا ہے۔ دونوں مل کر اپنے گھر کو سمجھاتے ہیں خوش آئند مستقبل کے خواب دیکھتے ہیں، ایک دوسرے کی پھوٹی پھوٹی خوشیوں میں شریک ہوتے ہیں، ایک دوسرے کا دکھ درد بٹاتے ہیں۔ بچوں کی پیدائش کے بعد یہ رشتہ اور بھی محکم ہو جاتا ہے۔ ان کی دل چسپی تمام تر بچوں کی پرورش اور تربیت کے لئے وقف ہو جاتی ہیں۔ وہ ایک ساتھ بوڑھے ہوتے ہیں اور بڑھاپے میں ایک دوسرے کا سہارا بن جاتے ہیں۔ غرض کہ ایک خوشگوار شادی سے زیادہ پُرسرت

لے مسیح نے کہا (میاں بیوی) دونوں ایک جسم ہوں گے۔ پس وہ دونہیں بلکہ ایک جسم ہیں اس لئے جسے خطانے جوڑا ہے اُسے آدمی جدا نہ کرے۔ (متی کی انجیل)

زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یہ مسرت جن خوش نصیبوں کو ارزانی ہوتی ہے وہ اسی دنیا میں اپنی جنت بسا لیتے ہیں۔ لیکن افسوس ہزار افسوس! دریغ ہزار دریغ! یہ جنت بہت ہی کم لوگوں کو میسر آتی ہے۔ راقم التحریر نے دو چار ہی کو اس جنت میں بٹے دیکھا ہے جب کہ اُس کے مشاہدے میں سیکڑوں ایسے میاں بیوی آئے ہیں جن کے لئے ازدواجی جہنم سے بدتر بات ہوئی ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟

لفظ شادی کا معنی ہے خوشی لیکن شادی کے ابتدائی پُر مسرت ایام اکثر و بیشتر گریز پا ثابت ہوتے ہیں اور اس ابتدائی مسرت کا تاوان عمر بھر کے کرب سے دینا پڑتا ہے۔ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے سُہرے سہنوں کے تار و پود شادی کے بعد بکھر کر رہ جاتے ہیں اور دو چار برسوں ہی میں وہ ایک دوسرے سے بے زار اور مُستغف ہو جاتے ہیں۔ حیاتیات، عمرانیات، نفسیات اور جِنس کے طلبہ نے اس عقدے کو سلجھانے کے لئے سیر حاصل بخشش کی ہیں اور قسّم قسّم کے مشورے دیئے ہیں لیکن یہ عقدہ ہے کہ سلجھنے کی بجائے روز بروز اُلجھنا جا رہا ہے۔ تہذیب و تمدن کی ترقی کے کے ساتھ ساتھ طلاقوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ امریکہ میں ہر چوتھی شادی اور فرانس میں ہر پچھٹی شادی کا انجام طلاق پر ہوتا ہے۔ حالاں کہ ان ممالک کو نئی روشنی کے منارے کہا جاتا ہے، جدید تمدن کے گہوارے سمجھا جاتا ہے۔ بعض لوگوں نے اس صورتِ حالات سے مایوس ہو کر روایتی شادی کو فرسودہ قرار دے دیا ہے اور مُبادل طریقے سوچنا شروع کر دیئے ہیں حالاں کہ مسرت انسانی اور تہذیب و تمدن کی بقا اور ارتقاء کے لئے شادی نہایت ضروری ہے کہ اس کے بغیر بچوں کو پیدا اور شفقت کا وہ ماحول نہیں مل سکتا جو اُن کی مناسب پرورش اور تربیت کے لئے ضروری ہے۔ ایسے ماحول کے لئے شادی کا پُر مسرت اور خوشگوار ہونا شرط ہے۔ جو میاں بیوی یا می کشیدگی اور نفرت کی زندگی گذارتے ہیں ان کے بچے بھی دلی مسرت سے محروم ہو جاتے ہیں اور گونا گوں اُلجھنوں میں مُبتلا ہو جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون سے عوامل و مثرات ہیں جو ازدواجی زندگی کو تلخ اور ناگوار بناتے ہیں اور وہ کون سی تدابیر ہیں جن کے اختیار کرنے سے اُسے پُر مسرت بنایا جاسکتا ہے؟

ان مسائل اور مشکلات کے تجزیے کی ابتداء ہی میں ہمیں ایک اہم حقیقت کا سامنا کرنا ہوگا اور وہ یہ ہے کہ عضویاتی اور نفسیاتی لحاظ سے مرد و عورت کی جسمانی وضع قطع، افتادِ طبع اور طرزِ ادراک و احساس میں فرق ہے۔ بے شک مرد و عورت کی جبلتیں ایک جیسی ہیں، جذبات و احساسات ایک جیسے ہیں، فطرتی میلانات ایک جیسے ہیں لیکن ان کے اظہار و تعلیقت کی صورتوں میں فرق رونما ہوتا ہے۔ یہی معاشرتی اور اقتصادی عوامل زیادہ نمایاں کر دیتے ہیں۔

جسمانی پہلو سے مرد و عورت کی نسبت زیادہ تو منہد اور جفاکش ہوتا ہے۔ اُس کے قویٰ زیادہ مضبوط اور اعصاب زیادہ توانا ہوتے ہیں۔ شہ زور ہونے کے باعث وہ مہم جو اور دلیر ہوتا ہے، شجاعت اور حوصلہ مندی کو جو ان مردی کا جوہر سمجھا جاتا ہے۔ مرد کے اعضا و جوارح میں صلابت پائی جاتی ہے۔ اس کے جسم کے خطوط اور زاویے سیدھے ہوتے ہیں۔ وہ راستہ چلتے وقت لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہے۔ بلوغت کے وقت اُس کے جسم میں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں لیکن یہ مرحلہ اُس کے لئے بالعموم کٹھن نہیں ہوتا۔ عورت کے بدن کے خطوط اور زاویوں میں گولائی اور گنڈا ہوتی ہے اُس کی چھاتیوں اور گونہوں کے ابھار اُس میں رعنائی اور دل کشی پیدا کرتے ہیں۔ اُس کی کلائی، ٹخنے، ہاتھ پاؤں مرد کی نسبت چھوٹے چھوٹے اور گلاز ہوتے ہیں۔ نرسنیوں اور رانوں کی فریبی کے باعث وہ چھوٹے چھوٹے قدم بناتی ہے اور دائرے بنا کر چلتی ہے۔ بلوغت کا مرحلہ ایک دو تیز کے لئے بڑا صبر آزما ہوتا ہے۔ وہ ایام کی آمد سے گھبرا جاتی ہے۔ ایام سے پہلے اور ان کے دوران میں وہ بے چینی اور بے قراری محسوس کرنے لگتی ہے۔ ان میں بے قاعدگی اور نامہواری پیدا ہو جائے تو اُس کے لئے پریشانی اور تکلیف کا باعث ہوتی ہے۔ مرد کو اس نوع کی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا اس لئے اُس کا مزاج زیادہ ہموار ہوتا ہے۔ مرد کی زندگی میں دو مراحل نازک ہوتے ہیں، بلوغت اور کہولت۔ لیکن عورت کو ایام کے چکر کے باعث ہر ماہ آزمائش کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک عورت نے کہا تھا ”قدرت نے ایام کی صورت میں ہمیں عمر قید کی سزا دی ہے۔“ اس پر حمل اور وضعِ حمل کی کڑیاں مستزاد ہیں۔ مرد جنسی مواصلت کے مرض پر کیشش اور

لذت بخش پہلو سے آشنا ہوتا ہے جب کہ عورت کی حفظ اندوزی کے ساتھ حمل اور وضع حمل کی اذیت وابستہ ہوتی ہے۔ وہ مہینوں بچے کو اپنی کوکھ میں لئے لئے پھرتی ہے۔ اُس کا جی اکثر خراب رہتا ہے، چہرے پر زردی کھنڈ جاتی ہے۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے نمودار ہو جاتے ہیں، چلنے پھرنے میں دقت ہوتی ہے، دردِ زہ اُسے بھنبھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ وہ راتوں کو جاگ جاگ کر بچے کی خبر گیری کرتی ہے، اُس کے چین پر اپنا چین اور اُس کی نیند پر اپنی نیند قربان کر دیتی ہے۔ مانتا اُس میں ضبط و تحمل اور ایثار و عطا کی وہ صفات پیدا کر دیتی ہے جن کا عشرِ عشر بھی مرد کو نصیب نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود مرد صدیوں سے برتری کے زعم بے جا میں مبتلا ہے۔ اس کا یہ احساس بڑی بسا اوقات ازدواجی زندگی کو تلخ کر دیتا ہے۔ جیسا کہ ہم مختصراً ذکر کر چکے ہیں کہ مادی نظامِ معاشرہ میں عورت کو مرد پر برتری حاصل تھی لیکن زرعی انقلاب کے بعد ریاست کی داغ بیل ڈالی گئی تو پدری نظامِ معاشرہ صورت پذیر ہوا جس میں مرد کو عورت پر سیادت حاصل ہو گئی۔ قانون بنانے والے مرد تھے اس لئے ایسے قوانین وضع کئے گئے جن سے مرد کی برتری کا تحفظ مقصود تھا۔ مثلاً مرد زنا کرتا تو وہ محض گناہ تھا، عورت زنا کرتی تو وہ ایک سنگین جرم بن جاتا جس کی سزا موت تھی۔ یعنی مرد قانون کی گرفت سے آزاد تھا لیکن عورت کو عبرت ناک سزا دی جاتی تھی۔ مرد خود تو سیکڑوں کینزوں سے متع کرنے کا مجاز تھا لیکن ان کینزوں کو ایک ہی مرد پر قناعت کرنا پڑتی تھی۔ اس حالت میں اُن سے کوئی لغزش سرزد ہو جاتی تو انہیں بے دریغ موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔ مرد شرمناک ہو س پرستی کے باوجود راست روی اور شرافت کا پتلا بنارہا اور عورتوں کو مجبوری کی لغزش کی بنا پر مکار، شہوت پرست، دغا باز، ہرجائی کے القاب دیئے گئے۔ عورت دشمنی کی روایت مروجہ زمانہ سے مذہب، فلسفے، اخلاقیات، عمرانیات اور ادب و فن میں بار پائی۔ یاد رہے کہ ان موضوعات پر ساری کتابیں مردوں ہی کی لکھی ہوئی ہیں۔ مثال کے طور پر ہم چند اقوال و اقتباسات ذیل میں درج کریں گے۔

\_\_\_\_\_ خُدا یا! تو نے عورت کو کیوں پیدا کیا؟ یہ چکیلا جال جو اس خورشگوار دنیا میں

ہمارا پچھا نہیں چھوڑتا۔ تو نے آدمی کو خلق کرنا ہی تھا تو ایسے عورت کے لئے سے  
اور عشق کے وسیلے سے کیوں پیدا کیا؟“ (یوری پیڈیز)

”یہ بات عورت کی سرشت میں ہے کہ وہ مردوں کو گمراہ کرے۔ وہ نہ صرف

انھوں کو درغلائی ہے بلکہ پڑھے لکھے لوگوں کو بھی نفس کا غلام بنا دیتی ہے۔“ (منو)  
”عورت کا خاصہ ہے پلنگ سے محبت، بیٹھنے کی چوکی سے محبت، زیور کا شوق،  
شہوت، غصہ، بُرائی کی جانب میلان، ضد اور اذیت رسانی سے رغبت۔“ (منو)

”عورت کا دل لگائے جیسا ہے جو جنگل میں نت نئی ہری گھاس کی ٹوہ میں رہتی

ہے۔ عورت بھی سدا بہار نئی چاہت کی تلاش میں رہتی ہے۔“ (ہنرپدیش)

”کیا عورت حقیقت میں کسی سے پیار کرتی بھی ہے؟ وہ بہ یک وقت کسی ایک

شخص سے باتیں کرتی ہے، دوسرے کی جانب نگاہ غلط انداز سے دیکھتی ہے اور

تیسرے کی یاد کو سینے سے لگائے رکھتی ہے۔“ (بھرتی ہری)

”اے بیویو! اپنے شوہروں کی ایسی تابع رہو جیسے خداوند کی کیوں کہ شوہر

بیوی کا سر ہے جیسے کہ مسیح کلیسیا کا سر ہے۔“ (پال کا خط افسیوں کے نام)

”ہر عورت کو اس بات پر شرم آتی چاہیے کہ وہ عورت ہے۔“ (ولی کلیمنٹ)

”عورت غلام سے بھی بدتر ہے۔“ (ولی ٹامس اکنوئٹس)

”عورت مرغِ بادِ نمل ہے۔“ (درجل)

”عورت سے راست روی اور دیانت کا برتاؤ کرو تو وہ تمہیں فریب دے گی

اور ہٹ دھرمی سے کام لے گی۔ عورتوں کو ہزار تحفے دو اور لاکھ پیار کرو وہ ایک

معمولی سے ناگوار لفظ پر روٹھ بیٹھیں گی۔ خود بڑے سے بڑا گناہ کر کے شرمندہ نہیں

ہوں گی اور تمہاری معمولی سی لغزش پر تمہیں مجرم ٹھہرائیں گی۔ جیسے کام لوگے

تو تنک مزاج ہو جائیں گی۔ خوشامد کرو گے تو بے وفائی کریں گی۔“ (خوشحال خان خٹک)

” — ہملت (اوقیلیا سے) تم نے شادی کرنا ہی ہے تو کسی احمق سے کرنا۔ غلط جانتے  
ہیں تم عورتیں ان کا کیا حشر کرتی ہو۔“ (شیکسپیر)

” — وَمَا كُنْتُ اَدْرِ مَا قَبْلَهَا اَنْ فِي النِّسَاءِ جَعِيْمًا اَمَّا هَا جَعْدًا وَتَدَابُجًا  
(اس سے پہلے مجھے معلوم نہیں تھا کہ عورتوں میں جہنم بھی ہوتا ہے جسے میں ظاہری انگلیوں  
سے دیکھوں اور وہ مجھے دیکھے )“

فلاسفہ میں شوپنہائر، ہاپٹ مان اور نیٹسے معروف عورت دشمن ہیں۔ انگریز فلسفی سی۔ ای۔ ایم بوڈ  
کہتے ہیں کہ میں اتنا بوڑھا ہو گیا ہوں کہ جسمانی لحاظ سے مجھے عورت کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور  
میں حیران ہوں کہ اس کے علاوہ بھی عورت کا کوئی مصرف ہو سکتا ہے۔ اُس کے الفاظ میں  
” میں عورتوں کی صحبت میں میٹھنا پسند نہیں کرتا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی  
بھی عورت ایسی نہیں ہے جس کے ساتھ میں اتنی ہی خوشی سے وقت نہ گزار سکوں  
جتنی مُسرت کے ساتھ میں کسی مرد کی صحبت میں وقت گزار سکتا ہوں۔ جب کبھی  
مجھے کسی عورت سے صحبت ہوئی اُس کی مُحببت مجھے بے حد عزیز رہی لیکن عمومی  
طور پر عورتیں اتنی اچھی رفیقہ صحبت نہیں ہوتیں۔ وہ معمولی بات پر روٹھ بیٹھتی ہیں،  
نا معلوم اسباب کی بنا پر خفا ہو جاتی ہیں اور جھگڑا لڑتی ہیں..... عورتوں کو مردوں  
کے ساتھ کھانے کی میز پر نہیں بیٹھنا چاہیے۔ اُن کی موجودگی گفتگو کا سارا لطف برکرا کر  
دیتی ہے کیونکہ وہ عامیانہ اور پامال موضوعات ہی پر بات کر سکتی ہیں۔“

اقوام عالم کی داستانوں میں عورت کے مکر و فریب کے قصے مزے لے لے کر بیان کئے گئے ہیں۔  
الفیلہ ولید، سوکا سپتتی، دکامیروں، کتھامسرت ساگر، پنج تنتر، بودھوں کی جاتاگ  
کہانیوں وغیرہ میں عورت کا نہایت شرمناک روپ دکھائی دیتا ہے۔ ان داستانوں کی عورت بدچلن ہے  
سولے ہوس رانی کے اُسے کوئی کام نہیں ہے خواہ مرد اُسے صندوق میں بند کر کے سر پر اٹھائے اٹھائے  
پھر وہ کسی نہ کسی میلے سے اپنی ہوا و ہوس کی تسکین کر لیتی ہے اور مرد کو غچہ دینے کے لئے طے

اغتراع کرتی ہے۔ سکھوں کی دسویں پادشاہی کے گزرتھ میں ایک باب ہے جس کا عنوان ہے 'استری چرتہ' اس میں عورتوں کے مکرو و فریب کی چار سو چار کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔ یہ سب کتابیں مردوں کی لکھی ہوئی ہیں جو صبح تا سچ سے عورت سے لطف اندوز بھی ہوتے رہے ہیں اور اُسے پائے حقارت سے ٹھکراتے بھی رہے ہیں۔ جب ان کے سروں پر سوس کا بھوت سوار ہو عورت ان کے لئے سراپا راحت اور آسودگی بن جاتی ہے وہ اُس کے جہاں آرا کے گیت گاتے ہیں، اُسے چاند تاروں سے پھولوں سے تشبیہ دیتے ہیں، اُس سے والہانہ محبت کا اظہار کرتے ہیں، اُس کی ایک ایک ادا پر جہاں نثار کرنے کے دعوئے کرتے ہیں لیکن اُس سے فیض یاب ہونے کے بعد بیزار ہو جاتے ہیں اور اُس کے سائے سے بھی دور بھاگتے ہیں۔ بقول شیکسپیر

”مرد اظہارِ عشق کریں تو اپریل ہوتے ہیں، شادی کے بعد دسمبر بن جاتے ہیں۔“

مرد کے اسی دو نسنے رویے نے اُسے جرم کی آنکھ میں مبتلا کر دیا ہے جس کے تحت نفس پرستی، خود غرضی، بے وفائی کے جو معائب خود اُس کی ذات میں موجود ہیں اُس نے عورت سے منسوب کر دیے ہیں۔ وہ صدیوں سے عورت کو کھلونا بنا کر اُس سے کھیلتا رہا ہے، اُس پر جبر و تشدد کرتا رہا ہے اور اس کے ساتھ احساسِ جرم سے نجات پانے کے لئے عورت ہی کو موردِ الزام ٹھہراتا رہا ہے۔ اُس نے عورت کو ذاتی املاک بنا کر حرم سراؤں میں مقید کیا اور جب کسی عورت نے اس غیر فطرتی زندگی سے نجات پانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے تو اس پر مکرو و فریب اور ہوس رانی کے الزامات عائد کئے گئے۔ صدیوں کی اس غلامی کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورت کی سیرت اور کردار مسخ ہو کر رہ گئے۔ اُسے علوم و فنون کی تحصیل سے محروم رکھا گیا، اُسے امورِ مملکت سے کوئی دل چسپی نہ رہی، وہ اپنے حقوق کے شعور اور ان کے حصول کی جدوجہد سے بیگانہ ہو گئی۔ اُس کی دل چسپیاں اندرونِ خانہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں تک محصور ہو کر رہ گئیں۔ اُس کے حوصلہ مندی اور پیش رفت کی قوت سلب ہو گئی اور اُس کی شخصیت پروان نہ چڑھ سکی۔ اس حالتِ زار و زبوں کو پہنچا کر مرد اُلٹا عورت پر طعن و طنز کرنے لگا اور اس طرح چوٹ پر تو ہمیں کا اضافہ کیا۔ مرد کا یہ رویہ بڑی حد تک آج بھی

باقی ہے اور اُس کا بر خود غلط احساس برتری ازدواجی زندگی میں زہر گھول رہا ہے۔ شوہنہار و غیرہ صاف الفاظ میں عورت دشمنی کا اظہار کرتے تھے۔ آج کل کے ارباب دانش نے زہر خند اور کلیت کا پیرایہ اختیار کیا ہے۔

”\_\_\_\_\_ عورت کے پاس سوائے اپنی ذات کے متعلق باتیں کرنے کے اور کسی کام کے لئے وقت نہیں ہوتا۔“ (آڈرس بکسلے)

”\_\_\_\_\_ جب تک عورت کا شباب برقرار رہتا ہے اسے ضمیر کی آواز پریشان نہیں کرتی۔“ (سومرسٹ مام)

”\_\_\_\_\_ عورت کا مرد کے ساتھ کھیں یہ ہے کہ تم میرا تعاقب کرو حتیٰ کہ میں تمہیں پکڑ لوں۔“ (ہوزف پیکم)

”\_\_\_\_\_ احمق وہ ہے جو شادی کرتا ہے۔ سب سے بڑا احمق وہ ہے جو احمق سے شادی نہیں کرتا۔“ (جوڈ)

”\_\_\_\_\_ عورتیں مردوں کو غوش رکھنے کے لئے لباس پہنتی ہیں اور اپنے آپ کو غوش رکھنے کے لئے اُسے اتار دیتی ہیں۔“ (لن یوٹاٹنگ)

عشق و محبت کے عالم میں مرد بالعموم بے وفائی اور طوطا چشمی سے کام لیتا ہے جب کہ عورت اپنا سارا سرمایہ حیات پیار کی بازی پر لگا دیتی ہے اور اپنے محبوب کی خاطر ننگ و ناموس، جاہ و شہمت، مال و دولت سب کچھ لٹا دیتی ہے۔ مرد حکومت اور دولت چاہتا ہے، محبت اُس کے لئے محض وقتی سی تفریح ہوتی ہے اس کے لئے وہ اپنی محبوبہ کے حسن و شباب سے حظ اندوز ہو کر نہایت سرگرمی سے اُسے ٹھکرا دیتا ہے۔ عورت حیران رہ جاتی ہے کہ کیا یہی وہ شخص ہے جس نے اُس سے عمر بھر بھانے کے قول ہمارے تھے، قسمیں کھائی تھیں، ازلی وابدی پیار کا یقین دلایا تھا۔ غرض کہ ازدواجی زندگی کی تلخیوں کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ مرد عورت کو بدستور سابق اپنی کنیز بنا کر رکھنا چاہتا ہے۔ مرد لاکھ روشن خیال ہو اُس کے ذہن کے ہناں خانے میں یہ زعم بے جا محض ہے کہ وہ

بیوی سے برتر ہے۔ اُس کے خیال میں اُس کی زوجہ کی زندگی کا واحد مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے شوہر کی دل جوئی میں لگی رہے، اُس کی خدمت میں جُتی رہے۔ پوریشیا نے تمام عورتوں کے جذبات کی ترجمانی کی تھی جب اُس نے اپنے شوہر بروٹس سے کہا تھا۔

”بروٹس! مجھے بتاؤ کہ تمہاری منگو جو ہو کر میں کیوں تمہاری ہم راز نہیں بن سکی۔“  
 ”کیا میرا مصروف ہی ہے کہ میں کھانے میں تمہارے ساتھ شرکت کروں یا بستریں  
 تمہیں منگو نہ پاؤں یا کبھی کبھار تم سے بات کر لیا کروں۔“

کیا میرا فرض یہی ہے کہ ہمیشہ تمہارے اشارہ چشم و ابرو پر رقص کرتی رہوں۔

اگر اس سے زیادہ کا حق مجھے نہیں تو پوریشیا بروٹس کی داشتہ ہے اُس کی

بیوی نہیں ہے۔

جدید عورت مرد سے برابری کی مدعی ہے اور اپنے حقوق کے لئے کشمکش کر رہی ہے۔ مرد سے برابری کا یہ دعویٰ اور اپنے حقوق کا شعور مرد پر بہت گھٹتا ہے۔ مرد جان گیا ہے کہ اُس کا صدیوں کا تسلط ختم ہونے والا ہے جسے برقرار رکھنے کے لئے وہ ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ چنانچہ آج کل کے اکثر پڑھے لکھے گھرانوں میں اس کشمکش نے ازدواجی زندگی کو بد مزہ کر دیا ہے۔ جب تک مرد عورت کا اصل مقام دل و جان سے قبول نہیں کرے گا یہ کشمکش جاری رہے گی۔

عشق و محبت کے بارے میں مرد اور عورت کا نقطہ نظر بھی بعض اوقات شادی شدہ زندگی کو مسموم کر دیتا ہے۔ جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے مرد کے لئے محبت ایک وقتی سی تفریح ہوتی ہے جب کہ عورت کے لئے ایک مستقل قدر کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ عمر کے ہر مرحلے پر عظیم محبت کی تمنا کرتی ہے، اُسے ہمہ وقت اپنے شوہر کے پیار، التفات اور دل سوزی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ شادی سے پہلے جوان لڑکیاں اپنے ذہن و قلب میں ایک مثالی چاہنے والے کا تصور بسا لیتی ہیں اور بڑی حسرت سے اپنے خوابوں کے شہزادے کا انتظار کرتی ہیں۔ جب وہ آتا ہے تو اُسے تمام مردانہ محاسن کا

عمر سمجھ لیتی ہیں اور وہ ان کی روزِ خوابی کا میرو بن جاتا ہے۔ مشرقی ممالک میں جہاں نوجوان لڑکوں لڑکپوں کو ملنے جلنے کی عام آزادی نہیں ہوتی، لڑکی اپنے منگیترے خاوندِ محبت کرنے لگتی ہے۔ شادی کے بعد یہ خواب حقیقت بن جاتے ہیں۔ لیکن افسوس کہ چند ہی مہینوں میں یہ طلسم پاش پاش ہو جاتا ہے اور وہ ایک ناگوار جھٹکے سے دوبارہ حقائق کی دنیا میں واپس آ جاتے ہیں۔ اندر سے موردِ لکھتا ہے۔

”محبت اپنے پھینچن ہی میں مر جاتی ہے۔ اسے ترقی تازہ اور بحال رکھنے کے لئے بڑی احتیاط اور مسلسل کوشش کی ضرورت ہوتی ہے۔ ابتدا میں دو چاہنے والوں کو ایک دوسرے کی ذات میں نئی نئی باتیں دکھائی دیتی ہیں۔ دونوں کے پاس عنفوانِ شباب کی یادیں ہوتی ہیں۔ اجنبی اشخاص کے قصے ہوتے ہیں، گانے کے لئے نئے نئے گیت ہوتے ہیں، ننانے کے لئے نئی نئی کہانیاں ہوتی ہیں لیکن افسوس کہ یہ ذخیرہ جلد ہی ختم ہو جاتا ہے اور وہ کہانیاں جو شروع شروع میں بڑی مزے دار لگتی تھیں اب اگتاہٹ کا سبب بن جاتی ہیں پھر دونوں کی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی نیا آدمی ملے جسے یہ کہانیاں اور یہ باتیں دوبارہ سنائی جاسکیں۔“

دن رات کا قرب محبت کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ ہر وقت کے قرب کے باعث محبت اُنس میں اور اُنس بے زاری میں بدل جاتا ہے عشق و محبت کا مرکزی نقطہ بقول کسانو نامعلوم کوشش ہے۔ ابتدا میں نوجوان لڑکوں کو ایک دوسرے کی ہستی بڑی پراسرار دکھائی دیتی ہے وہ آرزو پروردگی کے تحت ایک دوسرے کو اپنے ذاتی تخیلات اور توقعات سے منتصف کر دیتے ہیں۔ ایک دوسرے کے لب و زبیر، آنکھوں، بالوں، مسکراہٹ اور اندازِ گفتگو میں نامعلوم کوشش محسوس کرتے ہیں لیکن دن رات کا قرب ان گھروندوں کو شکست دینے لگتا ہے، ان پر ایک دوسرے کی خامیاں اور کوتاہیاں ظاہر ہونے لگتی ہیں جس سے لطفِ محبت بکرا ہوا جاتا ہے، نگاہیں بے کیف ہو جاتی ہیں اور باتوں کا لمس بے اثر ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایک سم ظریف نے کہا ہے کہ شادی ایسا رومان ہے جس کا میرو پہلے باب ہی میں مر جاتا ہے۔ میاں بیوی تجدیدِ محبت کی لاکھ کوشش کریں بات نہیں بنتی۔ ایسن نے کہا

ہے کہ ایک شوہر کا اپنی بیوی سے انہارِ محبت کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ پالتو مرغی کا شکار کھیلنا۔  
خارج پسند ہونے کے باعث مرد کی دل چسپیوں کا دائرہ وسیع ہوتا ہے جب کہ عورت کی تمام تر  
دل چسپیاں شوہر اور بچوں کی ذات ہی تک محدود ہوتی ہیں۔ وہ شادی کے ابتدائی ایام کو یاد کر کر کے  
آہیں بھرتی ہے اور شوہر سے اُس کی مرد مہری کی شکایت کرتی ہے۔ عورت جان لیتی ہے کہ اُس کا شوہر  
بدل گیا ہے اور اب کبھی بھی اُس سے پہلی سی پُر جو شس محبت نہیں کر سکے گا۔ ایک عورت نے اپنے  
نفیاتی علاج سے کہا تھا۔

”میرا شوہر میرا بوسہ اس طرح لیتا ہے جیسے وہ اپنی بہن کا بوسہ لے رہا ہو۔“

مرد اپنی اکتاہٹ اور بے زاری کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ بہت کم مردوں میں برٹنڈرسل کی  
سی جڑت ہوتی ہے کہ وہ بر ملا اپنی مرد مہری کا اعتراف کر سکیں۔ رسل لکھتے ہیں۔

”ایک دن سہ پہر کے وقت میں سائیکل پر جا رہا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ میں اپنی  
بیوی ایلس سے محبت نہیں کرتا..... جب تک میں اور ایلس ایک کمرے میں رہے  
وہ رات کو شبِ خوابی کے لباس میں میرے پاس آتی اور میری منت سماجت کرتی کہ  
میں رات اُس کے ساتھ گزاروں۔ بعض اوقات میں مان جاتا لیکن نتیجہ کچھ بھی نہ نکلتا۔  
یہ صورتِ حالات نو برس تک قائم رہی۔ ان برسوں میں وہ میری محبت کو جیتنے کی  
کوشش کرتی رہی اور کسی دوسرے مرد کی طرف مائل نہ ہوئی۔ میں نے بھی اس  
دوران میں کسی دوسری عورت سے جنسی تعلق قائم نہ کیا۔ میں سال میں دو بار اپنی  
بیوی سے دیکھنے و صحبت ادا کرنے کی کوشش کرتا رہا تاکہ اُس کی کچھ تالیفِ قلب  
ہو جائے لیکن میرے لئے اُس کی ذات میں کچھ بھی کشش باقی نہ رہی تھی۔ میری  
کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔“

شادی کا المیہ یہی ہے کہ عورت پیار بیگانے کی کوشش کرتی ہے، شوہر سے محبت کئے جاتی ہے

لیکن اُس کی محبت کو جیتنے میں ناکام رہتی ہے۔ عورت چاہتی کہ اُس کا شوہر دومان پسند ہو، ایثار پسند ہو، دوسروں کے جذبات کا احترام کرتا ہو۔ بد قسمتی سے اکثر مرد انانیت کے پتھے ہوتے ہیں اور اپنی بیوی کو سچا پیار نہیں دے سکتے۔ عورت اپنے شوہر کی بے رخی اور بے اعتنائی سے دل برداشتہ ہو جاتی ہے اور اُس کے تغافل کو اعتنا میں بدلنے کے لئے کبھی اپنی حلاوت کا ڈھونگ رچاتی ہے اور کبھی جان بوجھ کر اُسے اشتعال دلاتی ہے۔ مرد شکایت کیا کرتے ہیں کہ عورتیں کسی نہ کسی مرض کا بہانہ کرتی رہتی ہیں یا فضول غریبی سے انہیں قرض کے جال میں جکڑ دینا چاہتی ہیں یا طعنوں، مہمنوں سے ان کا ناک میں دم کر دیتی ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ عورتیں یہ سب کچھ اُن کا التفات اور محبت حاصل کرنے کے لئے کرتی ہیں۔ اُسے پیار میسر ہو تو جھگڑا کرنے یا بیماری کا ڈھونگ رچانے یا پیچھے چلانے کا عنوان ہی باقی نہیں رہتا۔ ایک دفعہ ایک عورت نے اپنے شوہر کو سخت اشتعال دلایا۔ شوہر نے دھکے دے کر اُسے گھر سے نکال دیا۔ وہ اپنی ایک سہیلی کے ہاں گئی اور اُس سے پوچھا کہ تمہارے ساتھ بھی کبھی ایسا ہوا ہے۔ سہیلی نے نفی میں جواب دیا تو وہ بولی ”اِسے آزما دیکھو اِس خاوند کو خوب مشتعل کرو۔ ایسے شخص کا سامنا کرنا جو جوش غضب میں دیوانہ ہو رہا ہو، جس کے مُنہ سے جھاگ اڑ رہا ہو، جو چیخ و پکار کر بے تحاشا گالیاں بک رہا ہو، اُن کا یہ منظر کیسا شاندار ہوتا ہے؟“ ظاہر ہے کہ یہ عورت محروم محبت تھی اور شوہر کو مُنعفّت کرنے کے لئے یہ نالک رچاتی تھی۔ ملا دی مالک خاص طور پر بلقان کی ریاستوں میں بیوی کو پٹینا لوازم محبت میں خیال کیا جاتا ہے۔ جس بیوی کو اس کا شوہر کبھی کبھار پیچھے وہ سمجھتی ہے کہ اب وہ اُس سے پیار نہیں کرتا۔ ایک عورت نے فرائد کو بتلایا تھا ”میرے شوہر نے کئی دنوں سے مجھے نہیں پٹیا شائد اب وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا۔“ گویا مرد کے ہاتھوں پٹینا اُس کے تغافل سے بہتر ہے۔ ظاہر ہے کہ اِسے پیٹنے کے بعد مرد پشیمان ہوگا، بیوی کی تالیفِ قلب کرے گا اور لڑائی جھگڑا اُٹکیے، پر طے ہو جائے گا۔ جو میاں بیوی شادی سے زیادہ توقعات والبتہ نہیں کرتے وہ مایوسی سے بھی محفوظ رہتے ہیں۔ ایک خاتون میلا پراپ کا قول ہے ”شادی کی زندگی میں نفرت اور محبت دونوں

ہی ختم ہو جاتی ہیں لہذا شادی کا آغاز تھوڑی سی نفرت سے کرنا چاہیے۔ ”نفرت سے شادی کا آغاز کرنے کا مشورہ تو خیر نہیں دیا جاسکتا اتنا ضرور صحیح ہے کہ ”دوامی عشق“ اور ”ادلی وابدی محبت“ کی توقعات رکھنے والے زیادہ کرب ناک مایوسی سے دوچار ہوتے ہیں۔

جنسی پہلو سے شادی ایک ایسا معاہدہ ہے جس پر ہر دولہا اور دلہن اکٹھی بند کر کے قفل کر دیتے ہیں۔ مورس پوسکونے کہا ہے ”بہترین حالات میں بھی شادی جوا ہوتی ہے۔“ ایک صاحب نے استدلال کیا ہے ”شادی ایک ادارہ ہے، شادی محبت ہے، محبت اندھی ہوتی ہے، لہذا شادی اندھوں کا ادارہ ہے، دولہا اور دلہن نہیں جانتے کہ وہ ایک دوسرے کو کامل حفظِ فاضل بخش سکیں گے کہ نہیں۔ یہ مسئلہ مرد کی نسبت عورت کے لئے زیادہ اہم ہے کیوں کہ جنسی پہلو سے مرد کی کوتاہ ہمتی کا افعال زیادہ ہوتا ہے۔ وہ دلہن جس کا دولہا شبِ عروسی کو کوتاہ ہمت نکلے، زندگی بھر عذاب جھیلی رہتی ہے۔ شبِ عروسی شادی کی زندگی میں بڑی اہم ہے۔ مغرب میں اس کی اہمیت ختم ہو چکی ہے کیونکہ بقول کہنے وہاں کی اسی فیصلہ لڑکیاں شادی سے پہلے ہی دھڑنگی سے محروم ہوتی ہیں۔ مغرب کے مرد بھی بکارت کو چند لڑا اہمیت نہیں دیتے۔ مشرقی ممالک میں بکارت کی توقع کی جاتی ہے۔ دولہا دلہن جنسی معلومات سے بے بہرہ ہوں تو وہ شبِ عروسی سے کما حقہ لطف اندوز نہیں ہو سکتے بلکہ بعض اوقات گونا گوں الجھنوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ پنجاب کے دیہات میں کہا جاتا ہے کہ شبِ عروسی ہی کو اس بات کا فیصلہ ہو جاتا ہے کہ مرد زنِ فرد ہو گا یا عورت اس کی تابع ہو گی۔ ایسے دولہا بھی ہوتے ہیں جو رات بھر بٹرنے لگتے ہیں اور دلہن کے پاؤں پڑنے لگتے ہیں اور ایسے بھی ہوتے ہیں جو دندے کی طرح جھپٹ پڑتے ہیں اور دلہن سوچتی رہ جاتی ہے کہ یہی تھی وہ شادی جس کے سنہرے خواب اس نے دیکھے تھے اور یہی ہے وہ شخص جسے اس نے اپنے سپنوں میں بسا رکھا تھا۔ بالکل کے لئے یہ دقت بڑی آزمائش کا ہوتا ہے۔ وہ جنسی مواصلات کے بارے میں متحسّس بھی ہوتی ہے اور اس سے خوف بھی کھاتی ہے۔ جنسیاتی نفسیات کی اصطلاح میں اسے ”بکارت کی کنوئیں“ کہتے ہیں۔ اس نے اپنی سہیلیوں سے بہت کچھ سُن رکھا

ہوتا ہے اور وہ ذہنی طور پر جنسی ملاپ کے لئے تیار بھی ہوتی ہے لیکن وہ چاہتی ہے کہ اُس سے اظہارِ محبت کیا جائے، اُس کے کانوں میں پیار بھری باتوں کا رس گھولا جائے، اُس کے حُسن و جمال اور لباس کی تعریف کی جائے، اُس سے بھانے کے ہمدردیاں کئے جائے تاکہ وہ ایک اجنبی کی نفسانی خواہش کے سامنے بھگنے پر مجبور نہ ہو بلکہ اپنے آپ کو ایک مخلص حیوانِ ساتھی کے سرِ ذکر کرے۔ وہ اپنی شہرہ کی کو احسان کا رنگ دینا چاہتی ہے۔ نسوانی حیا کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اُس کا احترام کیا جائے اور اُسے ایک بارگی پاؤں تلے چل کر نہ رکھ دیا جائے۔ اس سے دلہن کی لطافتِ احساس کو ٹیس لگتی ہے اور بعض اوقات وہ غم بھر کے لئے اپنے شوہر سے متفرق ہو جاتی ہے۔ تحلیلِ نفسی کے دوران میں عام طور سے عورتیں مرد کے ناروا و وحشیانہ سلوک کی شکایت کرتی ہیں۔ ایک خاتون نے اپنے نفسی معالج کو بتلایا: ”میرا شوہر مجھ سے یوں مقاربت کرتا ہے جیسے وہ سوٹ کیس میں کپڑے ٹھونس رہا ہو“ ایک خاتون نے کہا ”میرا بدن اپنے شوہر کے لئے پریڈ کا میدان بن گیا ہے۔“ ایک اور خاتون نے تحلیلِ نفسی کے وقت کہا ”میرا شوہر دروازہ کھولنے کی بجائے اُسے توڑ کر اندر گھسنے کی کوشش کرتا ہے۔“ شادی کی رات کو دُلہا غلوں، شائستگی اور رواداری سے کام لے تو وہ اپنی دلہن کا دل ہمیشہ کے لئے جیت سکتا ہے۔ مرد کو اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ عورت کی جنسی خواہش اور اس کے اپنے نفسانی اظہار اور اظہار میں بڑا فرق ہوتا ہے مرد مقاربت کے لئے بے ساختہ تیار ہو جاتا ہے جبکہ عورت کو مساس اور ملاعت سے آمادہ کرنا پڑتا ہے کیوں کہ نفسانی حفظِ اُس کے سارے جسم میں پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ ہویلاک ایس عورت کی جنسی خواہش کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

”۱۱۔ عورت کی خواہش مرد کی جنسی خواہش کی بہ نسبت زیادہ خفی ہوتی ہے۔ (۲)

اُس کی خواہش زیادہ پیچیدہ ہوتی ہے۔ اس میں اتنی برجستگی نہیں ہوتی جتنی مرد کی خواہش میں ہوتی ہے، یہ دیر سے ابھرتی ہے اور تدریجاً نقطہ غروج کو پہنچتی ہے

(۳) عورت کی خواہش جنسی ملاپ کے باقاعدہ اور استوار ہونے کے بعد زیادہ قوی ہو جاتی ہے۔ (۴) یہ خواہش عورت کے جسم کے اعضاء میں زیادہ پھیلی ہوئی ہوتی ہے اس لئے اس کا حلقہ اثر زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ (۵) اس کی خواہش ہموار اور یکساں نہیں ہوتی بلکہ مہینے کے مختلف ایام میں گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔“

ایام عروسی میں اکثر نوجوان کثرت سے کام لیتے ہیں عورت بھی اس کی عادی ہو جاتی ہے اور اپنے شوہر سے اسی نوع کی توقعات وابستہ کر لیتی ہے بعد میں مرد ان توقعات کو پورا نہ کر سکے تو وہ بے دل ہو جاتی ہے اسے دہم ہو جاتا ہے کہ شاید اُسے مجھ سے محبت نہیں رہی۔ اس لئے مناسب ہوگا کہ شروع ہی سے اعتدال سے کام لیا جائے۔ اعتدال برتا جائے تو صحت پر خوشگوار اثر پڑتا ہے۔ قوی مضبوط اور اعصاب توانا ہوتے ہیں، دماغ روشن اور عزم بیدار ہوتا ہے، جب کہ کثرت مرد کو نہ حال کر دیتی ہے۔ اس کا نظام عصبی مایوس ہو جاتا ہے۔ عورت مرد کی طرح منزل نہیں ہوتی۔ اس کی اندام بھائی سے ایک قسم کے سیال مادے کا اخراج ضرور ہوتا ہے لیکن یہ نقامت کا باعث نہیں ہوتا۔ اسی بنا پر کسٹوا کہتا ہے۔ ”جہاں تک جنسی ملاپ کا تعلق ہے، مرد کی بہ نسبت عورت زیادہ توانا ہوتی ہے۔“

زردشت نے کہا ہے کہ مرد اپنی عورت کے پاس ہر نویں دن خلوت میں جائے سونگہ کھتا ہے کہ مہینے میں تین بار جنسی ملاپ کرنا مناسب ہے۔ تالمود میں ہے کہ ایک عالم کو سہتے میں ایک بار اور ایک مزدور کو دو بار جنسی ملاپ کرنا مناسب ہے۔ ملکہ زفریہ اپنے شوہر کو مہینے میں ایک بار مقاربت کی اجازت دیتی تھی۔ کوئٹہ نے کہا ہے کہ سہتے میں دو بار ملاپ کرنا مناسب ہے لیکن اس کے بارے میں کوئی قاعدہ کلیہ وضع نہیں کیا جاسکتا۔ اس بات کا تعلق مرد کی جسمانی ساخت اور صحت سے ہے۔ بریکسٹون لکھتی ہے کہ ان کی ایک سہیلی نے انہیں بتایا کہ اس کا شوہر دن رات میں تین بار اُس سے مقاربت کرتا ہے اور یہ سلسلہ سال ہا سال سے جاری ہے۔ دوسری طرف میری سٹوپس نے ایک شخص کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ دو سال میں ایک بار مقاربت کرتا تھا اور اُس کی بیوی مطمئن تھی۔ میری سٹوپس نے مشورہ دیا ہے کہ جب عورت کی نفسانی خواہش عروج پر ہو یعنی ایام کے آغاز سے پہلے اور فرا

کے بعد تو تین چار دن متواتر مقاربت کی جائے اس کے بعد دس دن کا وقفہ دیا جائے۔

دوہا کو یہ بات یاد رکھنا ہوگی کہ مساس اور ملاحت ایک فنِ لطیف ہے جس سے بہرہ ور ہونا ضروری ہے۔ بالزک نے سچ کہا ہے کہ عورت ایک ایسا برہم ہے جس کے تاروں سے کوئی ماہر فن ہی دلکش ٹرس نکال سکتا ہے۔ شبِ عروسی کو خوش آئند یا ناگوار بنانے کی ذمہ داری دوہا پر عائد ہوتی ہے۔ اس موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرائد نے کہا کہ جو شخص احسن طریقے سے دو شیزہ کا ازالہ بکارت کرتا ہے وہ عمر بھر اس کی ممنون احسان رہتی ہے اور اس کی یاد کو عزیز رکھتی ہے۔ وین۔ وی۔ ویلڈ نے ایک میاں بیوی کی زندگیوں کو محض اس لئے تباہ ہوتے ہوئے دیکھا کہ وہ جنسی ملاپ کے بارے میں مناسب معلومات نہیں رکھتے تھے۔ ان کے لڑکے انجام سے متاثر ہو کر اس نے ولندیزی زبان میں اپنی مشہور کتاب ”مثالی شادی“ لکھی جس کا ترجمہ دنیا بھر کی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اس کا مطالعہ ہر میاں بیوی کے لئے ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ڈاکٹر میسرے سٹوپس کی کتابوں کا مطالعہ بھی مناسب ہوگا کہ ان میں عورت کے نقطہ نظر کی وضاحت کی گئی ہے۔

جنسیات کے طلبہ اس بات پر متفق ہیں کہ شادی کی کامیابی یا ناکامی اور ازدواجی زندگی کی مسرت یا الم ناک کا انحصار بڑی حد تک میاں بیوی کی جنسی اور عضویاتی موافقت یا نا موافقت پر ہوتا ہے۔ جنسی موافقت ازدواجی زندگی کو چٹان کی بنیاد مہیا کرتی ہے جس کے متزلزل ہونے کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ جنسی موافقت میسر ہو تو میاں بیوی با مسرت زندگی گزارتے ہیں۔ چھوٹی موٹی رنجشیں یا روزمرہ کی معمولی بد مزگیاں از خود رفع ہو جاتی ہیں جس عورت کی بھرپور نفسانی تشفی ہوتی رہے وہ اپنے شوہر کی کوتاہیوں اور عیوب سے صرف نظر کر لیتی ہے۔ عورت کا میرو وہی ہے جو اسے کامل حقیقت بخشتا ہے۔ اس کے سامنے وہ تمام مردوں کو مچ سکتی ہے اور ساری عمر اس کے

لے IDEAL MARRIAGE لے ORGASM لے اٹالوسی میں اسے

GLORIA کہتے ہیں۔ قدام اسے SPASME GENETIQUE کہتے تھے۔

ساتھ ہنسی خوشی بتا دیتی ہے۔ جنسی موافقت ہو تو میاں بیوی کے کردار میں ثبات اور طبائع میں  
 حکمی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہیں، ایک دوسرے کی عزت کرتے ہیں تاکہ  
 دوسرے کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کو مستعد ہوتے ہیں۔ وہ دوسروں سے بھی نرم روی،  
 موانست اور ہم دردی کا سلوک کرتے ہیں۔ وہ اچھے دوست، اچھے باپ اور اچھے شہری ثابت  
 ہوتے ہیں۔ ان کی شادی ایک طویل زمانہ بن جاتی ہے۔ وہ کبھی جذباتی یا طلاق کا نام نہیں لیتے۔ وہ  
 با وفا ہوتے ہیں اور عمر بھر ایک دوسرے سے بچھلتے ہیں، انہیں ایک دوسرے کی صحبت میں بھرپور  
 انسانی اور جذباتی آسودگی میسر آ جاتی ہے اس لئے وہ کسی غیر مرد یا غیر عورت کی جانب معلقیت نہیں  
 ہوتے۔ ایسے خوش نصیبوں کی اولاد بھی بیدار بخت ہوتی ہے۔ اس پر سکون ماحول میں پلنے ٹھہنے  
 والے بچے خوش باش ہوتے ہیں۔ زندگی کے بارے میں ان کا زاویہ نگاہ رجائی ہوتا ہے۔ ان میں اعتماد  
 نفس، حوصلہ مندی اور مہم جوی کی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔

ہمارے دور کے علمائے جنسیات کہتے ہیں کہ بھرپور جنسی موافقت بہت ہی کم عورتوں مردوں  
 کو از رائی ہوتی ہے۔ عضویاتی نا موافقت، جنسی ملاپ کی تکنیک سے ناواقفیت، جنس سے وابستہ  
 احساس گناہ، جنس کے خلاف صدیوں سے راسخ شدہ تعصبات، مردوں کی کوتاہ دہمی، عورتوں کی  
 سرد مہری کے باعث اکثر لوگ با مسرت جنسی زندگی سے محروم رہتے ہیں۔ بعض میاں بیوی جنسی لحاظ  
 سے پوری طرح صحت مند ہونے کے باوجود جنسی ملاپ کی تکنیک سے بے بہرہ ہونے کے باعث  
 پوری طرح حفظ اندوز نہیں ہو سکتے اور گونا گوں غلط فہمیوں اور اندیشوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اکثر  
 مرد مقابرت کو ایک طرفہ کاروائی سمجھتے ہیں۔ انہیں اپنے حفظ سے غرض ہوتی ہے اور یہ نہیں جانتے کہ  
 کہ جب تک وہ فریق ثانی کو پوری طرح محفوظ نہیں کریں گے وہ خود بھی بوجہ احسن فیض یاب نہیں  
 ہو سکیں گے۔ جس طرح آدمی دوسروں کو خوش کر کے ہی حقیقی خوشی سے بہرہ یاب ہو سکتا ہے  
 اسی طرح مرد فریق ثانی کو پوری طرح محفوظ کر کے ہی کما حقہ لذت یاب ہو سکتا ہے۔ یاد رہے  
 کہ مرد اور عورت کی جنسی خواہش کے اظہار اور تادیر چرھاؤ میں فرق ہے۔ عورت کی جنسی خواہش دیر

سے بیدار ہوتی ہے لیکن ایک دفعہ جھڑک اٹھے تو اتنی تیز و تند ہوتی ہے کہ آسانی سے اُس کی تسکین نہیں کی جاسکتی۔ مرد ایک بار مقاربت کر کے مطمئن ہو جاتا ہے لیکن عورت اکثر اوقات نا آسودہ رہتی ہے اور اُس کی خواہش بجالا رہتی ہے۔ مرد فارغ ہوتے ہی سو جاتا ہے لیکن نا آسودہ عورت دیر تک جاگتی رہتی ہے۔ چنانچہ وہی مرد عورت کی بھرپور تشفی کر سکتا ہے جو ایک تو طویل جنسی ملاپ پر قدرت رکھتا ہو اور دوسرے مسائل اور ملاعبت کا فن لطیف جانتا ہو۔ عورتوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ طویل جنسی ملاپ انہیں بیش از بیش حفظِ بخشش ہے اور وہ اُس مرد سے پوری طرح فیض یاب ہوتی ہیں جس کی قوت فراغت کے بعد فوری طور پر بحال ہو جائے۔ ہر مرد کا ایک قدیم تعصب یہ بھی ہے کہ عورت کا جنسی حفظ اندوزی کا اظہار کرنا نسوانی حیاء کے منافی ہے۔ اس تعصب سے خائف ہو کر اکثر عورتیں کامل سپردگی سے قاصر رہتی ہیں لیکن انہیں اس بات کا اندیشہ لاحق رہتا ہے کہ انہوں نے محفوظ ہونے کا اظہار کیا تو مرد انہیں ”جنسی پٹریں“ سمجھنے لگیں گے۔ ظاہر ہے کہ عورت مرد کا ایک کھلونا ہی نہیں ہے بلکہ اُسے بھی حفظِ نفسانی سے بہرہ یاب ہونے کا فطرتی حق حاصل ہے۔ جدید دور کی عورت محسوس کرتی ہے کہ حفظِ نفسانی کے لفظِ عروج کو پہنچنا اُس کا حق ہے جس سے مرد اُسے محروم نہیں کر سکتا۔

میکسم ڈیوی لکھتی ہیں:

”عورت کو اپنے شوہر کو صاف صاف بتا دینا چاہیے کہ اُس کی بھرپور جنسی تشفی

بے حد ضروری ہے اور وہ کوئی نیم دلائل تسکین قبول نہیں کرے گی۔“

وگٹوریہ کے عہد میں جو عورت جنسی ملاپ میں دل چسپی یا حفظِ اندوزی کا اظہار کرتی تھی اسے نا آسودہ بے میا اور کسبی کے القاب دیے جاتے تھے۔ اس زمانے کی ایک حکایت مشہور ہے کہ ایک دواہما تجلیدِ عرسی میں داخل ہوا تو اُس نے دیکھا کہ دہن کلور د فام سونگھ کر پلانگ پر بے ہوش پڑی ہے اور بستر پر ایک کاغذ رکھا ہے جس پر لکھا ہے ”امی کہتی ہیں کہ تم جو چاہو کر سکتے ہو“

THE SEXUAL RESPONSIBILITY  
OF WOMEN.

ڈاکٹر میری سٹوڈنٹس نے عورت کو اُس کے جنسی حقوق دلانے کے لئے سخت جدوجہد کی تھی۔ وہ لکھتی ہیں کہ

”لارڈ ایکس نے بڑی تلخی سے کہا کہ میں نے ’اندوہی عشق‘ میں عورتوں کو حفظ و وصال کی طرف توجہ دلائی ہے۔ انہوں نے کہا یہ آپ نے کیا غضب کیا، عورتوں کو وہ باتیں بتا دیں جو صرف کبھی کو معلوم ہوتی ہیں ان باتوں کے علم سے ہماری عورتیں مردانگی بن جائیں گی اور مردوں کی زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ عورتوں کو گھر کے قلم و نسق سے غرض ہونی چاہیے۔ جب ہمیں نفسانی محفوظی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو ہم کبھی کے یہاں جاتے ہیں۔ آپ کی باتوں سے عورتیں جنسی چڑچڑاہٹ بن جائیں گی اور ان کے جنسی مطالبات کی کوئی حد و غایت نہ رہے گی۔ گھر دوزخ کے نمونے بن جائیں گے اور مرد عورتوں کے اس نوع کے مطالبات پورے نہیں کر سکیں گے۔ لارڈ ایکس کی ان باتوں سے مرد کی خود غرضی عیاں ہے کہ وہ خود تو نفسانی لذت کے حصول کے لئے کبھی کے پاس جاتا ہے اور اپنی عورتوں کو حفظِ نفسانی سے محروم رکھتا ہے۔“

مردوں کے لئے یہ جانتا بھی ضروری ہے کہ عورت کی نفسانی خواہش اور مزاج پر ایامِ اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ اس لئے اُس میں ’اتار چڑھاؤ‘ ہوتا رہتا ہے۔ ایام کے شروع ہونے سے پہلے کے چند روز اور فراغت کے بعد کے ہفتے میں عورت کی نفسانی خواہش عروج پر ہوتی ہے۔ ان دنوں میں وہ سراپا الفتاقت ہوتی ہے یہ دن گزر جائیں تو وہ سرد مہر ہو جاتی ہے۔ اسی بنا پر عشاق اور شاعر عورت کی متلون مزاجی، بے رخی، سرد مہری کا رونا رو تے رہے ہیں۔ پنج مقرر میں ہے

”عورت کی طبیعت کا تلون جیسے سمندر کی موجیں، اُس کے جذبات بے ثبات

جیسے شفق کے بادلوں کی سُرخی۔“

عشق جہان ہوتے ہیں کہ چند روز پہلے ان کی محبوبہ سراپا لطف و کرم تھی اور آج نگاہ غلط انداز سے دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتی۔ عرنی ہے

ازان بہ دردِ دگر ہر زمان گرفتارم کہ شیوہ ہائے تُرا با ہم آشنائی نیست  
 فرادہ جیسے صاحب بصیرت نے عورت کی جنسی زندگی کو تاریک براعظم کہا ہے اور اُسے معمور قرار دیا ہے۔ حالاں کہ بات سیدھی سی ہے اور اس میں کوئی انجوجی نہیں ہے۔ عورت کا التفات اور اُس کا رنگ مزاج اُس کے ایام پر منحصر ہے۔ لاطینی شاعر آدوڈ فطرت نسوانی کے اس پہلو کا رمز آشنا تھا۔ اُس نے اپنی نظم دفنِ عشق بازی، میں کہا ہے کہ اگر تمہاری محبوبہ تمہارے ساتھ سرد مہری کا برداؤ کرے تو حوصلہ نہ مارو، ثابت قدم رہو ایک نہ ایک دن وہ بالفردہ تمہاری جانب ملتفت ہوگی۔ شوہر کے لئے اس حقیقت کا شعور لازم ہے کہ اس کے بغیر وہ اپنی زوجہ کی چشمِ شوق کی زبان سمجھنے سے قاصر رہتا ہے اور بعض دفعہ ایسی حالت میں اُسے مقابرت پر مجبور کرتا ہے جب کہ وہ سرد مہر ہوتی ہے۔ صاحب تبریزی نے کہا تھا۔

کس زبان چشمِ خوبان را نمی فهمد چو من روزگار سے این غزالان را بشانی کہ وہ ام  
 زبان چشمِ خوبان کا یہ فہم شوہر کے لئے ضروری ہے۔ عورت بسا اوقات نگاہ غلط انداز سے، تبسمِ زیر لب سے، نیا لباس پہن کر، شوہر کے لئے اُس کا مرغوب کھانا پکا کر، اشاروں کنیوں میں پیار کی دعوت دیتی ہے۔ جو مرد ان اداؤں کو سمجھتے ہیں وہ عمر بھر ایامِ عروسی کے لطف و ذوق کو برقرار رکھ سکتے ہیں۔ تاہمیت کی عورتیں نفسانی خواہش محسوس کریں تو وہ اپنے دائیں کان میں سرخ پھول اڑس لیتی ہیں اور اس طرح دعوتِ وصال دیتی ہیں۔ انموس کہ مہذب معاشرے کی عورتیں اتنی حقیقت پسند نہیں ہو سکیں۔

جنسی موافقت پیدا کرنے کے لئے ملاعبت کے طریقوں کے علاوہ آسنوں کا وقوف بھی لازم ہے۔ ایڈلر کہتا ہے کہ معروف آسن اُس زمانے سے یاد گار ہے جب عورت مرد کی لونڈی بن کر

رہتی تھی۔ ڈاکٹر میری سٹوپس کہتی ہیں کہ اس آسن میں مرد جلد فارغ ہو جاتا ہے اس لئے اسے ترک کر دینا اُنسب ہے۔ عرب بھی اسے ناقص قرار دیتے ہیں۔ یونانیوں، چینیوں، عربوں، ہندوؤں اور جاپانیوں کے جنسی ادب میں بیسویں آسن گنائے گئے ہیں اور ان کی تشریح کی گئی ہے۔ فور برگ نے اپنی کتاب میں نوے آسنوں کا ذکر کیا ہے جو یونان قدیم اور روم میں مروج تھے۔ بلیان مل نے ۲۲ اور شیخ نغزادی نے ۲۵ آسن دیئے ہیں جن میں بعض بڑے پیچیدہ اور تکلیف دہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ شیخ نغزادی نے مشورہ دیا ہے کہ فریق ثانی کی رضامندی کے ساتھ مختلف آسن آزمائے جائیں جس آسن کو وہ پسند کرے اُسے مستقلاً اختیار کر لیا جائے۔ یہ مشورہ نہایت قابلِ قدر ہے۔ قد و قامت، لاغری و فربہ، اعضاء کی بناوٹ اور بدن کی خصوصیت کے پیش نظر موزوں آسن اختیار کیا جاسکتا ہے۔ دین ڈی ویڈ نے تیرہ آسن منتخب کئے ہیں جو زیادہ تر کلیساں مل اور شیخ نغزادی سے ماخوذ ہیں۔ اُس نے بھی یہی مشورہ دیا ہے کہ جس آسن سے فریق ثانی کی بھرپور تسخیر ہو اُسے اختیار کر لیا جائے۔ بلیان مل لکھتا ہے۔

”شادی شدہ مرد اور عورت کی جدائی اور مرد کے دوسری عورتوں سے رجوع لانے

اور عورت کے دوسرے مردوں کے پاس جانے کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ وہ مختلف آسنوں سے کام نہیں لیتے اور اگتا دینے والی یکسانیت کے شکار ہو جاتے ہیں۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ میاں بیوی کے جھگڑوں اور ان کے اسباب کو بخوبی ذہن نشین کر لینے کے بعد میری سوچی سمجھی ہوتی رائے یہ ہے کہ مرد مختلف آسنوں سے کام لے کر اپنی زوجہ سے بیس مختلف عورتوں کے ساتھ خلوت میں جانے کا حظ اٹھا سکتا ہے کہ اس سے اگتا ہٹ اور یکسانیت کا سد باب ہو جاتا ہے۔“

اٹالوی شاعر ارمیس نے سولہ آسن قلم کئے تھے جن کی تصویریں ایک مقصود نے بنائی تھیں لیکن ان میں کچھ اکثر جنسی کج روی پر دلالت کرتے ہیں جنسی موافقت کے لئے مناسب آسنوں کا اختیار کرنا ضروری ہے

کہ اس سے عورت بھی نفسانی حظ اندوزی میں برابر کی شریک ہو جاتی ہے۔

جنسی ناموافقیت ازدواجی زندگی کے لئے زہرِ مہل سے کم نہیں ہے۔ میاں بیوی کے آئے دن کے لڑائی بھگڑے، چڑچڑاہٹ، آشفۃ طبعی، زودرنجی، جسمانی امراض اور نفسیاتی الجھنوں کی تہ میں اکثر و بیشتر یہی ناموافقیت ہوتی ہے۔ فرائڈ کہتا ہے کہ ایک ضیافت میں وہ اپنے اُستاد ڈاکٹر شارکو کے پاس کھڑا تھا۔ شارکو اپنے ایک رفیقِ کار سے ایک نوجوان شادی شدہ جوڑے کے متعلق باتیں کر رہا تھا۔ شارکو کا خیال تھا کہ ذہنِ عصبی المزاجی اور خبطِ حواس کی مریضہ تھی کیوں کہ اُس کا شوہر کوتاہِ ہمت تھا۔ مخاطب حیران ہو کر بولا ”شوہر کی جنسی کوتاہی ہمتی کا اُس کی بیوی کی عصبی المزاجی سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔“ اس پر شارکو کہنے لگا ”اس نوع کے امراض کی تہ میں ہمیشہ ہمیشہ، ہمیشہ جنسی سبب ہی ہوتا ہے۔“ فرائڈ کہتا ہے کہ وہ شارکو کا یہ جملہ کبھی نہیں بھلا سکا۔ فرائڈ کا اپنا سوچا سمجھا ہوا عقیدہ یہ ہے کہ ہمارا جنسی عمل ہماری ساری زندگی کو ایک خاص نہج پر موڑ دیتا ہے جو مرد کوتاہِ ہمت ہوتے ہیں ان کی بیویاں عصبی المزاجی، تشویش کی الجھن، ہسٹریا وغیرہ میں مبتلا ہو جاتی ہیں اور اپنے آپ کو دائم المرض سمجھ کر ڈاکٹروں کے پیچھے بھاگتی پھرتی ہیں۔ فِلِس بوٹوم لکھتی ہیں کہ ”الفرڈ ایڈلر کی ایک بچا زاد بہن مشورے کے لئے آئی اور کہنے لگی مجھے شدید دردِ سر لاحق رہتا ہے۔ ایڈلر نے کہا محض دردِ سر کبھی نہیں ہوتا کیا تمہیں یقین ہے کہ تمہاری بیاہتا زندگی میں تو کوئی گڑبڑ نہیں ہے؟ اس پر وہ خاتون غصے میں پیچ و تاب کھاتی ہوئی چلی گئی۔ اس کے ایک ماہ بعد اُس نے طلاق کے لئے عدالت میں درخواست دے دی۔“

ہسٹیریا سے بحث کرتے ہوئے یونانی طبیب بقراط لکھتا ہے کہ جنسی فاقہ زدہ عورت کا ذہنی توازن قائم نہیں رہ سکتا۔ وہ کہتا ہے کہ عورت کے جسم کا اہم ترین عضو ہسٹیر (رحم) ہے۔ رحم مرد کے عضو کے اتصال سے محروم رہے تو عورت خللِ ذہن میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اسی حالت کو ہسٹیریا کہتے ہیں۔

عربوں نے ہسٹریا کا ترجمہ بجا طور پر اختناق الرحم کیا تھا۔ بقرط کی دیدہ وری قابلِ داد ہے کہ آج اگر ڈاکٹر ہسٹریا کی یہی تشخیص کر رہے ہیں، لیکن اور بالزہیڈ کے خیال میں ہسٹریا کے اسباب دو ہیں۔ ۱۔ بھرپور جنسی تشفی سے محرومی۔ ۲۔ مثالیاتی احساس کی جراثیم۔ ایک دوشیزہ کے ذہن میں اپنے ہونے والے شوہر کا مثالی تصور ہوتا ہے۔ شادی کے بعد اُسے پیار کرنے والا اور جنسی تسکین کرنے والا شوہر نہ مل سکے تو اس کے تصور کو ٹھیس لگتی ہے اور وہ خللِ ذہن میں مبتلا ہو جاتی ہے جنسی مواصلت میں ایک نوع کا جمالیاتی احساس بھی مشمول ہو جاتا ہے جو بعض مردوں کی ٹھس حیوانیت سے مجروح ہو جاتا ہے۔ جو مرد کسبیوں کے پاس جاتے ہیں ان کا جنسی طرز عمل بھی جمالیاتی احساس سے عاری ہو جاتا ہے۔ اسے سچی محبت اور خلوص ہی سے برقرار رکھا جاسکتا ہے۔

مرد کی کوتاہ ہمتی کے باعث اکثر عورتیں جھگڑاؤ، سرکہ جیس اور زوداشتغال ہو جاتی ہیں اور ہر وقت، ہر بات، ہر طریقے سے ہر شخص سے الجھنے لگتی ہیں۔ وہ خود غم زدہ ہوتی ہیں اور نئے دو مردوں کو بھی چین سے بیٹھے نہیں دیتیں۔ عام طور سے جنسی ناموافقت کا سبب مرد کی کوتاہ ہمتی ہوتی ہے اس کی دو صورتیں ہیں۔ ۱۔ نامردی۔ ۲۔ سرعتِ انزال۔ نامردی کی کئی قسمیں ہیں بعض مرد پیدائشی عین ہوتے ہیں بعض کسی حادثے کے باعث قوتِ رجولیت سے محروم ہوتے ہیں بعض مردوں کے مادہ منویہ میں کرم حیات نہیں ہوتے اگرچہ وہ جنسی ملاپ پر قادر ہوتے ہیں۔ سدِ رجولیت میں مداومت کرنے والے بھی خیرشس سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ خوف، تشویش اور اعتمادِ نفس کا فقدان بھی مرد کو عورت کے ناقابلِ بنادیتا ہے۔ اسے نفسیاتی نامردی کہتے ہیں۔ جنسی کوتاہ ہمتی کی عام صورت سرعتِ انزال ہے جو مرد کو شدید احساسِ کمتری، مریضانہ حساسیت، غصی المزاجی اور تشویش کی الجھن میں مبتلا کر دیتی ہے اور اس کے ساتھ اُس کی بیوی کی زندگی بھی اجیرن ہو جاتی ہے۔ کئے اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے۔

”شائد تین چوتھائی مرد مقاربت کے دو منٹ بعد منزل ہو جاتے ہیں عورتیں جو اکثر

لے لفظ SEX کا مادہ AESTHETICS میں ہے۔ جمالیاتی احساس جن کا لازمی عنصر ہوتا ہے۔

و بیشتر نامساعد حالات میں جنسی زندگی گزارتی ہیں دس پندرہ منٹ کی ترغیب و ملاجعت کے بعد نفسانی حظ کے نقطہ عروج کو پہنچ جاتی ہیں۔ ایسی بے شمار عورتیں ہیں جنہیں عمر بھر اس نقطہ عروج کا علم تک نہیں ہوتا۔ عورت کو جنسی حظ کی غایت تک پہنچانے کے لئے مرد کا غیر معمولی طور پر قوی ہونا اور مقابرت کو غیر معمولی طوالت دینا لازم ہے؛

ڈاکٹر یو سیس چمیر کے خیال میں پچھتر فیصد عورتیں بھرپور جنسی آسودگی سے محروم ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر ولیم سٹیکل کہتا ہے کہ بہ مشکل چار فیصد عورتیں جنسی حظ کی انتہا کو پہنچ پاتی ہیں۔ یہ اعداد و شمار مغربی ممالک سے لئے گئے ہیں جہاں سرعت انزال کا مرض و باکی صورت اختیار کر گیا ہے۔ ایشیا اور افریقہ میں بھی بے پناہ عورتیں شوہروں کی سرعت انزال کے باعث جنسی مسرت سے محروم رہتی ہیں۔ علمائے جنسیات کی تحقیق کے مطابق نوے فیصد طلاقیں کی تہہ میں مردوں کی کوتاہ ہمتی ہی ہوتی ہے۔ عورتیں طلاق لینے کے لئے عجیب و غریب بہانے بناتی ہیں۔ کوئی کہتی ہے کہ میرا شوہر میرے جذبات کی قدر نہیں کرتا، کوئی اُس پر ذہنی اذیت دینے کا الزام لگاتی ہے اور کوئی اُس کی بے وفائی کا ردِ ناز کرتی ہے لیکن اصل وجہ اکثر وہی ہوتی ہے کہ وہ شوہر کی سرعت انزال سے نالاں ہوتی ہیں۔ آج کل فروغی اسباب کے پردے اٹھ گئے ہیں۔ فرانس، اطالیہ، سویڈن اور امریکہ میں عورتوں نے طلاق کی درخواستوں میں صاف صاف لکھنا شروع کر دیا ہے کہ شوہر ان کی جنسی تشفی کرنے سے قاصر ہے کیوں کہ وہ وقت سے پہلے فارغ ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر ولیم سٹیکل لکھتا ہے کہ

”مردوں میں جنسی کوتاہ ہمتی روز افزوں ہے۔ نامردی جدید تہذیب کا کمر شمشہ ہے۔ ہر نامرد محبت کے المیے کا مرکزی کردار بن جاتا ہے کیوں کہ نامرد شے شادی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس سے عورت کی صحت تباہ ہو جاتی ہے اور شوہر اور بیوی دونوں کے ذہن و قلب پر اس کے اثرات نہایت ضرر رساں

ہوتے ہیں۔ آدھے مردوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ میرے خیال میں مہذب  
اشخاص میں یہ مشکل سچا پس خیصلد پورے مردوں کے۔

مہربت انزال کے مرخصوں کی بیویاں طلاق لے لیتی ہیں یا ادھر ادھر بھگ مارتی پھرتی ہیں۔ نا اسو  
عورت اپنے تخیل میں کسی غیر مرد کو بسا لیتی ہے اور اُس کے وصال کے تصور میں کھوٹی رہتی ہے  
ہیو بلاک ایس نے کہا ہے کہ عورت کو جنسی حظ اندوزی کا پورا حق حاصل ہے۔ نامردوں یا آدھے  
مردوں کی بیویاں اس حق سے محروم ہو جاتی ہیں اور کسبیاں بن کر رہ جاتی ہیں جو بغیر رغبت  
کے محض نان نفقہ کی خاطر ایک ایسے مرد کی خلوت میں جاتی ہیں جو ان کی جنسی تسکین نہیں کر سکتا  
اور جس سے وہ دل ہی دل میں نفرت کرتی ہیں۔ یہ تکلیف دہ عمل بار بار دہرایا جائے تو عورت  
کے اعصاب تباہ ہو جاتے ہیں اور وہ زندگی ہی سے بیزار ہو جاتی ہے۔ سب سے زیادہ قابلِ رحم  
حالت اُس عورت کی ہوتی ہے جو شرم و حیا کے باعث یا معاشرے کے طعن و طنز کے خوف سے طلاق نہیں  
لیتی اور اندر ہی اندر گھل گھل کر نیم جان ہو جاتی ہے۔

عورت کی سرد مہری بھی زندگی کو نا خوشگوار بنا دیتی ہے لیکن بسا اوقات اس سرد مہری کی  
نتیجہ میں مرد کی کوتاہ ہمتی ہی ہوتی ہے۔ جب ایک کوتاہ ہمت بابر کی کوشش کے باوجود اپنی بیوی  
کی جنسی تشفی سے قاصر رہتا ہے تو وہ لاشعوری طور پر سرد مہر ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی مرد  
اپنی بیوی سے بد سلوکی کرے، اُس کے جذبات کا احترام نہ کرے، دوسری عورتوں سے بر ملا  
کرتا پھرے تو بیوی مقاربت میں سرد مہری سے کام لیتی ہے یہ گویا اُس کا انتقام ہوتا ہے۔ ان  
مردوں کی بیویاں بھی سرد مہر ہو جاتی ہیں جو مساس اور ملائمت کے فن سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔  
اور بیوی کی جنسی خواہش کو پوری طرح اُبھارے بغیر مقاربت کرتے ہیں۔ بعض عورتیں شادی کے  
ابتدائی ایام میں جنسی حظ محسوس نہیں کرتیں اور پہلے بچے کی پیدائش کے بعد ہی اس سے بہرہ  
یاب ہوتی ہیں۔ علمائے نفسیات کہتے ہیں کہ جب تک جنسی خواہش میں مامتا کا جذبہ مشمول نہ ہو عورت

لے اصطلاح میں اسے HETAERAL PHANTASY کہتے ہیں۔

حفظِ کامل سے محروم رہتی ہے۔ تیس اور چالیس برس کی عمر کے درمیان عورت کی نفسانی خواہش مڑج پر ہوتی ہے۔ اکثر مرد اس مغالطے میں مبتلا ہوتے ہیں کہ دو چار بچے پیدا ہونے کے بعد عورت کی جنسی خواہش میں زوال آجاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بڑھاپے میں بھی عورت کی جنسی خواہش برقرار رہتی ہے۔ شہزادی میترنج سے کسی نے پوچھا ”عورت کی جنسی خواہش کس عمر میں ختم ہو جاتی ہے“ اُس نے جواب دیا ”میں کیا جانوں میری عمر تو صرف ۶۵ برس کی ہے۔“ ایک جاپانی عالم نے کہا ہے کہ عمر کے بڑھنے کے ساتھ بیوی کے مطالبات بدستور قائم رہتے ہیں جب کہ مرد کی توانائی بحال نہیں رہتی۔

اس مقام پر مرد کے ایک تاریخی تعصب کا ذکر مناسب ہوگا۔ مرد اپنی زوجہ سے کڑی عفت کی توقع رکھتا ہے لیکن خود ادھر ادھر جھک مارنے کو اپنا فطری حق سمجھتا رہا ہے۔ یہ تعصب آج بھی باقی ہے۔ سوڈان، وسطی افریقہ کے قبائل میں لڑکی کی بکارت کے تحفظ کے لئے اُس کی اندامِ نہانی میں ٹانکے لگا دیئے جاتے ہیں جو شادی کے دن کھولے جاتے ہیں۔ اس کا رواج مہذب اقوام میں بھی رہا ہے۔ عورتوں کو عصمت کی آہنی پیشیاں پہنانے کا رواج فلورنس سے شروع ہو کر ۱۵ ویں صدی تک سارے یورپ میں پھیل گیا۔ انہیں فونیس کی پیٹی کہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ عفت شوہر اور بیوی دونوں پر لازم ہے۔ شوہر اس سے آزاد ہوگا تو بیوی سے اس کی پابندی کرنا قرین انصاف نہیں رہے گا۔ کامیاب اور بامسرت ازدواجی زندگی گزارنے کے لئے میاں بیوی دونوں کا باوقار رہنا لازم ہے۔ جس بیوی کو یہ معلوم ہو کہ اس کا شوہر کسی غیر عورت سے معاشرہ کر رہا ہے، اُس کے اعتمادِ نفس کو ٹھیس لگتی ہے۔ اُسے اپنی کششِ جمال پر شبہ ہونے لگتا ہے اور یہ خیال اُسے تنہا لگتا ہے کہ دوسری عورت اُس سے زیادہ خوبصورت ہوگی۔ باہمی مسرت کی خاطر میاں کے لئے بیوی کی طرح باعصمت رہنا ضروری ہے کہ بدلے ہوئے حالات اور عدل و انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے۔ ایک پاکیزہ مرد ہی اپنی زوجہ سے عفت کی توقع رکھ سکتا ہے۔ مرد کی ایک تاریخی غلط فہمی یہ بھی ہے کہ

حاملہ جنسی خواہش محسوس نہیں کرتی۔ حقیقت یہ ہے کہ حاملہ اپنے بچے کے باپ کی طرف زیادہ کشش محسوس کرتی ہے اور اُس سے مقابرت کی خواہاں ہوتی ہے۔ البتہ حمل کے چھ مہینے کے بعد مقابرت ضرور ساں ثابت ہو سکتی ہے۔

آج کل پڑھے لکھے طبقے کے افراد شادی سے گریز کرنے لگے ہیں۔ نوجوان عورتیں اور مرد حصولِ تعلیم اور وجہِ معاش کے چکر میں شباب کا بہترین حصہ تجربہ میں گزار دیتے ہیں جب ان کی عمر ۲۵ برس سے تجاوز کر جاتی ہے تو وہ ازدواجی زندگی کی ذمے داریاں قبول کرنے سے بھی چرانے لگتے ہیں جب کہ بلند معیارِ معیشت کے نام پر اہل مغرب شادی سے بے زاری کا اظہار کرتے ہیں۔ شادی سے گریز کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جب نوجوان دیکھتے ہیں کہ معمولی وجہ کی بنا پر دھوا دھڑھلاقیں دی جا رہی ہیں اور گھروں میں ازدواجی مسرت کا فقدان ہے تو وہ شادی سے بدظن ہو جاتے ہیں۔ عیاش عورتیں اور مرد شادی کو اپنی تفریحات اور مشاغل کے راستے میں روک ٹوک سمجھ کر اس دور بے گناہ میں ایک حسین ایکڑِ لیس فرماتی ہیں

”میں شادی نہیں کروں گی کیوں کہ مجھے تین با وفا دوستوں کی رفاقت میسر ہے جو

شوہر کے نعم البدل ہیں۔ پہلا کتا جو صبح سے شام تک غوغا کرتا ہے، دوسرا طوطا

جو سارا دن گایاں بکاتا ہے، تیسرا ملا جو رات گئے دیر سے گھر آتا ہے۔“

ہمارے معاشرے میں شادی سے گریز کا رجحان حال ہی میں نمود پذیر ہوا ہے اور زیادہ تر پڑھی لکھی خواتین میں ملتا ہے جو اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ ان کا مسئلہ معاشی نہیں نفسیاتی ہے۔ معاشی لحاظ سے وہ خود مکنتی ہوتی ہیں اور یہ سمجھتی ہیں کہ شادی کے بعد ان کی آزادی سلب ہو جائے گی۔ مجھے کئی ایسی خواتین سے بات کرنے کا اتفاق ہوا ہے جو تیس بیٹیاں کی پونجی ہیں لیکن شادی نہیں کرتیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ترجیح دیتی ہیں جب کہ اس نوع کے نوجوان بالعموم کم تعلیم یافتہ مگر زیادہ خوبصورت لڑکیوں کو ترجیح دیتے ہیں جن پر وہ اپنی برتری جتا سکیں۔ انہیں یہ اندیشہ لاحق ہوتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت سے شادی کی تو وہ ان کے اشد چشم پر رقص نہیں کئے

گی۔ ایک مجرّد نوجوان نے راقم سے کہا کہ جو لڑکی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو اور پچیس پچیس کی ہو چکی ہو ایک تو وہ خوبصورت نہیں ہو گی کیوں کہ عیسائی لڑکیوں کو افسر لوگ میڈک یا ایف اے کی جامتوں ہی سے انچک لیتے ہیں اور دوسرے اس بات کا قویٰ امتناں ہوتا ہے کہ وہ اپنی دوشیزگی کھو چکی ہوں کیوں کہ پچیس برس کی عمر تک باکرہ رہنا اُس کے الفاظ میں معجزہ سے کم نہیں ہوگا۔ میں نے اُسے بتایا کہ بعض پاک باز لڑکیوں کی بکارت کھیل کود میں ضائع ہو جاتی ہے لیکن وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ ایک امریکی نوجوان سے باتیں کرتے ہوئے راقم کو معلوم ہوا کہ وہ شادی کے سخت خلاف تھا۔ اُس کے ذہن میں ایک مثالی بیوی کا تصور تھا جو صفات اُس نے مثالی بیوی کی گناہیں ان سے مفہوم ہوتا تھا کہ وہ ایک عودت میں پانچ عورتوں کی تلاش کر رہا ہے۔ میں نے کہا شادی کا جنسی پہلو ہی سب کچھ نہیں ہوتا انسان کی پدری اور مادری حیثیتوں کی تسکین بھی ضروری ہے۔ جس شخص کے ہاں بچہ نہ ہو وہ بے رحم، غریب اور قابو پی ہو جاتا ہے اور جو عورت مانتا سے محروم رہے وہ ساری عمر غم زدہ رہتی ہے۔ امریکی نوجوان بولا آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن میں کسی یتیم بچے کو اپنا لے پاؤں بناؤں گا اور اپنے پدری جذبے کی تسکین کر لوں گا۔ میں نے کہا ہر نوجوان اسی طرح سوچنے لگا تو تمہاری نسل معدوم ہو جائے گی۔ اس پر وہ چپ ہو رہا۔ ایک دن ایک کنواری خاتون لیکچر نے شادی کے موضوع پر بات کرتے ہوئے راقم سے کہا یہ دنیا مصائب کا گھر ہے۔ اپنے حظ نفس کی خاطر میں بچے پیدا کر کے کیوں انہیں مصائب و آلام کی دنیا میں دھکیل دوں۔ گفتگو کے دوران میں راقم نے کہا جب آپ پچاس ساٹھ برس کی ہو جائیں گی اور ماں باپ بچے چکے سوں گے تو اس اتھاخ خوفناک تہائی اور اگتہٹ کا سامنا کیسے کر سکیں گی؟ جو آپ کو چاروں طرف سے گھنٹھو اندھیرا بن کر گھیرے گی۔ بچے مانتا ہی کی تسکین نہیں کرتے بلکہ بڑھاپے کا سہارا بھی بن جاتے ہیں۔ اس پر وہ سوچ سوچ کر کہنے لگیں شاید آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں لیکن ایک بات اور بھی ہے۔ جو لوگ مجھ سے شادی کرنے کے آرزو مند ہیں ان کی نظر میری تنخواہ پر ہے۔ میں نے کہا آپ شائستہ، پڑھی لکھی، خوش شکل ہیں۔ ایک پڑھے لکھے، کھاتے پیتے نوجوان کے لئے آپ کی تنخواہ کی نسبت آپ کی ذات زیادہ کشش

ہوگی۔ اس پر وہ بولیں سب مرد خود غرض اور ہوس پرست ہوتے ہیں، مجھے مرد کی ذات ہی سے نفرت ہے۔ پھر خفیہ ہو کر کہنے لگیں میری مراد آپ جیسے بزرگوں سے نہیں ہے بلکہ نوجوانوں سے ہے۔ راقم اطراف نے کہا آپ تجرد کی جو بھاری صلیب اٹھا رہی ہیں اس سے آپ کے کندھے ٹکستے ہو جائیں گے اور یہ صلیب عمر بھر اٹھانا پڑے گی۔ وہ ہنس کر بولیں میرے کندھے خاصے مضبوط ہیں۔ میں نے کہا افسوس کہ یہ کندھے ہمیشہ اتنے مضبوط نہیں رہیں گے۔ آخر میں وہ کہنے لگیں، میں حسوس کر رہی ہوں کہ میرے پاس آپ کے دلائل کا کوئی معقول جواب نہیں ہے لیکن بات یہ ہے کہ میں کسی مرد کی — کی محکوم ہو کر نہیں رہ سکتی آپ جانتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں مرد اپنی زوجہ کو سماجی حقوق دینے پر آمادہ نہیں ہے۔ اس پر بات ختم ہو گئی۔

تجرد کی زندگی غیر فطری ہے اور ظاہراً غیر فطری چیز با مسرت نہیں ہو سکتی۔ فطرت کے خلاف چلنے کا سخت تاوان دینا پڑتا ہے جنسی جبلت کی قبر مانی سے کسی صورت بھی پچھا پھڑایا نہیں جا سکتا کہ یہ اپنے اظہار کے لئے کوئی نہ کوئی راہ تلاش کر ہی لیتی ہے۔ فطری طریقے سے اس کا اظہار نہیں ہو گا تو غیر فطری طریقے اختیار کرنا پڑیں گے۔ اسے دبانے کی کوشش کی جائے تو آدمی خلل ذہن کا شکار ہو جاتا ہے اور تشویش کی الجھن، عصبی المزاجی اور مایوسی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جنسی انحرافات میں پناہ لی جائے تو جرم کی الجھن لاحق ہو جاتی ہے۔ مرد کسبیوں کے پاس جاتے ہیں یا سدومیت اور خود کاری سے رجوع لاتے ہیں۔ عورتیں معاشرے کرتی ہیں یا ہم جنسی اقلات اور خود لذتی کا سہارا لیتی ہیں۔ میں نے دو لیکچر خواتین کے بارے میں سنا ہے کہ ان میں لڑکیاں تعلق ہے مجرور لہذا اوقات جنس زندہ ہوتے ہیں، سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے نا آسودہ جنسی خواہش کا بھرت ان کے اعصاب پر سوار رہتا ہے۔ اس قسم کی کسی عورت سے کوئی بھی مرد بات کرے، وہ اس واقعے میں مبتلا ہو جاتی ہے کہ یہ مجھ سے معاشرے کرنا چاہتا ہے۔ اسی طرح کسی مجرور سے کوئی عورت مخاطب ہو تو وہ سوچنے لگتا ہے کہ یہ مجھ پر عاشق ہو گئی ہے۔ ایک مجرور نے مزاحاً راقم

اطراف سے کہا میں سوتا ہوں تو میری خواہش ہوتی ہے کہ کاش کمرے کی چھت پھٹ پڑے اور ایک پرسی و شش نازنین پکے ہوئے پھل کی طرح میرے بستر میں آگرے۔ پال ولی نے بھی جو تجرد کا حامی تھا یہ کہہ کر حقیقت پسندی کا ثبوت دیا تھا کہ "جلتے رہنے سے شادی کرنا بہتر ہے"۔  
تجرد مردوں عورتوں کے لئے زہر ہے۔ خاص طور سے عورت کی زندگی کا بہت بڑا امیتہ ہے۔ وہ بڑھاپے کی آمد سے لہزاں و ترساں رہتی ہے اور اُسے اپنی تنہائی اور بے بسی کا غم لھٹے جاتا ہے۔ میں ایک معزز گھرانے کی ایک خاتون کو جانتا ہوں جس نے ساری عمر گزارنے میں گزار دی تھی کیوں کہ اُس کا منیگتر اوائل شباب میں فوت ہو گیا تھا۔ وہ بڑھاپے میں عورتوں سے کہا کرتی تھی "شادی نہ کر کے میں نے سخت غلطی کی، اپنے آپ پر ظلم کیا، ایسی کرب ناک زندگی گزارنے سے بہتر تھا کہ میں دنیا کے بدترین مرد سے شادی کر لیتی، کبنا اپنے سوانح میں لکھتا ہے۔

"میں نے شادی نہیں کی کیوں کہ ایک عورت سے وابستگی مجھے پسند نہیں تھی لیکن اب یہی خود مختاری میرے لئے غلامی بن گئی ہے۔ اگر میں نے ایک ہوشیار عورت سے شادی کی ہوتی جو مجھے اپنے قابو میں رکھ سکتی تو میری دولت محفوظ رہتی، میرے ہاں بچے پیدا ہوتے اور میں بڑھاپے کی تنہائی اور افلاس سے محفوظ رہتا۔"

تجرد سے بحث کرتے ہوئے میری معنی زندگی، کا مصنف لکھتا ہے۔

"متوسط یا اعلیٰ طبقے کی جو نوجوان عورتیں اپنی دوشیزگی کو محفوظ رکھتی ہیں اس سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی قدر و قیمت میں اضافہ کر سکیں۔ بس اوقات وہ وقت پر شادی نہیں کر پاتیں اور گونا گوں نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتی ہیں کیوں کہ عالم شباب میں حفظ نفسانی سے محرومی سخت اندیشہ ناک اور فرار رساں ہے۔ وہ خود کاری سے کام لیتی ہیں لیکن خود کاری جتنی ملاپ کا بدل نہیں بن سکتی۔"

جنسی ملاپ کے بغیر عورت کی بھرپور نفسانی تسکین نہیں ہو سکتی۔ ان کے برعکس وہ غریب عورتیں زیادہ آسودگی کی زندگی گزارتی ہیں جو جنسی ملاپ سے بلا تکلف فیض یاب ہوتی ہیں۔“

شادی کا حامی ہونے کے باوجود راقم الحروف کے خیال میں بعض مردوں اور عورتوں کو شادی نہیں کرنا چاہیے۔ میری مراد ان مردوں اور عورتوں سے ہے جو مزمن جسمانی عوارض میں مبتلا ہوں یا نفسیاتی لحاظ سے شادی کے ناقابل ہوں۔ ہیپوٹائک ایس کہتا ہے کہ زہاد، فلاسفہ، فن کار اور عیاش شادی کے قابل نہیں ہوتے۔ انہیں اوائل شباب ہی سے اس بات کا علم ہو جانا چاہیے کہ وہ شادی کی ذمہ داریاں نہیں سنبھال سکیں گے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ لوگ اپنی بیویوں کے لئے جذبات بن جاتے ہیں اور اپنے بچوں کی مناسب تربیت کرنے کے اہل نہیں ہوتے۔ یہ رائے شاید صداقت سے خالی نہیں ہے۔ گیلیلو، نیوٹن، لائب نٹز، کانٹ، افلاطون، ابقورس، فلاطینوس اور شوپن ہائر مجرّد تھے۔ سب نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی جب اُسے دوسری شادی کرنے کو کہا گیا تو اُس نے جواب دیا ”کوئی شخص بیک وقت ایک اچھا شوہر اور ایک اچھا فلسفی نہیں بن سکتا۔“ لیکن نے تاریخ بہبوط و زوالِ روم لکھنے پر کمر باندھی تو اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور کہا کہ اس کے لکھنے میں مجھے کئی سال لگ جائیں گے اور انہماک کے باعث میں تمہارے حقوق ادا نہیں کر سکوں گا۔ بڑے بڑے فلاسفہ اور فن کاروں پر استغراق اور تخلیقی شورش اس قدر غالب ہوتی ہے کہ ان کی ساری قوتیں تفکر و تعمق پر مرکوز ہو کر رہ جاتی ہیں اور وہ اپنی بیوی کی تالیفِ قلب اور بچوں کی تربیت سے غافل ہو جاتے ہیں۔ جن عظیم فلاسفہ اور فن کاروں نے شادی کی اور ان کی ازدواجی زندگی المیہ بن کر رہ گئی۔ سقراط، سعدی، غالب، بامرن، بالزاک، لیوناسٹا کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ عیاش ڈان لیوان بھی اچھے شوہر ثابت نہیں ہوتے نہ اچھے باپ بن سکتے ہیں۔ انہیں اپنی ہوا ہو جس سے غرض ہوتی ہے اس لئے وہ بیوی بچوں سے تغافل برتتے ہیں۔ ان کی بے راہ روی بیوی کے جذبات کو مجروح کر دیتی ہے جس سے وہ سرد مہر ہو

جاتی ہے۔ ڈان یوان اس سر و مہری کو بہانہ بنا کر غیر عورتوں کے پیچھے بھاگتے پھرتے ہیں۔ ان کی زندگی کا مقصد واحد نفسانی لذت کا حصول ہوتا ہے اور وہ لطافتِ احساس سے قطعی بے بہرہ ہوتے ہیں۔ 'ازلی بچے' بھی شادی کے ناقابل ہوتے ہیں۔ 'ازلی بچہ' نفسیاتی پہلو سے ساری عمر نابالغ رہتا ہے اور اپنی بیوی کے لئے بلائے بے درماں بن جاتا ہے۔ وہ بیاہا ہوا مجرد ثابت ہوتا ہے۔ وہ اپنی بیوی میں ماں یا نوکرانی کی تلاش کرتا ہے اور اسے مساویانہ حیثیت دینے پر آمادہ نہیں ہوتا اس کے علاوہ ایسے نوجوان جو اوائلِ شباب میں کئی سال تک بکثرت و تواتر جلتی لگاتے رہیں پورے مرد نہیں بن سکتے نہ ان کے اعضاءے تناسل نشوونما پا سکتے ہیں جس کے سبب وہ فریقِ ثانی کی تشقی نہیں کر سکتے۔ وہ مستقلاً ذکاوتِ حس اور سرعتِ انزال میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ نیم حکیم اور عطائی ماہرین طب یونان و چین و فرانس انہیں جوان مرد بنانے کے نام پر دونوں ہاتھوں سے ٹوٹتے رہتے ہیں۔ اس قسم کے آدمے مردوں کے ہاں اولاد بھی ہو سکتی ہے لیکن وہ فریقِ ثانی کی بھرپور جنسی تسکین پر قدرت نہیں رکھتے۔ ان میں اور ان کی بیویوں میں وہ عضوِ بآلی اور جنسی موافقت پیدا نہیں ہو سکتی جو شادی کی ٹھوس بنیاد ثابت ہوتی ہے۔ اسی طرح بعض عورتیں کثرتِ خودکاری اور لبرالیِ اخلاط کے باعث شادی کے ناقابل ہوتی ہیں۔

ازدواجی زندگی کو کامیاب اور بامعرت بنانے کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ مرد عورت کا صحیح جوڑ تلاش کیا جائے۔ 'مردانہ عورتیں'، 'زنخے مردوں' کے ساتھ گزر بسر کر لیتی ہیں کیوں کہ وہ ان کے بندہ بے دام بن جاتے ہیں لیکن ایک زنخے کو ایک نارمل عورت سے بیاہنا نامناسب ہوگا کیوں کہ وہ اُس سے تسکین نہیں پاسکے گی۔ اسی طرح ایک غیر معمولی جنسی خواہش رکھنے والے مرد کا ایک غیر معمولی جنسی خواہش رکھنے والی عورت سے بیاہ ہو سکتا ہے لیکن ایک مرد مزاج عورت کا بیاہ ایک گرم جوش مرد سے نہیں ہو سکتا، نہ گرم جوش عورت ایک سرد مزاج کو تباہ ہمت سے آسودگی پاسکتی ہے۔ مغربی ممالک میں شادی کے لئے مشاورتی ادارے قائم کیے جا رہے ہیں جن میں عضوِ بآلی، جنسیات اور نفسیات کے ماہرین ہوتے والے میاں بیوی کو مناسب مشورے دیتے ہیں اس نوع کا

پہلا ادارہ ہرٹس فیلڈ نے برلن میں قائم کیا تھا۔ ان اداروں کی افادیت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔  
 افلاطون نے کہا تھا کہ شادی ایک تو مندی صحیح القویٰ مرد کی ایک صحت مند عورت سے ہونا ضروری ہے  
 تاکہ وہ صحت مند اولاد پیدا کر سکیں۔ یہ ایک ایسی صداقت ہے جو کبھی فرسودہ نہیں ہوگی۔

آج کل مغرب اور امریکہ میں ربحیت جاری ہے کہ موجودہ صورت میں شادی کا ادارہ باقی رہے  
 گا یا ختم ہو جائے گا۔ وینس پیکارڈ نے لکھا ہے کہ مستقبل میں شادی منہ بھیل صورتیں اختیار کرے  
 گی۔

۱۔ عارضی شادی: مثلاً پانچ برس تک شادی کا معاہدہ کیا جائے۔ بعد میں ان میں جدائی ہو سکتی  
 ہے یا معاہدے کی تجدید کی جا سکتی ہے۔ ایک لڑکی نے کہا ”جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے، ہم جانتے  
 ہیں کہ ہم ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے پیار نہیں کر سکیں گے۔“

۲۔ نوجوان مرد و عورتیں خاصے طویل عرصے تک مل جل کر زندگی گزاریں بغیر اس خیال کے کہ ان کی  
 آپس میں شادی ہو جائے گی۔ اس قسم کے تعلقات یونیورسٹی کے طلباء میں رواج پا رہے ہیں۔  
 ۳۔ شوہر اور بیوی معاشرے میں آزاد ہوں اور ایک دوسرے سے باز پرس نہ کریں۔

۴۔ ایک بچہ ایک باپ یا ایک بچہ ایک ماں کا عالمی نظام ظہور میں آئے جیسا کہ سویڈن میں رواج  
 پا رہا ہے۔

۵۔ تمام مرد و عورتیں جنسی ملاپ میں آزاد ہوں لیکن بچے پیدا کرنے کی اجازت صرف منتخب  
 نوجوانوں اور لڑکیوں کو دی جائے جو ہر لحاظ سے صحت مند ہوں۔

۶۔ گروہی شادیاں جیسا کہ سویڈن میں رواج پا رہی ہیں: آٹھ آٹھ دس دس نوجوان لڑکے  
 لڑکیاں مل کر رہیں اور آزادانہ جنسی ملاپ کریں۔ بچوں کی کفالت سب پر ایک جیسی لازم ہو۔

۷۔ ایک مرد بہت سی عورتوں سے اور ایک عورت بہت سے مردوں سے اختلاط کر سکے۔

۸۔ شادی کے مختلف طریقے آزمانے کی اجازت دے دی جائے۔

شادی ہر صورت عین فطرتی ادارہ ہے جس کے بغیر مرد یا عورت کی زندگی کی تکمیل نہیں ہو سکتی نہ وہ

پسکی مسرت سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں۔ بچوں کی مناسب تربیت اور رہنمائی کے لئے سمجھنے دیکھنے والے مال باپ کا وجود ضروری ہے۔ جن 'حرامی بچوں' کو طفلِ کدوں میں پالا گیا ہے جن کی تربیت ناقص رہی ہے ان کی شخصیت و کردار میں محکم کی و بایسڈگی پیدا نہیں ہو سکی نہ ان کے دلوں میں ہمدردی انسانی کا جذبہ راہ پاسکا ہے۔ شادی ایک انسانی ادارہ ہے جو ہزاروں برسوں میں صورت پذیر ہوا ہے اسے ترک کر دیا گیا یا مگر وہی شادیوں، اور 'رفاقت کی شادی' کے نام پر اسے منسوخ کر دیا گیا تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ تہذیب و تمدن کی بنیادیں متزلزل ہو جائیں گی، انسان دوبارہ وحوش کی صف میں شامل ہو جائے گا اور صالح، مثبت، تعمیری معاشرتی قدروں سے محروم ہو جائے گا۔ مرد و عورت کو مذہبی رسوم کی پابندی سے رشتہ ازدواج میں منسلک کیا جائے یا سول رجسٹریشن کے ذریعے میاں بیوی قرار دیا جائے۔ شادی کے ادارے کو بہر نوح باقی و برقرار رکھنا قرینِ دانش ہو گا۔

---

## ہم جنسیت

ہم جنسیت یعنی مرد کی مرد سے اور عورت کی عورت سے جنسی محبت کا کھوج قدیم ترین اقوام میں بھی ملتا ہے البتہ اس کے آغاز کے بارے میں اختلاف ہے بعض مورخین کی رائے میں اس کی ابتداء مصرِ قدیم سے ہوئی جہاں دیوی مانا آئس کے معبد میں ہیجڑے پجاری رہتے تھے جن سے زائین منع کرتے تھے۔ مصرِ قدیم کی ایک تحریر سے جو ساڑھے چار ہزار برس کی پرانی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں اُمرِ پرستی کا عام رواج تھا۔ مصر سے یہ علتِ جزیرہ کریٹ اور فنیقیہ (کنعان، فلسطین، آج کل لبنان اس میں شامل تھا) میں پھیل گئی۔ سدوم (لفظ سدومیت اسی سے یادگار ہے) اور گورہ (عامو بہ معنی آباد) میں اُمرِ دوں کے قبہ خانے موجود تھے جن کی سرپرستی کو اُمراء لازمِ نجات سمجھتے تھے۔ عہد نامہ قدیم کے باب پیدائش میں لکھا ہے کہ جب دو فرشتے سدوم کو آگ اور گندھک برسا کر تباہ کرنے کو آئے تو جنابِ لوط کے گھر ٹھہرے جہاں سدومیوں نے انہیں گھیر لیا اور شور مچانے لگے کہ اے لوط! انہیں باہر بھیج دو فرشتوں نے انہیں اندھا کر دیا اور اس طرح اپنے آپ کو بچایا۔ فنیقی جہاز ران تجارت کے سلسلے میں دورِ دراز کے بحرنِ سفوں پر جلتے تھے اور غیر اقوام کے بچوں کو خرید کر یا بھگا کر لے آتے تھے انہیں آختر کے اُمر کی حرمِ رادوں یا مندروں میں رکھا جاتا تھا۔ جہاں یا ترسی اپنی سدومی ہوس کی تسکین کرتے تھے۔ فنیقیوں نے شمالی افریقہ کے ساحل پر کاریج کا شہر بسایا تو وہاں بھی اُمر

LESBIANISM اور SODOMY HOMOSEXUALITY سے زیادہ

رسمی المفہوم ترکیب ہے۔ عادت کی ترکیب غلط ہے۔

سُدومی کو نامہ میں BUGIARDO فرانسیسی میں BOUGRE انگریزی میں

BUGGER لکھتے ہیں۔ یہ الفاظ BULGAR کی بدلی ہوئی صورت ہیں جو سدومیت کے لیے پیش

سے بدنام رہے ہیں۔

پرستی رواج پاگئی۔ سدوم کی طرح یونان کا شہر کورنتھ سدومیت کا بہت بڑا مرکز تھا۔ بابل میں عشتار کے معبد میں، میجرٹے پجاری رہتے تھے جنہیں کدیش (مقدس) کہا جاتا تھا۔ ان کا پروہت اکوڈرم کہلاتا تھا۔ چین قدیم اور جاپان میں اُمردوں کے قبر خانے موجود تھے فیثقیوں کی طرح جاپانیوں کا بھی خیال تھا کہ سدومی دلیر اور شجاع ہوتے ہیں۔ اہل یونان نے اُمرد پرستی کو قومی اور تعلیمی ادارہ بنالیا اور ہم جنسیت اُن کے معاشرے، مذہب، فلسفہ، اخلاق، قانون اور شعروادب میں نفوذ کر گئی۔ لائی کرکس اور سولکن نے اپنے اپنے ضابطہ قوانین میں سدومیت کو مباح کر دیا لیکن ایک شرط عائد کی کہ صرف آزاد لڑکوں سے اظہارِ عشق کیا جائے، غلام ہم جنسی محبت کے اہل نہیں ہوتے ہو مرنے کہا ہے

”سبزہ آغازِ نوجوان دنیا کی حسین ترین مخلوق ہے۔“

قدما ئے یونان اُمردوں کے حسن و جمال کے شیدائی تھے اور خوش رو نوجوانوں سے عشق کرتے تھے وہ نو نیردوں کی آنکھوں، سنہرے بالوں، اور گلگوں رخساروں کی تعریف میں رطب اللساں ہیں۔ ارسطو کہتا ہے۔

”عشاق اپنے محبوب لڑکوں کے حسن و جمال کا نظارہ صرف اُن کی آنکھوں میں

کرتے ہیں کہ انہی میں لڑکوں کے محاسن کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔“

سقراط ایک حسین لڑکے آٹو لیکس کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے۔

”جس طرح اندھیری رات میں آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں پر سب لوگوں

کی نگاہیں جم کر رہ جاتی ہیں اسی طرح آٹو لیکس کے چہرے کی طرف تمام لوگوں

کی نگاہیں اٹھ جاتی ہیں۔“

افلاطون نے جب حسین جسم میں حسین روح کی تلاش کی تھی تو اس سے اُس کی مراد حسین لڑکے ہی کی روح تھی۔ یونانیوں کے خیال میں عشق وہ جذبِ کشش ہے جو حسن و جمال کی طرف مائل کرے اور حسن و جمال لڑکوں ہی میں ہوتا ہے چنانچہ وہ حسین لڑکوں کے محبتے تراش کر اپنے معبدوں میں

رکھتے تھے۔ اعلیٰ طبقے کے لوگ اُمردوں کے قحبہ خانوں میں جانا اپنی کسرِ شان سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم جنسی عشق کا معاوضہ طلب کرنا یا ادا کرنا مردانِ فردِ مایہ کا شیوہ ہے۔ یونان کے دیوتا بھی ہم جنسی تھے۔ خداوندِ خدائیس کا گینی میڈ سے، اپالو کا میاسٹھ سے اور ہرکولیز کا ہائی لیز سے معاشرہ مشہور ہے۔ ارسطو ’جمہوریہ‘ میں لکھتا ہے کہ جزیرہ کریٹ میں لڑکوں سے عشق کرنا نہ صرف جائز تھا بلکہ مملکت بھی اس کی حوصلہ افزائی کرتی تھی تاکہ آبادی میں اضافے کو روکا جاسکے۔ معلوم ہوا کہ مانتھس کا نظریہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔

یونانِ قدیم کے فلاسفہ نے ہم جنسی عشق کی تعریف و توصیف میں منطقی دلائل دیئے ہیں اور شاعروں نے اس کی کشش کے گیت گائے ہیں۔ سقراط سمپوزیم کے مکالمے میں کہتا ہے کہ عشق حصولِ دوام کی آرزو کا نام ہے جو عورتوں کو حاملہ کرتا ہے اور حسین لڑکوں کی عقل و خرد کو جلا دیتا ہے۔ عشقِ افلاطونی سے بالعموم مردِ عورت کی پاکیزہ محبت مراد لی جاتی ہے لیکن یہ درست نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے مرد کی مرد سے سچی اور پرجوش محبت۔ اہل یونان کا خیال تھا کہ نوجوانوں کی باہمی محبت اُن میں عزم و حوصلہ، شجاعت و شہامت اور دوسرے اخلاقی محاسن پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ ہم جنسیت یونانیوں کی تعلیم و تربیت کا جزوِ لازم بن گئی۔ سپارٹا میں نوخیز لڑکوں کو اپنی عمر سے بڑے نوجوانوں سے وابستہ کر دیا جاتا تھا جو اُن کی تربیت کے ذمے دار ہوتے تھے۔ دونوں میں پرجوش محبت کا ہونا لازم تھا۔ بڑی عمر کے نوجوانوں کو مصلح اور چھوٹی عمر کے لڑکے کو سامع کہتے تھے۔ جب کسی ’سامع‘ سے میدانِ جنگ میں بُزدلی کا اظہار ہوتا تھا تو ’مصلح‘ کو مرادی جاتی تھی کہ تم نے اس کی مناسب تربیت کیوں نہیں کی۔ یونانی ریاست تھیبہ کا دستہ مقدس اس ادارے کی معروف مثال ہے۔ یہ دستہ ایسا مائٹا داس نے مرتب کیا تھا۔ پلوٹارک لکھتا ہے۔

”یونانِ قدیم کی ریاست تھیبہ کا دستہ مقدس شجاعت و بسالت کے لئے مشہور تھا۔

اسے اُن نوجوانوں سے ترتیب دیا گیا تھا جو ایک دوسرے سے دلی محبت کرتے تھے اور اپنے محبوب کے دوش بدوش لڑ کر جان دینا اپنے لئے باعثِ فخر خیال

کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دستہ ہر لڑائی میں فحیاب ہوتا رہا۔ جنگ قرونیدہ میں جس میں قلعہ شاہ مقدونیہ نے یونانی ریاستوں کی متحدہ فوج کو شکست فاش دی تھی، یہ دستہ بھی شریک تھا۔ اس دستے کے ’رفقا‘ اس پامردی سے ہم کر پڑے کہ شکست کے بعد اس کا ایک سپاہی بھی زندہ گرفتار نہ کیا جاسکا۔ فوج کے بعد شاہ قلعہ میدان جنگ کا چکر لگاتا ہوا اُس جگہ پہنچا جہاں اس دستے کے نوجوانوں کے خون آغشتہ لاشے پڑے تھے۔ اُس نے دیکھا کہ تمام مقتولین نے سینے میں زخم کھائے تھے اور ہر ایک کی نعش اپنے رفیق کی نعش کے پاس پڑی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے۔“

یونان قدیم کی غنائی شاعری فارسی غزل کی طرح خالصتاً ہم جنسی عشق پر مبنی ہے۔ اس میں مردوں سے اظہارِ عشق کیا گیا ہے۔ ایک شاعر سڑٹیون کہتا ہے

”شدید گرمی میں ایک حسین پھول کھلا کر رہ جاتا ہے اسی طرح خط کا ایک بال بال کے کے حسن کو تباہ کر دیتا ہے۔“

ابلی کس حسین لڑکوں کی آنکھوں کو ستاروں سے تشبیہ دیتا ہے جو اندھیری رات میں چمک رہے ہوں۔ ایک یونانی شاعر کہتا ہے

”میرے پیارے تری آنکھیں تو بہروں سے بھی باتیں کرتی ہیں۔“

فلو سڑٹیس اپنے محبوب لڑکے کو مخاطب کر کے گویا ہوتا ہے۔

”میں نے تمہیں گلاب کے پھولوں کا ایک گلہ سترے بجا ہے اس لئے نہیں کہ تم ان سے لطف اٹھاؤ بلکہ اس لئے کہ تمہارے ہاتھ میں وہ تروتازہ رہیں گے۔“

”یہ پھول تمہارے لئے زیب و زینت کا باعث نہیں ہوں گے بلکہ تم ان کی زیبائش کا موجب بنو گے۔“

۱۰ زغارت چہنت بر بہار منت ہست کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند

۱۱ بزبور ہا بیا رائند وقتے خوب رویاں را تو سمییں تن چہناں خوبی کہ زیور ہا بیا رائی

” تم نے مجھے ملامت کی ہے کہ میں تمہیں گلاب کے پھول نہیں بھیجتا۔ تمہیں ان کی ضرورت

بھی کیا ہے۔ تمہارے اپنے رخساروں پر گلاب کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔“ ۱۷

شاعر کلم تیس نے ایک شخص سپاس کا ذکر کیا ہے جو اپنے محبوب اندی میں کی خوبصورت آنکھوں میں  
جھانکنے کا ایسا شائق تھا کہ اُسے سونے نہیں دیتا تھا۔ پوری میڈیز اپنے ایک ایسے میں کہتا ہے

” نوخیز لڑکے مردوں کے لئے تسکین خاطر اور تفریح طبع کا باعث ہوتے ہیں۔“

شاعر اناکریون شاہ پالی کریمس کے ایک حسین غلام سمر دیس پر فریفتہ ہو گیا اور اُس کی زلف پیمپاں کی  
تعریف میں نظم کہی۔ بادشاہ نے جھٹلا کر سمر دیس کے بال کٹوا دیئے۔ دیوتا ایراس کے تہوار پر لڑکوں  
کی محبت کے گیتوں کا مقابلہ ہوتا تھا اور منتخب گیتوں پر انعامات دیئے جاتے تھے۔ عاشق کو ’بیڑیا‘ اور  
محبوب کو ’میر‘ کہتے تھے۔ جس شریف زادے کا کوئی عاشق نہ ہوتا وہ اسے اپنے بے باعث تنگ وھا  
بگھناتا تھا۔ زینوفن کے بقول مرد اور مرد کے تعلق کو ازدواجی نوع کا خیال کرتے تھے۔ عورتیں مردوں  
سے جلتی تھیں۔ ایک عورت نے طنز یہ کہا ” مجھے ایسے مرد کی ضرورت نہیں ہے جسے بذاتِ خود ایک مرد  
کی ضرورت ہو“۔ لوگین نے اپنے ایک رسالے میں عورت کی محبت پر مرد کی محبت کو ترجیح دی ہے۔

افلاطون نے اپنے مکالمے ” فیدرس “ میں ہم جنسی عشق کی تعریف پر جوش انداز میں کی ہے۔ یونانی  
زبان میں ہم جنسی عشق کے بارے میں کئی اصطلاحات پائی جاتی ہیں مثلاً ” نوخیزوں کا عاشق“، ” خوبصورت  
لڑکوں کا عاشق“، ” نوخیز لڑکوں کو تارنے والا“، ” لڑکوں کو آنکھ سے اشارے کرنے والا“، ” سنہری  
زلفوں والے لڑکے سے پیار کرنے والا“ وغیرہ۔ جو امر و عورتوں کی طرح بنا د سنگھار کرتے تھے اور زلف  
ادائیں دکھاتے تھے انہیں کینڈس کہتے تھے۔ گھٹیا قسم کے لونڈوں کو بیڑیا کہا جاتا تھا اور انہیں نفرت  
کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا کیوں کہ وہ خرمی وصول کرتے تھے جسے باذوق یونانی آداب عشق کے منافی خیال  
کرتے تھے۔ پیشہ ور مردوں کے قبر خانوں پر محمول عائد کیا جاتا تھا۔ ہیولاک ایس لکھتا ہے کہ قدمائے یونان  
کے خیال میں سچی محبت صرف مرد ہی مرد سے کر سکتا ہے۔ عورت سے عشق کرنے کو وہ جنوں خیال کرتے

۱۷ اے تماشا گاہِ عالم روئے تو تو مجھجا بہر تماشا سے رومی

تھے۔ عورت اُن کے یہاں بچے جننے کے لئے مٹی اور بس۔ ہر خاندانی شخص اعلانیہ ایک نوخیز محبوب رکھتا تھا اور اس بات پر فخر کرتا تھا۔ دیاس قہنزر کے پاس ایک حسین اُمرد تھا جس پر اُس کی بیوی لڑائی جھگڑا کیا کرتی تھی۔ زینوفون کو ایک لڑکے کلتیس سے عشق تھا۔ ارسطو ہرمیاس پر فدا تھا، زینو برواتی عورتوں کی کشش سے بے نیاز تھا اور صرف اُمردوں سے پیار کرتا تھا۔ مشہور موسیقار عارفوس خوبصورت لڑکوں کا شیدائی تھا۔ بعض اوقات حسین اُمردوں سے باقاعدہ شادیاں رچائی جاتی تھیں جن کی رسوم دھوم دھام سے مناتے تھے۔ تھیو کرٹس اس ہمہ گیر شوق پر طنز کرتے ہوئے کہتا ہے۔

”نوجوان دلفن عشق میں مبتلا ہے، میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کسی عورت پر عاشق ہوا ہے یا کسی مرد پر فدا ہے۔“

کلتیس ہم جنسی عشق کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے

”عورتوں سے سبھی شادیاں کرتے ہیں، لڑکوں سے عشق کرنا صرف دانشوروں کا شیوہ ہے کیوں کہ عورت میں نیکی کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔“

افلاطون سمپوزیم میں کہتا ہے

”وہی نوجوان جو ہم جنسی عشق کا تجربہ رکھتے ہوں اچھے سیاست دان بن سکتے ہیں۔“

عورتوں کی ہم جنسی محبت کی روایت بھی یونان قدیم سے یادگار ہے۔ جزیرہ لزباس کی مشہور و معروف شاعرہ سیفون سے اس کا آغاز ہوا تھا۔ اُس کے وطن کی رعایت سے عورتوں کی ہم جنسی محبت کا نام ’لِزبائی عشق‘ پڑ گیا۔ سیفون نے نوجوان لڑکیوں کو ادب و شعر اور رقص و موسیقی کی تعلیم دلانے کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا۔ وہ اپنی طالبات کو ’رفیقہ‘ کہا کرتی تھی اور ان سے اظہار عشق کیا کرتی تھی۔ گورگو، نومیس، انڈرومیڈا، اناگورا، کلتیس اور ایٹس اُس کی محبوب لڑکیاں تھیں۔ ایٹس پر تو وہ جان و دل سے فدا تھی۔ سوہ اتفاق سے ایٹس ایک نوجوان سے محبت کرنے لگی۔ سیفون نے اپنے سوزِ دروں، آشفستہ خاطرِی اور یاس و حُماں کا اظہار اس نظم میں کیا ہے۔

لہ LESBIAN LOVE اس کی دو صورتیں ہیں SAPPHISM (مساحتہ)،  
TRIBADISM (چپٹے بازی، طبقہ زانی)

”وہ شخص دیوتاؤں کا شیل ہے جو تیرے قریب بیٹھتا تیری تقریبی آواز کو سنتا ہے اور پیار کی ہنسی ہنستا ہے۔“

یہ دیکھ دیکھ کر میرا بی جیران ولرزیاں ہوتا ہے کیوں کہ جب کبھی میں تمہارے قریب بیٹھوں میری زبان گنگ ہو جاتی ہے اور مجھ پر سکوت طاری ہو جاتا ہے۔

میرے رگ و پے میں آگ کے شعلے جڑک اٹھتے ہیں، میری نگاہیں خیرہ ہو جاتی ہیں اور یوں لگتا ہے جیسے سمندر کی موجوں کی آواز میرے کانوں میں آرہی ہے۔

مجھے پسینے پھوٹ جاتے ہیں اور میرے دست و پا لپکانے لگتے ہیں، میرا چہرے کا رنگ خزاں زدہ

گھاس کی مانند ہلا پڑ جاتا ہے۔

مجھ پر سکرات کا عالم طاری ہو جاتا ہے اور میں وارفتگی کی رُو میں بے اختیار بہہ جاتی ہوں۔“

ایک اور شعر پارے میں وہ عشق کے ”تلخ شیریں عذاب“ کا ذکر کرتی ہے۔ ”انفلاطون کہا کرتا تھا کہ ”ادب و فن کی نو دیمیاں مانی گئی ہیں۔ میرے خیال میں سیفودیسویں ویں تھی۔“

سیفودیسویں کے علاوہ میبل اور فیلیپس مشہور ہم جنسی عورتیں تھیں جو لزبانی اختلاط کرتی تھیں۔

یونانیوں کی طرح رومیوں کے یہاں بھی ہم جنسی عشق اور سداویت کا عام رواج تھا۔ سلاطین و امراء سب

راس رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ سدوسوں کی اپنی دیوی تھی جسے کاسینا کہتے تھے اور اُس کی پوجا ذوق و

شوق سے کرتے تھے۔ روم کے اُمرد محبتوں کی طرح زلیخا بڑھاتے تھے اور ہار سنگھد کرتے تھے۔ اُمردوں

کے ساتھ شادیاں بھی رچائی جاتی تھیں۔ قیصر روم نیرو کی ملکہ پوپیا مرگئی تو اُس نے لیکڑکے پھولوں سے نکاح

کر لیا کیوں کہ اُس کی شکل و صورت پوپیا سے ملتی جلتی تھی۔ قیصر سیلیوس کا بوس ایک نوجوان ہاروکلیز پر

مرتا تھا۔ اُس نے ہاروکلیز سے باقاعدہ شادی رچائی اور زوجہ کی طرح اُس کی خدمت کی کرتا تھا۔ کالی گولا

کا محبوب اُمردا منسٹر تھا جو سیاہ و سفید کا مالک بن گیا تھا۔ روم کے حاکموں میں خوش رو لڑکے مانگ رکھے جاتے تھے جو یونانی ذوق کی تسکین کرتے تھے۔ روم کے شاہی خاندان میں اگر پٹیا اور لیویا لڑبائی اختلاط کے لئے بدنام تھیں۔ سدومیوں کو کنیدی اور زنانوں کو چھسی کہتے تھے۔ شریف زادے نامور شہریوں سے بڑا سدومی تعلق رکھتے تھے۔ جولیس سیزر اپنے لڑکپن میں تبھیا کے بادشاہ نکومیدس کا محبوب رہ چکا تھا۔ اُس کا جانشین اگستس سیزر بھی فونیزی کے ایام میں کئی لوگوں کا محبوب رہ چکا تھا۔ بلاطی شہزاد مارشل نے اپنی عشقیہ نظموں میں لڑکوں ہی سے اظہار محبت کیا ہے اور اپنے محبوب کے معطر بوسوں کا ذکر کیا ہے۔ رومنہ ابکری کے نزال اور عیسائیت کے فروع کے ساتھ جنسی قدربں بھی متاثر ہوئیں۔ مجسمیت، یہودیت اور اسلام میں ہم جنسی اختلاط اور سدومیت کی سخت ممانعت کی گئی ہے۔ عہد نامہ قدیم میں لکھا ہے ”تو مرد کے ساتھ صحبت نہ کرنا جیسے عورت سے کرتا ہے۔ یہ نہایت مکہفہ کام ہے۔“ (اجبار)

قسطینس نے سدومیت کی سزا موت قرار دی اور حکم دیا کہ سدومیوں کو سولی پر گارٹنے سے پہلے سخت عذاب دیا جائے۔ ریشق یورپی اقوام کے ضابطہ فوجداری میں شامل کر لی گئی۔ آڈرس پہلے نے لکھا ہے کہ لندن کے میوزیم کی دیوار پر ایک تحریر آویزاں ہے جس میں دو آدمیوں کے مقدمے کی تفصیل درج ہے جنہوں نے ۱۸۲۰ء میں سدومیت کا ارتکاب کیا تھا۔ انہیں سزا کا حکم سناتے وقت منصف نے لکھا کہ سدومیت کے اس ارتکاب نے ان اشخاص کے ساتھ سارے ملک کی سلامتی کو معرض خطر میں ڈال دیا ہے کیوں کہ سدوم کا شہر اسی گناہ کی پاداش میں تباہ کیا گیا تھا۔ فیصلہ میں یہ بھی لکھا گیا کہ ان مجرموں کو دوسرے قاتلوں کے ساتھ سولی پر نہ گاڑا جائے مبادا ان کے قرب سے ”معصوم قاتل“ متاثر ہو جائیں۔

ہندوؤں میں ہم جنسی اختلاط ممنوع تھا۔ منوسمرتی میں عورتوں کے ہم جنسی اختلاط کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے

”اگر کوئی کنواری کسی دوسری کنواری کو آلودہ کرے تو اسے دو سو پانسی جرمانہ کیا۔“

SEXUAL LOVE IN ANCIENT ROME.  
ENDS AND MEANS

جائے اور دس بید مارے جائیں۔ اگر کوئی عورت کسی کنواری کو خراب کرے تو اس کا سر منڈ دیا جائے یا اس کی دو انگلیاں کاٹ دی جائیں اور اسے گدھے پر بٹھا کر سارے شہر میں پھرایا جائے۔“

بحسبوں کی شریعت میں سدومی کی سزا موت تھی اور ستائیس سدومیت کو سنگین جرم قرار دیا گیا کیونکہ اس سے افزائش نسل پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ مذہب کے زوال کے ساتھ مذہبی اخلاق سے بھی روگردانی کی گئی اور مردِ زہلے سے یورپ اور دنیائے اسلام میں بھی ہم جنسیت رواج پائی۔ دسویں صدی عیسوی میں نارمن حملہ آوروں نے سدومیت کو دور دور تک پھیلا دیا۔ لولی چہار دہم کے عہدِ حکومت میں ورسائی کے دربار میں ہم جنس عشاق نے ایک خفیہ انجمن قائم کی جس میں ڈیوک گراموں ہشہزادہ کانٹی اور ماریکی دیبراں جیسے روساء شامل تھے۔ انجمن کے ارکان نے عہد کر رکھا تھا کہ وہ زندگی بھر عورت کے قریب نہیں پیشگیں گے۔ وہ اپنے لباس کے نیچے سونے کی صلیب پہنتے تھے جس میں ایک مرد کے ایک عورت کو پامال کرنے کا نقش کندہ تھا۔ اسے سدومیوں کی انجمن کہنے لگے۔ لولی نے سختی سے اس کا استیصال کر دیا۔ والیئر نے فریڈرک اعظم شاہ پرتیہا کے دربار کی سدومی فضا کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس سے یورپ بھر کی عورتوں میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی ہے۔ فریڈرک اعظم نوخیز کینڈوں سے جی ہلاتا تھا۔ اس کے عہد سے سدومیت جرمن فوج کی ایک حکم روایت بن گئی اور اسے لازماً پلانر دی سمجھا جانے لگا۔

ایڈورڈ دوم شاہ انگلستان سدومی تھا اور اپنے لونڈے پائرس گیوسٹن پر جان پھر دکتا تھا۔ رچرڈ شیرول اپنے یونانی ذوق کے لئے بدنام تھا۔ جمیز اول سٹوارٹ اُرد پرست تھا اور اپنے محبوب جارج ولیرز سے والہانہ عشق کرتا تھا۔ اُس نے جارج ولیرز کو ڈیوک بنادیا اور وہ ملک کی سیاسیات پر حاوی ہو گیا۔ روم میں ہر سال پوپ کے حکم سے سینکڑوں روکوں کو آختہ کیا جاتا تھا تاکہ بڑے ہو کر بھی اُن کی اولاد کی دلکشی برقرار رہے اور وہ مذہبی سنگیت منڈلیوں میں گائیں۔ پادری انہیں ہوا و بھوس کا نشانہ بناتے تھے۔ ان مجرموں کے باعث روم سدومیت کا مرکز بن گیا۔ کسانو نے اپنی خود نوشت سوانح حیات

میں لکھا ہے کہ کارڈینل بورجیس کا محبوب بیچڑا اتنا حسین و جمیل تھا کہ لوگ دور دور سے اُسے دیکھنے کے لئے آتے تھے۔ راہبوں اور راہبات کے اقامت خانے سدویت اور لڑبائی اختلاط کے لئے رُکوائے دہر تھے۔ روسو کے اعترافات میں اُن کی اُمرد پرستی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ روسو نوغیزی کے عالم میں تحصیلِ علم کے لئے ایک خانقاہ میں داخل ہوا۔ وہاں اُس پر جو گزری اُسی کی زبانی سنیے

”اُن دو بدتماشوں میں سے جو نور کہلاتے تھے ایک مجھ پر عاشق ہو گیا۔ وہ بڑے، اشتیاق سے مجھ سے باتیں کرتا اور میری چھوٹی موٹی ضروریات پوری کرنے پر ہمیشہ مستعد رہتا۔ وہ مجھے اپنے کھانے سے حصّہ بھی دیتا تھا۔ وہ اس ذوق و شوق سے میرا منہ پھوما کرتا کہ مجھے گھن آتی تھی۔ مجھے اُس کے بد وضع چہرے سے جس پر کسی زخم کا گہرا نشان تھا اور جس پر پیار کی بجائے خشنائی کا گمان گذرتا تھا، خوفِ عکس ہوتا لیکن میں چپ چاپ اُس کے بوسوں کو برداشت کر لیتا تھا اور اپنے آپ سے کہتا کہ آخر وہ مجھ سے پیار کرتا ہے اُسے دھتکار دینا نامناسب ہوگا۔ شدہ شدہ وہ دست درازی پر اُمڑ آیا۔ وہ بعض اوقات ایسی عجیب و غریب خواہشات کا اظہار کرتا کہ مجھے شبہ ہونے لگتا کہ وہ پاگل ہے۔ ایک رات کو اُس نے میرے ساتھ سونے کی خواہش ظاہر کی لیکن میں نے انکار کر دیا اور غذریا کہ میرا بستر بہت چھوٹا ہے۔ اُس نے اصرار کیا کہ میں اُس کے بستر پر چلوں لیکن میں نے پھر انکار کر دیا کیوں کہ اُس کے کپڑے گندے تھے اور اُن سے تمباکو کی خلیظہ بدبو آتی تھی۔ اگلی صبح کو جب ہم ملے تو اُس نے مجھ سے پھر بوس و کنار کا آغاز کیا اور اس انداز سے کیا کہ میں ڈر گیا.....“

روسو نے خانقاہ کے مستظم سے اُس کی شکایت کی تو وہ فرمانے لگے ”واہ! یہ بھی کوئی بات ہے اوائلِ عمر میں ایسے کئی واقعات خود مجھ پر گذر چکے ہیں، میں ذاتی تجربے کی بنا پر کہتا ہوں کہ یہ تجربہ چنداں ناخوشگوار بھی نہیں ہوتا۔ تم خانقاہ کو خواہ مخواہ بدنام کرنا چاہتے ہو۔“ یہ سن کر روسو ستائے میں آ گیا اور اُسی روز خانقاہ سے بھاگ گیا۔ روسو کے معاصر دیدیرو نے اپنے ناول ’راہب کی سرگزشت‘

میں لڑبائی عشق کا استاد نقشہ کھینچا ہے۔

قدیم چین میں والدین اپنے خورد سال بیٹوں کو قحط کے ایام میں بیچ دیتے تھے۔ جب وہ بڑے ہو جاتے تو انہیں بسا اوقات اُردوں کے قحبہ خانوں میں رکھا جاتا تھا۔ جاپان میں یونان کی طرح اُردو کو لازماً شجاعت سمجھا جاتا تھا اور سمورائی سردار خوبصورت نوخیزوں کو اپنی مصاحبت میں رکھتے تھے جہاں وہ آداب بردار لگی سیکھتے تھے اور سرداروں کی سدوی ہوس کی تسکین بھی کرتے تھے۔ چڑ بڑن نے ہم جنیت کا ایک خطہ قرار دیا ہے جو ایک طرف فرانس، سپین، اطالیہ، یونان، مراکو، مصر، ایشیائے کوچک، عراق، افغانستان، کشمیر، پنجاب، چین اور جاپان تک پھیلا ہوا ہے اور دوسری طرف جزائرِ عرب، ہند اور امریکہ پر محیط ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس خطے میں ہم جنیت قدیم ایام سے بنی رہی ہے۔ برٹن نے صرف دو اقوام کو ہم جنیت اور سدویت سے مُبرا قرار دیا ہے، عرب اور حبشی، باقی سب اقوام اس میں ملوث رہی ہیں۔

یونان کے بعد ایران کو ہم جنیت کا سب سے بڑا مرکز سمجھا جاتا ہے۔ جیروڈوس کے خیال میں ہم جنیت یونان ہی سے ایران میں پھیلی تھی۔ یہ بات قرین قیاس ہے کیوں کہ محوسیت میں اسے نہایت قبیح فعل اور سنگین جرم سمجھا جاتا ہے۔ ساسانیوں کے بعد حکومت میں ہم جنیت ایرانی معاشرے کا ایک اہم ادارہ بن گئی تھی۔ خسرو پرویز کے دربار میں نوخیز خوبرو غلام قیمتی لباس پہنے، زلفیں بڑھائے، سروں پر سونے کے تاج سجائے موجود رہتے تھے۔ ساتی گری کا کام بھی خوش شامل بیچروں کے سپرد تھا۔ بنی بُویر کے اقتدار کے ساتھ ہم جنسی عشق فارسی شاعری میں نفوذ کر گیا۔ معتضد دہلی اُردو پرست تھا۔ ایک دفعہ ایک جنگ کے دوران میں اُس کا ایک محبوب غلام دشمنوں نے گرفتار کر لیا۔ معتضد نے مارے غم کے کپڑے پہاڑ ڈالے، کھانا پینا چھوڑ دیا اور کئی روز محل سے باہر نہ نکلا۔ یہی شان شاہانِ صفوی کی تھی۔ شاہ عباس کبیر کے دربار میں حسین اُرد زرق برق کپڑے پہنے موجود رہتے تھے۔ نقیصہ کی تحریک کا آغاز تصفیہ اخلاق سے ہوا تھا لیکن سیاسی اور اخلاقی منزل کے ساتھ ہی وہ بھی

زوال پذیر ہو گئی۔ غلط کار صوفیوں نے اُردو سے برملا عشق کرنا شروع کیا۔ مولانا روم نے اپنی مثنوی میں ان دیا کار صوفیوں کا پردہ بڑی بے رحمی سے چاک کیا ہے۔ صوفیوں میں عشق ہم جنسی و باکی صورت اختیار کر گیا حتیٰ کہ سد و میت کو علت المشائخ کہنے لگے۔ فارسی غزل کا محبوب اُردو ہی ہے۔ ترسا بچہ مرغ بچہ، ترک بچہ، خط و دستار کے الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں۔ شعراء اُردو سے عشق کہتے تھے اور اس بات پر غر کرتے تھے مستشرق براؤن ایران گیا تو اُس نے دیکھا کہ لوگ بے محابا خوش گلی رنگوں سے اظہارِ عشق کرتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے۔

”رات کے کھانے کے بعد نوغیز لڑکے رقص و سرود سے مہمانوں کی تفریح کا سامان کرتے ہیں۔ جب کوئی لڑکا حسین ہونے کے ساتھ خوش گلو بھی ہو تو سامعین پر وجد و حال کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ مجھے ایک محفل میں شرکت کرنے کا اتفاق ہوا جہاں سامعین گانے والے لڑکے کی آواز اور اُس کے حُسن و جمال سے ایسے متاثر ہوئے کہ بے اختیار اُٹھ کھڑے ہوئے، ہاتھ میں ہاتھ ملا کر اُس کے گرد حلقہ بنایا اور لگے مستانہ وار ناچنے۔ وہ ناچتے جاتے اور آواز ملا کر نعرہ لگاتے ”بارک اللہ کلہو! بارک اللہ کلہو“ (نئے خدا تمہیں برکت دے)

ایرانی تہذیب و تمدن کے اثرات دنیائے اسلام پر بڑے گہرے اور دور رس ہوئے۔ ان اثرات کا کھوج عہدِ نبوی عباسی، ترکوں کے معاشرے، مہر کے بنو فاطمہ اور مالک اور ہندوستان کے غلام اور مغل بادشاہوں کی زندگیوں میں لگایا جاسکتا ہے۔ ایرانی طرزِ معاشرت اور فنونِ لطیفہ کے ساتھ ساتھ ہم جنسی میلان بھی ہر کہیں رواج پا گیا۔ بنو عباس کے عہد کا تمدن ایرانی ہی تھا۔ ہارون اور جعفر برملی کی محبت کا ذکر تاریخوں میں محفوظ ہے۔ ہارون ایک لٹو کے لئے بھی جعفر کو اپنی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا تھا۔ اُس نے ایک ایسا فضل بنوار رکھا تھا جس کے دو گریبان تھے۔ اسے پہن کر وہ ایک جان دو قالب بن جاتے تھے۔ ہارون کا بڑا بیٹا امین صبح وشام اُردو میں گھبراہتا تھا۔ اُس نے اپنے محبوبِ غلاموں کو جماعتوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ سفید لباس پہننے والوں کو ”مڈے“ کہتا تھا اور سیاہ پوشوں

کو "کوہ" کہا کرتا تھا۔ یہ عادت چھڑانے کے لئے اُس کی ماں زبیدہ نے حسین و جلیل کینزیز مردانہ لباس پہنا کر اُس کے پاس بھیجیں۔ انہیں غلام کہتے تھے۔ امین اپنے ایک غلام کو شہر بہان چھوڑتا تھا۔ خانہ جنگی کے دوران میں جب مامون کے سپہ سالار طاہر بن حسین کی فوج بغداد میں گھس آئی اور امین کی سپاہ شکست کھا کر تتر بتر ہو گئی تو ایک شخص دوڑتا ہوا امین کے پاس پہنچا جو اُس وقت دریا کے کنارے بیٹھا اپنے محبوب کو شہر کے ساتھ پھیلیاں پکڑ رہا تھا۔ اُسے شکست کی خبر دی گئی تو وہ بد مزہ ہو کر کہنے لگا "خدا تمہیں غارت کرے! دفع ہو جاؤ یہاں سے! دیکھتے نہیں کہ کوثر نے دو پھیلیاں پکڑ لی ہیں اور میرے ہاتھ ایک بھی نہیں لگی۔" خلیفہ الحاکم فاطمی کا معاشقہ خواجہ مراغین کے ساتھ مشہور ہے۔

سلاطین اور امراء کے حرم سراؤں میں لہزبائی عشق کا رواج عام تھا۔ ایک شخص قد رتھا سیکڑوں لوندیوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا اس لئے کینزیز ایک دوسری سے لہزبائی اختلاط کر کے اپنی محرومی کا مداوا کر لیتی تھیں۔ بڑی لگھڑت ہے کہ ایک دن ہادی عباسی اپنے ندیموں کی صحبت میں بیٹھا تھا کہ ایک غلام باریاب ہوا اور اُس نے جھک کر خلیفہ کے کان میں کچھ کہا۔ ہادی نے حاضرین سے کہا تم بیٹھو میں ابھی آتا ہوں اور اٹھ کر چلا گیا۔ وہ کافی دیر کے بعد واپس لوٹا۔ اُس کا رنگ فق تھا اور سانس پھولی ہوئی تھی۔ وہ سند سے لگ کر بیٹھ گیا اور ایک ساعت چپ چاپ بیٹھا رہا۔ حاضرین حیران و کشیدہ تھے اور بت بنے بیٹھے تھے۔ اتنے میں ایک غلام آیا۔ وہ ایک طشت اٹھائے ہوئے تھا جو رومال سے دھکا تھا۔ ہادی نے غلام کو حکم دیا کہ رومال ہٹا دے۔ یہ دیکھ کر سب دہشت زدہ رہ گئے کہ طشت میں دو حسین کینزیزوں کے کٹے ہوئے سر رکھے تھے اور اُن سے عطر اور لہو کی ملی جلی بو آرہی تھی۔ ہادی نے اپنے ندیموں سے کہا جانتے ہو ان کا قصور کیا تھا؟ انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو ہادی کہنے لگا "مجھے علم تھا کہ یہ کینزیز ایک دوسرے سے عشق کرتی ہیں۔ میں نے اُن پر غمخیز لگا دیئے کہ جب یہ محو اختلاط ہوں تو مجھے خبر کر دی جائے۔ آج میں نے انہیں عین ناگفتہ بہ حالت میں پکڑ لیا اور اپنے ہاتھ سے دونوں کا سر قلم کر دیا۔" یہ کہہ کر بدستور ہنسی مذاق کی باتیں کرنے لگا۔

مردِ زمانہ سے مسلمان میں اُرد پرستی اس قدر عام ہو گئی کہ غیر مذاہب کے لوگ اسے

اسلام کا جزو سمجھنے لگے۔ البیرونی کے بقول کابل کے ہندو راجہ نے اسلام قبول کیا تو یہ شرط لگائی کہ وہ نہ گائے کا گوشت کھائے گا اور نہ لونڈوں سے عشق بازی کرے گا۔ سلطان محمود غزنوی کا سہرا اپنے غلام ایاز سے مشہور ہے۔ سلطان کے بارے میں تونذیر لکھتا ہے:

”سلطان محمود غزنوی کو مشہری چہرہ غلاموں سے عشق تھا۔ فضل بن احمد بھی اس شوق میں اپنے آقا کا مقلد تھا۔ مثل مشہور ہے کہ غلام اپنے آقا کی پیروی کرتا ہے۔ اُسے کسی نے بتایا کہ ترکستان میں ایک نہایت حسین غلام ہے۔ اس زہرہ جیس کو حاصل کرنے کے لئے فضل بن احمد نے اپنا ایک کارندہ وہاں بھیجا اور اُسے تاکید کی کہ وہ غلام کو عورتوں کی طرح محل میں چھپا کر لائے۔ ایک مجنر نے سلطان کو

یہ بات بتادی۔ سلطان نے وزیر سے کہا کہ وہ اُس سیم اندام کو حضور میں پیش کرے۔ وزیر لیت و لعل کرتا رہا اگرچہ اُسے یقین تھا کہ سلطان اُس کی جان ملال پر قدرت رکھتا ہے۔ ایک سلطان نے اپنے وزیر سے کہا آج رات ہم تمہارے گھر آئیں گے۔ وزیر نے اسے اپنی عزت افزائی سمجھ کر سلطان کی ضیافت کا اہتمام کیا۔ جب وہ غلام حورِ شمالی سلطان کے حضور میں آیا تو سلطان نے شگین ہو کر وزیر کو سخت سست کہا اور اُسی وقت حکم دیا کہ وزیر کا مال و متاع ضبط کر لیا جائے۔ اس کے چند روز بعد سلطان عازم ہند ہوا اور اُس کی غیر حاضری میں دشمنوں نے اُسے شکنجے میں کس کر عذاب دے دے کر مار ڈالا۔“

حماد الدین اصفہانی تاریخ سلجوقیہ میں لکھتا ہے: ”سلطان سنجر کی عادت تھی کہ جو غلام پسند آ جاتا تھا اُسے خرید کر اُس سے عشق کرتا تھا اور اس کی عام شہرت ہو جاتی تھی اور جان و مال اُس پر صرف کرتا تھا۔“ ترک بابری کے مطالعہ سے ہم جنسیت کے عام رواج کا علم ہوتا ہے۔

بابر اپنے ایک عزیز سلطان محمود مہرا کے بارے میں لکھتا ہے:

» سلطان محمود مرزا کے عادات و خصائل کے بارے میں یہ کہوں گا کہ وہ پابندِ صوم و صلوة تھا لیکن اس کے ساتھ فسق و فجور اور تشدد میں بھی انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ وہ ہر وقت نشے میں دھت رہتا۔ اُس نے کئی لونڈے رکھے ہوئے تھے۔ اُس کی مملکت میں جہاں کوئی نوخیز اور حسین لونڈا دکھائی دیتا وہ اُسے قابو میں لانے کی ہر ممکن کوشش کرتا تھا۔ اُس کے سرداروں کے بیٹے حتیٰ کہ اُس کے رضائی بھائی اور رضائی بھائیوں کے بیٹے بھی اُس سے محفوظ نہیں تھے۔ «  
 بہایوں بھی حسین نوجوانوں میں کشش محسوس کرتا تھا۔ آزاد لکھتے ہیں: «

» شاہ ابوالمعالی بڑے حسین اور طرمدار تھے۔ ایک دفعہ ایک رئیس علی شیر بیگ کو قتل کر دیا۔ مافوق ہو کر دربار میں پیش ہوئے۔ بہایوں بادشاہ عالم حسن و جمال میں محو ہو گئے اور معاف کر دیا۔ «

اکبر ایرانی ذوق سے مبرا تھا لیکن اُس کے امراء ترک اور ازبک ہم جنسی معاشرت کرتے تھے۔ ایک سردار شاہ غلی ایک خوبصورت نوجوان مقبول خان پر عاشق ہو گیا۔ اکبر نے منع کیا تو اُس نے سب کچھ ٹٹا دیا اور جوگی بن کر جنگل کی راہ لی۔ خان زمان ایک نوخیز شام بیگ پر مرنا تھا۔ شام بیگ کا جی خان زمان کی داشتہ آرام جان پر آگیا۔ خان زمان نے یہ طوائف شام خان کو بخش دی۔ شام بیگ ایک لڑائی میں مارا گیا تو خان زمان نے اُس کے سوگ میں ماتی لباس پہنا۔ جہانگیر نے ایک سدھی واقعہ نویس اور اُس کے محبوب کو بھرت ناک سزا دی تھی۔ آزاد کے الفاظ میں « بادشاہی واقعہ نویس ایک لڑکے کو لے کر بھاگ گیا کہ نہایت صاحبِ جمال تھا اور جہانگیر بھی دربار میں دیکھ کر خوش ہوا کرتا تھا۔ حکم دیا پکڑ لاؤ۔ وہ کئی منزل سے پکڑ لاسُ۔ اپنے سامنے دونوں کی زندہ کھال اُترادی۔ «

ترکوں اور ازبکوں کی طرح افغان امراء و سلاطین بھی ایرانی ذوق رکھتے تھے۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے سلیم شاہ سوری اور دولت خاں کے معاشرت کا حال لکھا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

لے دربار اکبری۔

» مرض کی بے قراری میں بھی یہ حال تھا کہ جب تک اُس کے حواس ٹھکانے رہے اپنے معشوق دولت خان کو سامنے بٹھائے رکھتا تھا اور اُس کی صورت دیکھا کرتا تھا جب کبھی غش سے چوکتا ہی کہتا : دولت خان کہاں ہے ، قصف کی وجہ سے کروٹ لینا مشکل تھا لیکن اپنے محبوب کی یہ دلہی تھی کہ اگر دولت خان دوسری طرف آ بیٹھا تھا تو اُسے یہ گوارا نہ تھا کہ اُسے اپنے سامنے آنے کی زحمت دے بلکہ لوگوں سے کہتا تھا کہ میرا منہ اُس کی طرف پھر دو یا ایک دن دولت خان موجود نہ تھا۔ پوچھا » وہ کہاں ہے ؟ « لوگوں نے کہا کسی سے ملنے گیا ہے۔ سلیم شاہ سمجھا مجھے مرنے لگا دیکھ کر اُوروں سے پہلو جوڑ لیا ہے۔ اتنے میں دولت خان حاضر ہو گیا۔ اُس کو دیکھ کر جان میں جان آئی اور سلیم شاہ نے یہ شعر پڑھا ہے

قدر میں گردِ شناسی کہ جانم بونا      باش تا صحبت یارانِ دگر دریابی

سلطان محمد عادل سُوری عرف عدلی ایک بھگت لڑکے پر جو نہایت خوبصورت اور نازک اندام تھا فریفتہ ہو گیا۔ اُسے مجاہد خان کا خطاب دیا اور دس ہزاری کا منصب عطا کیا یہ لڑکا اس قدر نازک مزاج تھا کہ ایک دفعہ اجمادن کے میدان میں چوگان کھیل کر لوٹا تو راستے میں غازی خان سُور کے ڈیرے پر ٹھہر گیا اور کہا مجھے بھوک لگی ہے۔ غازی خان نے کہا آجاد ماحضرتیہ ہے لیکن جب کھانا سامنے آیا تو قلیہ کی مہک ہی سے اُسے غش آنے لگا اور وہ وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ مبارک شاہ غلی اور خسرو خان کا عشق تاریخ ہند کا ایک بہت ناک باب ہے خسرو خان ابتداء میں ایک ہندو غلام تھا جس پر سلطان فریفتہ ہو گیا۔ خسرو خان نے اپنے خاندان کے چند لوگوں سے مل کر سلطان کو قتل کرنے اور تخت و تاج پر قبضہ کر لینے کی سازش کی۔ درباریوں نے بادشاہ کو اُس کے ارادوں سے مطلع کیا لیکن خسرو خان نے خلوت میں نسوانی اداؤں اور عشقوں سے رو رو کر اپنی صفائی پیش کی۔ سلطان تو پہلے ہی اس کا شیدائی تھا۔ فرشتے کے الفاظ میں

» بادشاہ را از گریہ دل برد آمد ، اورا در کنار گرفت و بوسہ بر رخسارش دادہ

گھٹ خاطر جمع وار کہ یک ٹوے سر ترا بہتر از باد شاہی خودی دانم چہ جائے  
انکہ در خاطر تو دغدغہ بدگوئیوں باشد“

خسرو خاں نے اُسی شب مبارک شاہ کا سرتن سے جدا کر دیا، اُس کے بچوں کو تر تیغ کیا اور اُس  
کی سیکات کو گھر میں ڈال لیا۔ بلکہ بھی سدومی ذوق سے بہرہ وافر رکھتے تھے۔ رنجیت سنگھ کا معاشقہ  
گلاب سنگھ سے مشہور ہے۔ گلاب سنگھ اُس کا محبوب ٹوٹا تھا۔ یہ گلاب سنگھ وہی ہے جس کے ہاتھ  
انگریزوں نے ارنے پونے کشمیر بیچ دیا تھا۔

ہسپانیہ میں بھی ہم جنسیت کے آثار ملتے ہیں۔ جوزی نے عشقِ ہم جنسی کا ایک واقعہ بیان  
کیا ہے جو درج ذیل ہے۔

”ہسپانیہ کا نحوی ابن کلیب (متوفی ۶۱۰۲۵) اور اسلم جو ایک قاضی کا خوبصورت  
بیٹا تھا اکٹھے پڑھتے تھے۔ ابن کلیب اُس پر فریفتہ ہو گیا اور اُس کے عُن و جمال  
کی تعریف اور اپنی شیفتگی کا احوال اپنی نظموں میں بیان کرنے لگا۔ سُدھ شہ بان  
نظموں کا دُور دُور چرچا ہو گیا اور گویئے محظوظوں میں انہیں گانے لگے۔ احمد بن کلیب  
نے اپنی کتاب الفیصیح بھی اسلم کے نام پر معنون کی۔ اسلم کو شرم محسوس ہوئی  
اور اُس سے ملنا چھوڑ دیا۔ غم فراق میں ابن کلیب کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ وہ  
پہروں اسلم کے مکان کے دروازے کے سامنے اُدھر اُدھر ٹہلتا رہتا کہ کہیں آتے  
جاتے اُسے اپنے محبوب کا دیدار میسر آئے لیکن اسلم کترانے لگا۔ ناچار ایک دن ابن  
کلیب ایک بدو کے بھیس میں انڈے مرغیاں بیچنے کے بہانے اسلم کے دروازے پر  
آیا۔ اسلم باہر نکلا تو ابن کلیب نے اُس کا ہاتھ پُوما اور ظاہر یہ کیا کہ وہ اُس کا  
مزارع ہے جو اُس کے لیے تحفے لایا ہے۔ دوران گفتگو میں اسلم نے اُسے پہچان  
لیا اور شکایت کی کہ تمہاری وجہ سے میں کسی کو مُنہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ ابن کلیب

شکستہ دل نوٹ گیا اور قضا کار گھر جاتے ہی بیمار پڑ گیا۔ مرض نے طویل پکڑا تو اُس نے اپنے ایک دوست سے التجا کی کہ جس طرح ممکن ہو سکے وہ ایک بار اسلم کو اُس کے پاس لے آئے۔ دوست اسلم کے پاس گیا اور منت سماجت کر کے اُسے اپنے ساتھ جانے پر آمادہ کر لیا۔ ابھی وہ راستے ہی میں تھا کہ اسلم شرما کر ٹھہر گیا اور کہا بخدا اس سے آگے میں نہیں جاؤں گا تم مجھے مجبور نہ کرو ابنِ کلیب کے دوست نے کہا بس اب کچھ زیادہ دور نہیں جانا ہو گا، مکان بالکل قریب ہے۔ اسلم نہ مانا اور واپس مڑا۔ دوست نے اُس کا دامن پکڑ لیا مگر وہ ٹھہر کر بھاگ گیا۔ ناچار وہ اکیلا ابنِ کلیب کے پاس پہنچا۔ ابنِ کلیب نے اپنا ایک غلام راستے میں کھڑا کر رکھا تھا جس نے اُسے اسلم کی آمد کی خوشخبری دے رکھی تھی اور وہ ہمہ تن انتظار میں بیٹھا تھا۔ جب اُس کا دوست اکیلا واپس لوٹا اور ساری روداد کہہ سنائی تو ابنِ کلیب کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا اور اُس پر ہڈیان کے آثار ظاہر ہو گئے۔ اُس کا دوست باہر نکلا۔ ابھی وہ گلی ہی میں تھا کہ ابنِ کلیب کے متعلقین کے نالہ و بکا کی آوازیں آنے لگیں اور وہ سمجھ گیا کہ ابنِ کلیب واصل بھی ہوا۔

مصری قدیم زمانے سے ہر نوع کی جنسی بے راہ روی کے لئے بدنام رہے ہیں۔ اسلام کی اشاعت نے بھی ان کی جنسی عادات کو چنداں متاثر نہیں کیا۔ رچرڈ برٹن لکھتا ہے کہ نیدرلینڈز کے کونسل جنرل موسیو دارائے نیر نے ایک دن سعید پاشا سے کہا کہ مصر میں سدویت پھیلی ہوئی ہے حالانکہ یہ نہایت مذموم فعل ہے۔ سعید پاشا نے جواب دیا ”موسیو! آپ کی رائے محض قیاسی ہے۔ اس موضوع پر انہماک رائے سے پہلے بہتر ہو گا کہ آپ اس کا دونوں طرح کا تجربہ کر لیں“ یہ لطیفہ ایک مدت تک ڈپلومیٹ حلقوں میں چکر لگاتا رہا۔ چارلس فریر نے سندھ کو فتح کیا تو اُسے بتایا گیا



ہم جنسی پارکوں میں اور سڑکوں کے کنارے اپنے ہم مشرب سرپرستوں کے انتظار میں کھڑے ہوتے ہیں اور اپنے خاص اشاروں سے ایک دوسرے کو اپنی جانب مٹفت کرتے ہیں۔ اضلاع متحدہ امریکہ میں پچاس تنظیمیں ہم جنسوں کی قائم ہیں جن کے اراکین ایک دوسرے کو ملاقات کا وقت دیتے ہیں اس وقت ملک بھر میں چھیست لاکھ مرد اور چودہ لاکھ عورتیں ہم جنسی اور لڑبائی ہیں۔ سان فرانسسکو، نیویارک، لاس اینجلس، سنٹ لوئی وغیرہ بڑے بڑے شہروں میں ہم جنسوں کے شبانہ رقص ہوتے ہیں جن میں امرد زنانہ لباس پہن کر شریک ہوتے ہیں۔ ہم جنسوں کے اپنے ٹھکانے گھر ہیں جہاں عشق ہم جنسی کے موضوع پر مکمل دکھائے جاتے ہیں۔ بعض اوقات ایک چاہنے والا اپنے محبوب امرد اور ایک شیدائی عورت اپنی دوگانہ کے ساتھ مل کر رہتے ہیں گویا ان کا تعلق ازدواجی ہے حال ہی میں ایک خبر شائع ہوئی ہے کہ آسٹن (ٹیکساس) میں سیٹ اٹلنی کرافورڈ مارٹن نے دو مردوں کی باہمی شادی کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ یہ دونوں پہلے امریکی باشندے ہیں جنہوں نے آپس میں باقاعدہ شادی کی ہے۔ ولیم ارٹ کی عمر ۲۰ سال اور انٹونیو مولیانکی عمر ۲۲ سال ہے۔ ان دونوں نے ۵۔ اکتوبر کو ہوسٹن کے گرجا میں باقاعدہ شادی کی تھی۔ ایسے بے شمار ہم جنسی اور لڑبائی جوڑے ہیں جو گرجا کے توسط کے بغیر ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں۔ امریکہ میں ہم جنسیت اس قدر عام ہو گئی ہے کہ ارباب حکومت متوجس ہو گئے ہیں اور ملک بھر میں ہم جنسیت کی دہشت طاری ہے۔ ہم جنسیت اور سدومیت جدید تمدن کا ایک اہم مسئلہ بن گئی ہے۔ ۲۸۔ جون ۱۹۷۰ء کو دس ہزار ہم جنسوں نے نیویارک میں جلوس نکالا اور مطالبہ کیا کہ ہم جنسوں کو ملازمتوں میں مناسب حصہ دلایا جائے اور انہیں برسر عام ایک دوسرے سے پیار کرنے اور شادی رچانے کا حق دیا جائے۔ عورت کی آزادی سے مغرب میں ایک خاموش نفسیاتی انقلاب آ رہا ہے۔ مردوں میں زنانہ پن پیدا ہونے لگا ہے اور عورتوں میں مردانہ خصوصیات ابھر رہی ہیں۔ نتیجتاً مغربی فضا ہم جنسی میلان

۵ THE HOMOSEXUAL IN AMERICA

۲۵ بروز ۱۰ دسمبر ۱۹۷۲ء TIME, OCTOBER 31, 1969.

کے پنپنے کے لئے زیادہ سازگار ہو گئی ہے۔ جیمز میک پارٹینڈ لکھتا ہے: ”ہمارے بے شمار مردوں عورتوں کا ہم جنسیت میں پناہ لینا ہمارے مستقبل کے لئے خطرے کا نشان بن گیا ہے۔“

مغرب کے قحبہ خانوں میں ہم جنسی میلان اور لڑبائی شوق کی تشفی کے سامان کئے جاتے ہیں۔ ان میں اُرد اور دوکانہ رکھی جاتی ہیں جن کی خدمات حاصل کرنے کے لئے ہزاروں ڈالر خرچ کئے جاتے ہیں۔ نیویارک، پیرس، ٹوکیو وغیرہ کے قحبہ خانوں میں لڑبائی اختلاط کے مناظر دکھانے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ کتنے کے بعد کی تحقیق نے ثابت کر دیا ہے کہ لڑبائی عورتوں کی تعداد امریکہ میں ہم جنسی مردوں سے کہیں زیادہ ہے اور لڑبائی عورتیں آزادی نسوان کی تحریک کی پُر جوش علم بردار بن گئی ہیں۔ ایک خاتون باربرا ٹو لکھتی ہے:

”لڑبائی وہ عورتیں ہوتی ہیں جو مرد کی مالی اور جذباتی محتاجی کے بغیر گزر بسر کر سکتی ہیں اور انتہاء درجے کی خود مختار ہوتی ہیں۔ وہ یہ بات منوانے کے لئے دن رات برسرِ پیکار ہیں کہ عورتیں بھی صحیح معنوں میں انسان ہیں اور مردوں کے محض ضمیمے ہی نہیں ہیں۔ وہ قدیم جنسی اور جذباتی روایات کو یکسر ترک کرنے کی دعوں دیتی ہیں۔ لڑبائی عورتوں کو اپنے جنسی میلان کے باعث زیادہ لغزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور انہیں سزا کی مستوجب سمجھا جاتا ہے اس لئے یہ امر باعث حیرت نہیں ہے کہ لڑبائی عورتیں آزادی نسوان کی تحریک میں پیش پیش ہیں اور اس کی قیادت کر رہی ہیں۔ اگر آزادی نسوان کا مطلب مرد کی غلامی کا جو اُتار پھینکنا ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ لڑبائیوں نے یہ جو اپنی گردنوں سے اُتار پھینکا ہے۔“

۱۷ SEX IN OUR CHANGING WORLD

۱۸ WOMAN IN SEXIST SOCIETY.

انتہا پسند لڑبائی عورتیں مرد کی غلامی سے نجات پانے کے لئے نکاح نہیں کرتیں بلکہ اپنی اپنی دوکان سے مل کر رہتی ہیں۔ امریکہ کے طول و عرض میں 'بلاٹس کی میاں' کی تنظیمیں قائم کی گئی ہیں جو عورتوں کے حقوق کے لئے کشمکش کر رہی ہیں۔ وہ بناؤ سنگھار، نئے فیشن کے ملبوسات، اور آرائش و زیبائش سے نفرت کرتی ہیں، پتلون پہنتی ہیں اور بگارتی ہیں۔ وہ مردوں کی طرح جملہ علوم و فنون میں امتیاز حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ ہم مرد کے لئے گڑیاں نہیں بنیں گی بلکہ اسی کی طرح مستقل اور کامل شخصیت کی تعمیر کریں گی۔ اُن کے خیال میں ہے

”لڑبائی عورتیں اوائل عمر سے خود مختاری کی زندگی گزارنا چاہتی ہیں اس لئے انہیں قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لڑبائی عورتیں کامل شخصیت کی آرزو مند ہیں اور مردوں کی ہر قسم کی محتاجی سے نجات پانا چاہتی ہیں۔ وہ اس نسوانی رول کو ترک کر دینے پر اصرار کرتی ہیں جس کے باعث عورت اب تک مرد کی غلامی میں گذر بسر کرتی رہی ہے۔“

وہ لڑبائی شادیوں کے حق میں دلائل دیتی ہیں اور کلیسیا سے ہم جنسی شادی کے حق کو تسلیم کروانے کے لئے کشمکش کر رہی ہیں۔ انہیں بچے پیدا کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کیروین بڑ نے بلاٹس کی میاں کے ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے

”مستقبل میں تولید کا تعارف ٹوٹ جائے گا اور معاشرہ انسانی میں کئی قسم کے اسالیب حیات نمود پذیر ہوں گے۔“

امریکہ کے علمائے عمرانیات و نفسیات کے خیال میں ہم جنسیت اور لڑبائی عشق کی ملک گیر اشاعت ایک معاشرتی مرض کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ اُن کے خیال میں امریکی مرد آزاد عورت سے خوفزدہ ہے یہ عورتیں اپنے آپ کو RADICAL LESBIAN کہتی ہیں۔ ان کا نعرہ ہے

GAY IS GOOD

یہ انہیں DOB کہتے ہیں۔ امریکہ میں یہ تنظیم ایک خاتون ڈیل مارٹن نے قائم کی تھی۔

WOMAN IN SEXIST SOCIETY.

ہیں اور روز بروز زیادہ سے زیادہ تعداد میں ہم جنسیت سے رجوع لا رہے ہیں۔ معاشرے پر عورت حاوی ہوتی جا رہی ہے۔

آخر میں یہ دیکھنا ہے کہ ہم جنسیت اور لہجائی عشق کے اسباب کیا ہیں۔ اربابِ نظر نے تین اسباب سے بحث کی ہے، عضویاتی، نفسیاتی، معاشرتی۔

کرافٹ ایننگ، ڈاکٹر مال اور پرفیسر مائٹاگیرا کے خیال میں ہم جنسی میلان خلقی اور عضویاتی ہوتا ہے۔

بلاغ نے بھی اس رائے کی تائید کی ہے۔ اس کے خیال میں بعض حالات میں جنسین کے جنسی نظام میں ایسی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں کہ ہم جنسی میلان بچے کی سرشت میں نفوذ کر جاتا ہے اس

نظریے کے حامی ہارمون (یونانی زبان میں اس کا معنی ہے حرکت دینا) سے بھی دلیل لاتے

ہیں۔ پہلے پہل شائنی ناخ نے ثابت کیا کہ خصلتیں اور بیضہ انٹی ہارمون پیدا کرتے ہیں جو مردانگی

اور نسوانیت کے ذمے دار ہیں اور جسمانی اور ذہنی توانائی پیدا کرتے ہیں۔ بچوٹری غدد کے

ہارمون پر خصلتیں اور بیضہ کی فعالیت منحصر ہے۔ ہر عورت کے جسم میں مردانہ ہارمون اور ہر مرد کے

جسم میں زنانہ ہارمون موجود ہوتے ہیں خواہ وہ کتنی ہی قلیل تعداد میں ہوں۔ بعض حالات میں یہ

خفصہ ہارمون زیادہ فعال ہو جاتے ہیں اور لڑکا لڑکی بن جاتا ہے یا لڑکی لڑکا بن جاتی ہے۔ لہجائی

عورتوں کا جنسی نظام عام عورتوں سے مختلف ہوتا ہے اور ان کے مردانہ عناصر عام عورتوں سے

زیادہ نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ان عورتوں کا قد لمبا تر، زنگا، ٹانگیں اور بائیں دہلی تیلی، کہنیاں اور گھٹنے

اُبھرے ہوئے، اوپر کے ہونٹ پر بال ہوتے ہیں، آؤڈ کرفت ہوتی ہے۔ وہ مرد سے نفرت کرتی ہیں

اور ان کا بظہر نمایاں طور پر بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ امردوں کے جسم کے زادیے گول اور گدرائے ہوئے

ہوتے ہیں، چہرہ تروتازہ ہوتا ہے، دائرہ منچھوٹ کے بال کم ہوتے ہیں۔ کوہے بھاری بھر کم،

کنڈھے گول اور سینہ بھرا بھرا ہوتا ہے۔ ان کی آواز باریک ہوتی ہے جنسین کے جنسی نظام میں خلل

آجانے سے بعض اوقات بچے میں مردانہ زمانہ دونوں قسم کے آلات تناسل موجود ہوتے ہیں۔ نارمل مرد

اور نارمل صورت کے ہارمون میں ایک خاص تناسب و توازن موجود ہوتا ہے۔

ہم جنسیت کا سب سے موثر دفاع ایک جرمین عالم کارل ہائٹنخ آئریخ نے کیا تھا۔ آئریخ ۱۸۲۵ء میں پیدا ہوا۔ وہ خود پیدائشی ہم جنسی تھا اور ہم جنسیت کو فطری اور قانونی فعلیت منوانے کے لئے عمر بھر جدوجہد کرتا رہا۔ اس موضوع پر اُس نے کئی کتابیں تالیف کیں۔ وہ نارمل آدمی کو دیوہنگ اور ابنا رمل کو آرہنگ کہتا ہے۔ موخر الذکر میں بولوگ زنخ مردوں سے عشق کرتے ہیں۔ انہیں وہ مین ہنگ اور مردوں کو ویب ہنگ کے نام دیتا ہے۔ اُس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ہم جنسی میلان خلقی ہوتا ہے اور ہم جنسی عورتیں مرد ذہنی، ذوقی، روحانی اور اخلاقی لحاظ سے نہ صرف نارمل آدمیوں کے ہم پلہ ہوتے ہیں بلکہ اُن پر برتری بھی رکھتے ہیں۔ اُن میں ذہانت، خلوص اور انسانی ہمدردی کے جذبات نمایاں طور پر موجود ہوتے ہیں اور وہ عام طور سے موسیقی اور شاعری کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ وہ خوشی اور غم سے شدید تاثر لیتے ہیں اور دوسروں کی بہ نسبت زیادہ مخلص اور پیار کرنے والے ہوتے ہیں۔ آئریخ اور اُس کے ہم نواؤں کی کوششوں سے فی زمانہ ہم جنسوں سے نفرت کرنے کے بجائے اُن کے مسائل کو ہمدردی سے سمجھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

معاشرتی سبب وہی ہے جسے رچرڈ برٹن نے ہم جنسیت کا واحد سبب قرار دیا تھا اور جس کا ذکر گذشتہ اوراق میں ہو چکا ہے۔ اس کے خیال میں جہاں کہیں مردوں کو عورتوں کی صحبت میسر نہ آ سکے اور عورتیں مردوں سے الگ تھلگ رہیں وہاں ہم جنسی میلان اور لہجائی عشق کو پنپنے کے مواقع مل جاتے ہیں۔ گاسپر کے الفاظ میں یہ (اگتباہی ہم جنسیت) ہوتی ہے اور اس کی تہ میں مجبوری کا رفرما ہے جیسے کہ ایک فاقہ زدہ شخص نامرغوب شے بھی کھالیتا ہے چنانچہ صنف مخالف کی صحبت کے میسر آنے پر اس نوع کا ہم جنسی میلان بھی ختم ہو جاتا ہے۔

ہم جنسیت کے نفسیاتی سبب سے بحث کرتے ہوئے بعض علماء تحلیل نفسی کہتے ہیں کہ شخص فطری طور پر دو جنسی

دوجینیت کا انکشاف سب سے پہلے فلیس نے کیا تھا جس سے فرائد نے استفادہ کیا۔ اس کی مدد  
 ہر مرد کے نفس میں نسوانی اور ہر عورت میں مردانہ میلان موجود ہوتا ہے۔ بعض حالات میں ان مردانہ  
 اور زنانہ عناصر کا توازن خلل پذیر ہو جاتا ہے جس سے مرد میں نسوانیت اور عورت میں مردانگی ابھر آتی  
 ہے۔ جن بچوں کی پرورش نامساعد حالات میں ہو ان کا نفسیاتی توازن درہم برہم ہو جاتا ہے۔  
 فرائد کہتا ہے

”میں نے کسی بھی ایک مرد یا عورت کا تجزیہ نہیں کیا جس میں ہم جنسی میلان موجود  
 نہ ہو۔“ ۱۷

وہ کہتا ہے کہ ہم جنسی میلان کو دبا دیا جائے تو تشویش کی الجھن لاحق ہو جاتی ہے۔ وہ لہجہ سٹیکل  
 اور کلنورڈ ایلمن کی تحقیق یہ ہے کہ ہم جنسیت خلقی نہیں ہوتی بلکہ نفسیاتی نظام میں خلل پیدا ہو جانے سے  
 نمود پذیر ہوتی ہے۔ مہیولاک ایلمن نے کہا کہ ہم جنسیت کسی بھی نفسیاتی مرض کی علامت نہیں ہے۔  
 اُس کے خیال میں کسی ہم جنسی کو ابنا رمل کہنا زیادتی ہوگی۔ بعض مرد عورت سے مایوس ہو کر یا اس کا  
 کمتری کے تحت ہم جنسی بن جاتے ہیں۔ انہیں اس بات کا اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ عورت کی جنسی تشویش  
 نہیں کر سکیں گے۔ بعض نوجوان لڑکیاں مرد کے خوف سے ہم جنسیت سے رجوع لاتی ہیں۔ سمون دیوا  
 کہتی ہے ۱۸

”ہم جنسی عورتوں کا اختلاط بظہر کے مساحقے تک محدود ہوتا ہے۔ ایک نوجوان لڑکی  
 مرد کی درشتی اور تند مزاجی سے خائف ہو کر اپنے آپ کو اپنی سے بڑی عمر کی عورت  
 کے سپرد کر دیتی ہے۔ مردانہ قسم کی عورت میں اسے اپنے والدین کی جھلک دکھائی  
 دیتی ہے اس طرح نوجوان لڑکی حقیقی تجربے سے روگردانی کر کے عالم خیال بسا

۱۷ BI-SEXUALITY, ۱۸ COLLECTED PAPERS VOL. VI

۱۹ THE SECOND SEX,

۲۰ CLITORIS یونانی زبان کا لفظ ہے اس کا معنی ہے چابی، اسے زبور بھی کہا جاتا ہے۔

یہی ہے۔ اس کے یہاں تخیل اور حقیقت آپس میں گڈ بڈ ہو جاتے ہیں۔“

ایڈلر اور اُس کے مُقلدین کا نظریہ یہ ہے کہ اپنی کمتری کے احساس کی تلافی کے لئے بعض ہم جنس احساس برتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور جعلی فن کار اور لائالی تلمذ بن بیٹھتے ہیں۔ اپنی اس نوع کی زندگی کے جواز میں وہ دلیل یہ دیتے ہیں کہ دُنیا کے عظیم شاعر اور فن کار سبھی ہم جنسی ہی تھے مغرب میں ہم جنسیت کو خلل ذہن کی علامت یا کج روی نہیں سمجھا جاتا نہ ایک ہم جنسی یا لڑبائی کو مریض کہا جاتا ہے۔ یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ معاشرے کی نفرت اور تعسّی ہم جنسوں کو شدید احساس گناہ میں مبتلا کر دیتی ہے جو انہیں ذہنی لحاظ سے ابنا رمل بنا دیتا ہے۔ اگر معاشرہ ہم جنسوں کو رد نہ کرے، اُن سے نفرت نہ کرے تو وہ اپنے آپ کو صحت مند خیال کرنے لگیں گے۔ قانون کا خوف بھی ہم جنسوں میں احساس جرم پیدا کر دیتا ہے۔ علمائے جنسیات کے خیال میں ہم جنسوں کو بھرپور، بامسرت زندگی گزارنے کے مواقع بہم پہنچانے کے لئے ضروری ہے کہ معاشرے کے تعصبات کو دور کیا جائے اور قوانین میں مناسب ترمیم کر لی جائے۔ اطالیہ، فرانس اور برطانیہ میں ہم جنسی اختلاط کو قانوناً مباح کر دیا گیا ہے بشرطیکہ فریقین کی رضا مندی مشمول ہو۔

# قبلی

کہا جاتا ہے کہ قبلی دنیا کا قدیم ترین پیشہ ہے۔ سی، ای، ایم جوڈ لکھتا ہے۔  
تاریخ تمدن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے لئے روزی کمانے  
کا ایک ہی وسیلہ رہا ہے: اپنے جسم کا سودا کرنا۔ وہ اپنے جسم کو دو طریقوں  
سے بیچ سکتی تھی۔ وہ اُسے غیر معینہ مدت کے لئے کسی ایک شخص کے ہاتھ بیچ  
دیتی یا بہت سے مردوں کے ہاتھ مختصر سی معینہ مدت کے لئے بیچتی۔ پہلا طریقہ  
شادی کہلاتا ہے، دوسرے کا نام قبلی ہے۔“

علمائے تمدن قدیم ہمیں بتاتے ہیں کہ قبلی مذہب کے زیر سایہ پروان چڑھی۔ ابتدائیں بیابان  
عورتوں کی بہ نسبت کمبیوں کو زیادہ ممتاز سمجھا جاتا تھا کیوں کہ وہ معبدوں میں مقدس پروہتانیوں  
کے فرائض بھی انجام دیتی تھیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ زرعی انقلاب کے بعد مملکت  
کی داغ بیل ڈالی گئی اور اس کے ساتھ ہی مذہب کی تنظیم عمل میں آئی۔ اس دور کے مذہب میں  
آسمان دیوتا، سورج دیوتا، اور دھرتی مائی کی پوجا بڑے ذوق و شوق سے کی جاتی تھی۔ دھرتی  
مائی کی کوکھ سے فصلیں اُگتی تھیں، آسمان سے مینہ برستا تھا جو انہیں سیراب کرتا تھا اور سورج  
ان فصلوں کو پکاتا تھا۔ لوگ بل چلانے اور جنسی ملاپ کے عمل کو ایک جیسا ٹراڈ خیال کرتے تھے  
اس سے یہ عقیدہ راسخ ہوا کہ دھرتی مائی کے معبد میں کثرت و توازن سے جنسی ملاپ کیا جائے تو افزائی  
کی بار آوری اور زرخیزی کو تقویت ہوگی۔ فریڈر نے کہا ہے کہ یہ مثبت جادو کی ایک صورت تھی  
جس کا مطلب یہ تھا کہ فطرتی اعمال کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کے لئے اُن سے ملتے جلتے

عمل کئے جاتے تھے مثلاً بارش برسانا مقصود ہوتا تو زمین پر پانی اندھیلے تھے چنانچہ دھرتی مائی  
 کے معبودوں میں منتخب حسین لڑکیاں رکھی جاتی تھیں جن سے پجاری اور یا تری متبع کرتے تھے اُمراء  
 اور روساء بھی اپنی بیٹیاں ان معبودوں کی بعیت کرتے تھے۔ ان مقدس کبھیوں یا دیوتاؤں  
 کی تکریم کی جاتی اور مذہبی اور فصلانہ تہواروں پر انہیں اُمراء کی صف میں جگہ دی جاتی تھی بڑھتی  
 کے خیال میں مقدس قبلی کا آغاز سُمیریا کے شہر اردک سے ہوا جہاں عشتار دیوی کے معبود  
 میں مقدس کبھیاں رکھی جاتی تھیں۔ ان کی قیام گاہ کو چاچم کہتے تھے۔ ان کی نگہانی پر بڑی پریشانی  
 مامور تھی۔ بعد میں سُمیریا کی عشتار بابل اور اشوریا کی صنیت میں بارپاگئی۔ شام کی عشتارقی اور فنیقیہ کی  
 عشتورت اسی سے یادگار تھیں۔ مہر قدیم میں آکسس، یونان میں افروڈائیٹس، ایشیائے کوچک  
 میں سائیسیلی اور روم میں وینس بار آدرسی، افزائش، حسن و شباب اور عشق و محبت کی دیویاں  
 تھیں جو دھرتی مائی ہی کی مختلف صورتیں تھیں۔ ان کے معبودوں میں جنسی ملاپ کی عام اجازت  
 تھی۔ دیویوں کے سالانہ تہواروں پر جو عام طور سے فصلیں بونے اور کاٹنے پر منائے جاتے تھے  
 ہزاروں پجاری شرکت کرتے تھے۔ عورتیں مرد مل کر سازوں کی دلولہ انگیز گون پر دیوانہ وار ناچتے  
 اور جنسی بے راہ روی کے مظاہرے کئے جاتے تھے۔ بابل میں عشتار کا عظیم الشان مندر تھا۔ اس کے  
 وسیع و عریض صحن میں کدیشہ (مقدس کبھیاں) رنگ برنگ کے مرا پردے لگا کر بیٹھتی تھیں۔ ان  
 میں شراب و کباب بھی مہیا کئے جاتے تھے۔ ہیرودوٹس لکھتا ہے۔

”بابلیوں کی ایک رسم بڑی شرمناک ہے۔ ہر جوان عورت کو اپنی عمر میں ایک مرتبہ  
 زہرہ (عشتار) کے مندر میں جا کر کسی نہ کسی یا تری سے مقاربت کرنا پڑتی ہے۔ اُمراء  
 کی عورتیں نوذلوں کے بھرمت میں گارڈیوں میں بیٹھ کر آتی ہیں جن پر پردے چھٹے  
 ہوتے ہیں اور مندر میں بیٹھ جاتی ہیں۔ اکثر عورتیں مندر کے اندر اپنے سروں پر پھولوں  
 کے ہار لپیٹ کر بیٹھتی ہیں ہر وقت لوگوں کا ہجوم رہتا ہے اور آئندہ روزند کثرت سے  
 دکھائی دیتے ہیں۔ عورتوں کے درمیان رسیاں کھینچ کر نشان دہی کر دی جاتی ہے

اور یا تری وہاں جا کر اپنی پسند کی عورت چُن لیتے ہیں۔ جو عورت ایک بار مندر میں آجائے وہ واپس نہیں جاسکتی جب تک کوئی اجنبی اُس کی طرف چاندی کا ایک بکے نہ پھینکے اور اُس کے ساتھ خلوت میں نہ جائے۔ جب وہ بکے پھینکتا ہے تو کہتا ہے ”دیوی تجھے برکت دے“ چاندی کا بکے خواہ کتنی ہی مالیت کا ہو عورت کو قبول کرنا پڑتا ہے کہ اس سے انکار کرنا خلاف قانون ہے۔ جب یہ بکے پھینک دیا جائے تو مقدس بن جاتا ہے۔ پہلا آدمی جو بکے پھینکتا ہے عورت اُس کے ساتھ خلوت میں چلی جاتی ہے اور انکار نہیں کرتی۔ اس طرح دیوی ملن ہو جاتی ہے اور عورت فارغ ہو کر اپنے گھر چلی جاتی ہے۔ اس کے بعد کسی قیمت پر بھی اس سے معاشرہ نہیں کیا جاسکتا۔ کشیدہ قامت خوبرو عورتیں جلد فارغ ہو جاتی ہیں جب کہ بد صورت عورتوں کو خاصی مدت تک انتظار میں بیٹھا پڑتا ہے۔“

یونان قدیم میں افروڈائیٹ کے معبدوں میں مقدس کسبیاں پجاریوں اور یا تریوں کے تعارف میں آتی تھیں۔ ہندوستان کے مندروں میں سیکڑوں دیوداسیاں رہتی تھیں جنہیں گانے بجانے اور ناچنے کی تعلیم دی جاتی تھی۔ پنڈت اور پجاری ان سے بلا تکلف فیض یاب ہوتے تھے۔ دیوداسیاں دن میں دوبارہ ٹورتیوں کے سامنے گاتی ناچتی تھیں اور ناچتے وقت نہایت ہوس پرور انداز میں ہوا بتاتی تھیں۔ سوم ناتھ کے مندر میں پانچ سو دیوداسیاں موجود تھیں جو صبح و شام رقص و سرود کی محفل برپا کرتی تھیں۔ اس مندر کے ساتھ ہزاروں دیہات وقف تھے اور اس میں بڑے بڑے امراء اور راجے مہاراجے اپنی بیٹیاں بھینٹ کرتے تھے۔ سیورلی نکس کے بقول جنوبی ہند میں سری رنگم اور ترچناچی کے مندروں میں آج بھی دیوداسیاں موجود ہیں۔ مقدس قبیگی کا یہ ادارہ جناب مسیح کے بعد بھی یونان میں باقی رہا حتیٰ کہ قیصر بازنطین نے عیسائی مذہب قبول کیا اور ان مندروں کو مسمار کر دیا۔ مذہبی قبیگی کے استیصال کے بعد عصمت فروشی نے کاروباری صورت اختیار کر لی اور دھوکا انہاس کی طرح عصمت و عفت بھی برسرِ بازار بکھنے لگی۔ برٹرنڈسل لکھتے ہیں۔

» عیسائیت کی اشاعت سے پہلے قبلی مندروں تک محدود تھی جہاں اسے ایک مقدس پیشہ سمجھا جاتا تھا۔ عیسائی برسرِ اقتدار آگئے تو انہوں نے مندروں کو منہدم کر دیا اور اس ادارے کا خاتمہ کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عصمتِ فروشی معاشرے میں ہر کسی نفوذ کر گئی اور اسے خرید و فروخت کی جنس بنا لیا گیا جس سے قبحِ خانوں کے مالک بے انتہا نفع کمانے لگے۔ ان منظم قبحِ خانوں میں کسی کی حیثیت محض ایک عورت کش کی تھی، نفع مالکوں کی عیب میں جاتا تھا۔ ہمارے زمانے کی آزاد کسبی کا وجود بعد میں ظاہر ہوا۔ ہندوستان میں ابھی تک مذہبی عصمتِ فروشی کا ادارہ پوری طرح ختم نہیں ہوا۔

جب حمران طبقے نے دیکھا کہ عصمتِ فروشی ایک منفعت بخش کاروبار ہے تو اسے منظم کر کے آمدنی کا وسیلہ بنا لیا گیا۔ سب سے پہلے سولن نے ایتمننز میں سرکاری قبح خانہ کھولا، اُس کے قواعد بنائے اور کیوں کو مختلف طبقات میں تقسیم کر کے ان کی خرچی مقرر کی۔ اہل یونان اسے درجے کی کسبیوں کو پورنائی کہتے تھے جو بندر گاہوں میں جہاز رانوں کے لئے لطفِ صحبت کا سامان کرتی تھیں۔ ان کا محلہ سب سے الگ تھا۔ ان کے گھروں کے دروازوں پر دیوتا پرانے پس کا بیگ بطور نشان کے لٹکایا جاتا تھا۔ کبیاں دروازوں میں نیم برہنہ بیٹھتی تھیں اس لئے انہیں ہینائی (نحوی معنی ہے شگابہ جناسٹک کا لفظ اسی سے مشتق ہے کیوں کہ جناسٹک کرتے وقت کپڑے اتار دیتے تھے) کہتے تھے۔ تماشبیں ان سے ایک دن، ایک ماہ یا ایک سال کا معاہدہ کر لیتے تھے۔ بعض اوقات چند شرائط پر دو یا تین مردوں کو ایک کسبی کرائے پر دے دی جاتی تھی۔ کسبیوں کے کمرے کی دیواروں پر نہایت فحش تصاویر بنائی جاتی تھیں جیسا کہ پومپائی کے کھنڈروں سے پتہ چلتا ہے۔ پورنائی سے بلند تر طبقہ آل ٹرائڈ (بیسری بجانے والیاں) کا تھا جو جاپان کی گیشاؤں کی طرح ناچ گانے کا دھندا کرتی تھیں۔ ناچ کے بعد انہیں مہمانوں کی خدمت میں جانا پڑتا تھا۔ بورٹھی ناکاؤں نے انہیں ناچ گانے کی تعلیم دلانے کے لئے درس گاہیں کھول رکھی تھیں جہاں انہیں مردوں کا دل لُبھانے اور انہیں رجھانے کے انداز و نماز سکھائے جاتے تھے۔ سب سے بلند طبقہ

لے شادی اور اخلاق

ہمیرا (لفظی معنی 'خاقان دوست') کا تھا جو عام طور سے شہری ہوتی تھیں اور اپنے گھروں میں دھندلا  
 کتی تھیں۔ کوچہ گرد کہیاں بھی تھیں جو اپنے جوتوں کے تلوں پر کھدوائی تھیں "میرے پیچھے پیچھے  
 چلے آؤ" وہ راستہ چلتی تو یہ الفاظ زمین پر کندہ ہو جاتے تھے اور تماشین اُن کے پیچھے چلے جاتے۔  
 یونانِ قدیم میں عورتیں پردے میں رہتی تھیں اور مردوں کی مجالس میں شرکت نہیں کر سکتی  
 تھیں۔ ان کا کام گھر کے معاملات کی دیکھ بھال کرنا تھا۔ اوائلِ عمر میں ہی گھر کے دھندے میں لگ جانے  
 کے باعث وہ تعلیم سے محروم رہتی تھیں۔ ان کے برعکس ہمیرا تعلیم یافتہ ہوتی تھیں اور علوم و فنون میں  
 دسترس رکھتی تھیں۔ وہ علمی مباحثوں میں شرکت کرتیں اور اپنے استدلال سے بعض اوقات فلاسفہ کو  
 بھی جواب کر دیتی تھیں۔ تاریخ میں اونچے پائے کی ہمیرا کے حالات محفوظ ہیں۔ ایک دیوتیہ تھی  
 جسے سقراط اپنی استاد مانا تھا، آکر کے نیا تھی جس سے افلاطون جی بہلاتا تھا، دانی تھی جس نے  
 ایقورس کو غلط فہم کرنے کے روز بتائے تھے، تیمورس تھی جو سوفوکلز کے بڑھاپے کو گرمانی تھی،  
 اسپاشیا تھی جو فلسفہ و ادب میں بصیرت رکھتی تھی اور جس کی ناز برداری میں پریکلیز سرگرم رہتا تھا،  
 قسٹونو تھی جس نے سیکڑوں نوجوانوں کو عشق بازی کے آداب سکھائے تھے، نتیجیہ تھی جو اپنی  
 سین بیٹی کے لئے ایک رات کے ایک ہزار درہم مانگتی تھی، کیپ سڈرا تھی جس کا یہ نام اس لئے  
 پڑ گیا تھا کہ وہ بالو گھڑی سامنے رکھ کر اپنے سر پر ستوں کو ٹھہراتی تھی۔ چوتھی صدی قبل مسیح میں ایتمنیکی  
 فرنی کے سن دجال کا شہرہ تھا۔ کو دتھ کی لیٹ کے حسن جہاں سوز کا دور دور تک چرچا تھا۔ اُس کے  
 ہم وطن اُسے فاتحِ اعظم کہا کرتے تھے۔ سنگ تراش مالی سن نے اپنے ایامِ پیری میں لیٹ کو اس بات  
 پر آمادہ کر لیا کہ وہ ایک جھٹے کی تراش کے دوران میں اُس کے سامنے کھڑی ہو کر سے۔ لیٹ نے لباس  
 اتارا تو مالی سن بایں ریش سفید ہزار جان سے اُس پر فریفتہ ہو گیا اور اظہارِ مدعا کرنے لگا۔ لیٹ  
 نے مسکرا کر کندھے جھٹکائے، کپڑے پہنے اور چلی گئی۔ مالی سن کے سر پر عشق کا نبوت سوار تھا۔ اگلی  
 لے نفوی معنی بالو گھڑی۔ مارس ڈیکو برا کے بھتیجی پیرس کی کبھی نے اپنے کمرے کی دیوار کے ساتھ میڈ  
 لگا رکھا تھا جس کے مطابق وہ خرچی وصول کیا کرتی تھی۔ (پیرس میں ایکس راتیں)

صبح اُس نے جھامت بنوائی، خضاب لگایا، ارغوانی چغہ پہنا، طلائی کمر بند کسا، گلے میں سونے کی زنجیریں آویزاں کیں، انگلیوں میں جڑاوا انگوٹھیاں پہنی، رخساروں پر غلغلہ لگایا، جسم اور لباس کو خوشبو میں بسایا اور لیٹ کے دروانے پر جا کھڑا ہوا۔ دستک دینے پر لیٹ نمودار ہوئی تو مائی سن حرفِ مطلب زبان پر لایا۔ لیٹ نے ایک ہی نظر میں گذشتہ رات کے بڑے کو پہچان لیا اور کہا ”میرے دوست! کل ہی درخواست تمہارے باپ نے کی تھی اور میں نے ٹھکرا دی تھی“ اور کھٹ سے دروازہ بند کر دیا۔ لیٹ مرگئی تو اُس کے ہم وطنوں نے اُس کے مزار پر شاندار مقبرہ تعمیر کرایا۔ اہل یونان کسبوں کو پیار سے بیل، ابابیل، جگنو، گزیا، شیرنی، چڑیا، مشعل، انجیر اور شہد کا چھتہ کہا کرتے تھے۔ ایٹھنز کے نوجوان تربیت کے لئے یا تو فلاسفہ کے پاس جاتے تھے اور یا کسبوں کے یہاں بیٹھتے تھے۔ کسبیاں فلسفیوں کو اپنے حریف سمجھتی تھیں اور انہیں بُرا بھلا کہا کرتی تھیں۔ یونان کے ایک جنرل تھسٹوکلیز کو ایک عجیب شوق تھا۔ وہ بازار میں سے گذرتا تو گھوڑوں کی بجائے کسبوں کو رتھ میں جوتا کرتا تھا۔ سکندر نے ایک کسبی تائیس کے اُگسانے پر ایرانیوں کا عظیم الشان شہر امطر آگ لگا کر خاکستر کر دیا تھا۔

روم میں قبہ خانے کو لوبانار (لغوی معنی ”بغیر طے کا غار“) کہتے تھے۔ یونانیوں کی طرح روم کے ریس زادے بھی شائستگی کے آداب سیکھنے کے لئے کسبوں کے ہاں جاتے تھے۔ شاعر اووڈ کہتا ہے کہ روم میں کسبیاں آپہمان کے تاروں کی طرح بے شمار تھیں۔ لاؤڈیسیا کے شہر میں منڈی کا دروازہ ہر روز برسرِ عام اجنبیوں کے ہاتھ کسبوں کی خرچی نیلام کیا کرتا تھا اور گاہکوں کو ایک ایک پھل دے دیتا تھا۔ رات کو چھاپہ مارتے تھے۔ کوئی شخص بغیر اس پھل کے کسی کسبی کے یہاں پکڑا جاتا تو اسے سزا دیتے تھے۔ کسبیاں عموماً کمزیر ہوتی تھیں جن سے اُن کے آقا پیشہ کراتے تھے۔ سرے والے اور تنور والے بھی کسبیاں رکھتے تھے۔ حماموں اور قبرستانوں تک میں کسبیاں موجود رہتی تھیں۔ روم میں کسبوں کو شریف عورتوں سے پہچاننے کے لئے مردانہ وضع کا چغہ پہنا کر ناچاراً ”رسیان رومی“ کی کتاب ”رندلیوں کی بات چیت“ میں ایک عورت نے اپنی مٹی

کو رہائی کو ہدایات دی ہیں کہ نوجوانوں کو کس طرح دام فریب میں پھانسا جاسکتا ہے۔

ہندوستانِ قدیم میں عام کسبیوں کو رُوبا جیوا یا کلوٹا کہتے تھے۔ ان میں اونچا طبقہ ویشیا اور نرکتی (گانے بجانے والیاں) کا تھا۔ پڑھی لکھی شائستہ کسبیوں کو گنیکا کہتے تھے۔ کوٹلیہ کے ارتھ شاستر میں ہدایت کی گئی ہے کہ راجہ مہاراجے اپنے محلوں اور درباروں میں منتخب حسین کسبیاں رکھیں جو جلوس میں پھرتا ٹھاٹھ پر چلیں، تاج لگا کر ان کا دل بہلائیں، ان کے جسم کی مالش کریں اور آرتی اتائیں۔ راجہ دربار سے واپس محل میں آتے تھے تو کسبیاں انہیں نظر بد سے بچانے کے لئے آرتی اتارتی تھیں۔ انہیں شاہی خزانے سے تنخواہ دی جاتی تھی اور ان کی تعلیم و تربیت پر پنڈت مامور تھے۔ کوٹلیہ نے ان کسبیوں کو جو اپنے گھروں میں پیشہ کراتی تھیں حکم دیا کہ وہ بے چوں و چرا تماثیلوں کو خوش کریں۔ جس کسی سے کوئی تماثیل ناراض ہو گا اسے جرمانہ کیا جائے گا۔ ہر کسی دن بھر کی کائی (بھوگ) کا حساب سرکاری درود کو دیتی تھی اور ہر ماہ اپنی ایک دن کی کائی کا دکن بطور محصول حکومت کو ادا کرتی تھی۔ جو لوگ زندگیوں کو ناچ گانا، دل بُھانے کا فن، اور سنگھار کے طریقے سکھاتے تھے انہیں سرکاری خزانے سے تنخواہ دی جاتی تھی۔ نین عشوہ فروشی پر دامور گپت کا رسالہ مثنیٰ مہتمم مشہور ہے جس میں ایک عمر رسیدہ نانک ایک فوجی کو ہدایات دیتی ہے۔ اس کا انداز بیان بڑا لطیف ہے۔

”جس طرح سونے چاندی میں منڈھا ہوا ہیرا آنکھوں کو زیادہ اچھا لگتا ہے۔ اسی

طرح عورت بھی اپنے پر تیم کی باہوں کے گھرے میں زیادہ جلی دکھائی دیتی ہے۔“

”رُوب جوانی جیون کا دھن ہے اور بسنت ساری رُتوں کی دولت، پر میرے پیارے،“

یہ کسی کو MERETRIX کہتے تھے جس کا لغوی معنی ہے دکانے والی، لفظ کسی، اس کا صحیح مترادف ہے۔

مے آرٹی پیتل کا کئی قبیلوں کا چارخ ہوتا ہے جسے سر کے گرد پھراتے ہیں تاکہ نظر بد اثر نہ کر سکے۔ بعد میں وہ جہن جو اس موقع پر گائے جاتے تھے آرٹی کہلانے لگے۔

میرے من موہن سب سے بڑا دھن بھی ہے کہ کوئی پریم اور کامنا کے مزے اٹھا کر امرت کے دو گھونٹ پی لے اور امر ہو جائے۔“

”پریم سے کوری جوانی کس کام، جوانی سے کورا پریم کس کام کا اور کامنا سے کورے روکھے سوکھے پریم اور جوانی دونوں کس کام کے؟“

”بیمین کا پھل آزادی ہے اور جوانی کا پھل موہ لوبھ میں ہے، بڑھاپے کا پھل اتھا کی شانتی میں ہے۔“

کام شاستر کا مصنف پنڈت واسیاں کہتا ہے کہ مہتول کھسیوں کا فرض ہے کہ وہ مندر تعمیر کرائیں، باغ لگوائیں، کتھیں کھدوائیں اور برہمنوں کو گودان دیں چند گھنٹے مور کیہ کھسیوں سے جاسوسی کا کام لیتا تھا۔ ہندوستان میں سوہ کو نکاح ثانی کی اجازت نہیں تھی اس لئے وہ بسا اوقات کھب معاش کے لئے عصمت فروشی کا دھند کرتی تھیں۔ چنانچہ لفظ رنڈی کا معنی سوہ بھی ہے اور کسی بھی سنسکرت کی تشبیہ میں اعلیٰ طبقے کی رنڈیوں کا ذکر آیا ہے۔ پتر لکھا اور دست سینا اپنے سن و بھال، ناز و ادا اور شوکت و جمل کے لئے مشہور تھیں۔ شدرک نے اپنے ایک ناولک مرچھ کٹنگ میں دست سینا کے مکان کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

”اس مکان میں آٹھ مختلف درجے ہیں جن میں پتھروں کی بچی کاری کی گئی ہے اور نہایت قیمتی قالین بچھے ہوئے ہیں۔ دروازوں کی محرابوں پر سونے کے پتر جڑے ہیں اور پرتکلف رنگ آمیزی کی گئی ہے، زینے سنگ مرمر کے ہیں قیمتی پردے پڑے ہیں، بستوں پر بلور کے کاسے اور ظروف رکھے ہیں۔ پردوں کی بھالوں میں موتی کی لڑیاں لگی ہوئی ہیں۔ جاجا قمار بازی کی میزیں ہیں جن کے گرد اجمین کے اعلیٰ طبقے کے تماشبین بیٹھے ہیں، ارباب نشاط حاضر ہیں، گانے والے، ناچنے والے، بھانڈ صاحب خانہ کے اشارے کے مستقر ہیں، اعلیٰ کی دیوار پر دکائیں بنی ہیں جن میں عطار، جودھری وغیرہ موجود ہیں، نوکر، طفیلی آپس میں باتیں کر رہے ہیں اور ہنس رہے ہیں، ہنسک آلود پانی اور سپاری پیش کی جا رہی ہے اور شراب

کا دور چل رہا ہے، جا بجا عرض ہیں جن میں زرغرانی پانی بھرا ہے پٹلائی پنجروں میں  
 طوطے، مینا، ببلں چہرا رہے ہیں۔ پائیں باغ میں ریشمی جھولے لٹک رہے ہیں۔  
 امبا پائی و شالاک مشہور کسی تھی جس نے گوتم بدھ کو اپنے باغ میں ٹھہرایا تھا اور پھر یہ باغ اُس کو  
 بخش دیا تھا۔ مسلمان سیاستوں اور مورخین نے لکھا ہے کہ ہندو راجے کبیوں پر جو محصول عائد کرتے  
 تھے اُس کی رقم پولیس اور فوج پر خرچ کی جاتی تھی عبدالرزاق سمرقندی جو دبیا نگر میں سفیر بن کر  
 گیا تھا لکھتا ہے۔

”ملک کے عین مقابل کو قال شہر کا دفتر ہے جس کے ماتحت بارہ ہزار پولیس کے  
 سپاہی ہیں۔ اُن کی تنخواہیں اُن کے محاصل سے ادا کی جاتی ہیں جو قحبہ خانوں پر لگا  
 جاتے ہیں۔“

ابو ریحان البیرونی نے کتاب الہند میں لکھا ہے کہ ہندو راجے کبیوں کو اپنے شہروں کے لئے باعث  
 زینت سمجھتے تھے اور انہیں رعایا کے لئے عیش و عشرت کا سامان خیال کرتے تھے۔ ان کبیوں پر جو  
 محصول لگایا جاتا تھا یا جو جرمانے کئے جاتے تھے اس کی رقم سے وہ اپنی فوج رکھتے تھے۔

دنیائے اسلام میں بردہ فروشوں کے گھر عصمت فروشی کے اڈے بن گئے جہاں حسین کنیزیں  
 امیر زادوں کو آدابِ معاشرت سکھاتی تھیں۔ جب وہ ناز و ادا سے انہیں بُھالیتیں تو طرح طرح کی فرمائشیں  
 کر کے انہیں کنگال کر دیتی تھیں۔ الف لیلہ و لیلہ میں ہارون الرشید اور ابوالحسن کی کہانی میں ایک  
 بردہ فروش طاہر ابن الاعطلیٰ کا ذکر آیا ہے جو کسی تاشین کو اپنی کنیزوں کے پاس ایک رات ٹھہرنے کے  
 دس دینار وصول کیا کرتا تھا۔ تاریخ اسلام میں سب سے پہلے حفصہ الدولہ دیمی نے عصمت فروشی کو  
 منظم کیا اور کبیوں پر محصول لگایا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ کبیاں نہ ہوں تو شوریدہ سرفروشی رعایا کی باعصمت  
 عورتوں کے لئے وبال جان بن جاتے ہیں۔ علاء الدین خلجی نے جو چور بازار سی اور گراں فروشی کا دشمن تھا  
 ’جنس لطیف‘ کی خرید و فروخت کے لئے بھی قوانین وضع کئے۔ فرشتہ لکھتا ہے

لے کتاب الہند، البیرونی

”سلطان علاء الدین خلجی نے بازار کی تمام اجناس و اشیاء کے نرخ مقرر کئے۔ حکم عدلی کرنے والوں کو جرت ناک سزائیں دی جاتی تھیں۔ ایک دن ایک درباری نے دست بستہ عرض کیا حضور نے سب سے زیادہ ہر دلعزیز اور مقبول جنس کو تو نظر انداز کر دیا ہے سلطان نے چہن بچیں ہو کر پوچھا ”کون سی جنس؟“ درباری نے کہا ”حسن و شباب، سلطان سمجھ گیا اور مسکراتے لگا۔ اُس کی ہدایت کے مطابق تمام کسیوں کو عمر اور حسن و جمل کے لحاظ سے مختلف گروہوں میں تقسیم کیا گیا اور اُن کی غریبی مقرر کر دی گئی، پھر فرمان جاری کیا کہ جو کسبیاں مقررہ شرح سے زیادہ رقم وصول کریں گی انہیں سخت سزا دی جائے گی۔“

فیروز شاہ تغلق نے انسدادِ قہنگی کا ارادہ ترک کرتے ہوئے کہا ہے  
 ”میں نے زنانِ بازاری کا جو عظیم فحش کرتی تھیں نکاح کرنے کا حکم دیا لیکن اراکین نے عرض کی کہ اگر ان کا نکاح کر دیا گیا تو اگر مشہری شادی شدہ عورتوں سے بیکاری میں مبتلا ہو جائیں گے لہذا میں نے سکوت اختیار کیا۔“

جلال الدین اکبر نے کسیوں کی ایک خاص بستی بسائی جس کا نام شیطان پورہ رکھا۔ شیطان پورہ کا رخ کرنے والوں کو اپنا نام اور پتہ لکھوانا پڑتا تھا۔ ازالہٴ بکارت کے لئے بطور خاص سرکار سے اجازت لینا پڑتی تھی۔ کبھی کبھار اکبر کسیوں کو بلایا کرتا اور اُن سے گریڈ کرید کر پوچھا کرتا کہ تمہاری دوشیزگی کس نے غارت کی تھی۔ وہ نام بتائیں تو اُن مردوں کو خواہ وہ اُس کے درباری ہوتے سزا دیتا تھا۔ بجا پور کے احوال میں اسد بیگ لکھتا ہے۔

”بازار میں ایک طرف شراب فروشوں کی دکانیں تھیں اور دوسری طرف زندیاں ہار سنگھار کر کے بیٹھتی تھیں۔ اس بازار میں ہر وقت گہما گہمی رہتی تھی۔ لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ شراب خانوں میں بیٹھ کر مزے سے پیتے تھے۔ ناچنے گانے والیوں کے

لے فتوحاتِ فیروز شاہی      لے وقائع

کوٹھوں پر ہر وقت جگمگاتے رہتا تھا۔“

گولکنڈہ کے بارے میں تیسری نثر کہتا ہے لے

” گولکنڈہ کے مصافات اور قلعے میں جو بذاتِ خود ایک شہر ہے، ایک اندازے کے

مطابق میں ہزار سے زیادہ کسبیاں رہتی ہیں جن کے نام داروغہ کے رجسٹر میں

درج ہیں۔ یہ ہمیشہ اختیار کرنے کے لئے انہیں رجسٹر میں نام لکھوانا پڑتا ہے۔ ان

سے بادشاہ کوئی محصول نہیں لیتا البتہ ہر جمعہ کے دن ان میں سے بعض کو اپنی ناکھ

اور سازندوں کے ساتھ شاہی بھروسے کے سامنے چوک میں حاضری دینا پڑتی ہے۔

بادشاہ بھروسے کے سامنے بیٹھا ہوتا وہ بھڑکتی ہیں، نہ ہوتا تو ایک خواجہ سرا انہیں واپس

چلے جانے کا اشارہ کر دیتا ہے۔ شام کے وقت جب ہوا میں خنکی ہوتی ہے وہ اپنے

مکانوں کے دروازوں میں بیٹھتی ہیں۔ یہ مکان بھوسٹے کی وضع کے ہوتے ہیں۔

رات کے وقت وہ اپنے دروازوں میں شمعیں یا دیے روشن کر کے رکھتی ہیں جو

گویا دعوت کا اشارہ ہوتا ہے۔ اسی وقت تارڑی کی دکانیں کھل جاتی ہیں۔ تارڑی

ایک درخت کا مشروب ہے۔ ہر روز پانچ چھ سو گھوڑے تارڑی کی مشکوں سے لدے

ہوئے شہر میں داخل ہوتے ہیں بادشاہ کو تارڑی کے محصول سے خاصی رقم وصول ہوتی

ہے۔ اسی آمدنی کی خاطر اتنی بڑی تعداد میں کسبیوں کو پیشہ کرانے کی اجازت دی جاتی

ہے۔ انہی کسبیوں کے باعث تارڑی کی کھپت ہوتی ہے۔ تارڑی بیچنے والوں نے اپنی

دکانیں کسبیوں کی بستی کے قریب کھول رکھی ہیں۔ یہ عورتیں اس قدر سبک خرام اور

چاق و چوبند ہوتی ہیں کہ جب شاہ وقت نے مسولی ٹیم جانے کا ارادہ کیا تو نو کسبیوں

نے مل کر ہاتھی کی شکل بنائی۔ چار عورتیں پاؤں بنیں، چار نے جسم بنایا، ایک ٹونڈ بن

گئی۔ ان کے اوپر ایک تخت بچھا دیا گیا۔ اس سواری پر بادشاہ سلامت شہر میں داخل ہوئے۔“

لے سیاحتِ ہند، سفرنامہ ہند

نواب وزیر شجاع الدولہ کبھیوں کی صحبت کا بڑا دلدادہ تھا۔ اُس کے زمانے میں دُور دُور سے کبیاں لکھنؤ میں ہجوم کر آئیں۔ لکھنؤ کی کبیاں تین مکڑیوں پر تقسیم تھیں۔ (۱) کپنیاں پیشہ درپیشہ کبیاں تھیں جو ناچنے کی ماہر تھیں۔ (۲) چوڑے والیاں۔ (۳) ناگرنیاں، ان میں ہر قسم کی عورتیں تھیں۔ اُنچے درجے کی طوائفیں ڈیرہ دار کہلاتی تھیں۔ ان کے کوٹھوں پر نوچیوں کو ناچ گانے کے ساتھ ادب و شعر کی تعلیم بھی دلائی جاتی تھی۔ طوائفوں کے آداب کو سند کا درجہ دیا جاتا تھا اور یہ مشہور تھا کہ آدمی جب تک رنڈی کی صحبت میں نہ بیٹھے انسان نہیں بنتا۔ لکھنؤ کی ڈیرہ دار طوائف اور اُس کے مکان کی تصویر مرزا ہادی کے قلم سے ملاحظہ ہو۔

”خانم صاحب کو آپ نے دیکھا ہوگا۔ اُس زمانے میں ان کا سن قریب پچاس برس کے تھا۔ کیا شاندار بڑھیا تھی! رنگ تو سانولا تھا مگر ایسی بھاری بھر کم جامہ زیب عورت نہ دیکھی نہ سنی۔ بالوں کے آگے کی لپٹ بالکل سفید تھیں، ان کے چہرے پر بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ مٹل کا دوپٹہ کیسا باریک چٹا ہوا کہ شاید وہ باید، اودے کا مشرعب کا پاجامہ، بڑے بڑے پائے، ہاتھوں میں موٹے موٹے سونے کے کڑے کلائیوں میں پھٹے ہوئے، کانوں میں سادی دواقتیاں لاکھ لاکھ بناؤ دیتی تھیں..... مرزا رسوا صاحب! خانم کا مکان تو آب کو یاد ہوگا کس قدر وسیع تھا، کتنے کمرے تھے۔ ان سب میں رنڈیاں۔ خانم کی نوپیاں۔ رہتی تھیں۔ بسم اللہ (خانم کی لڑکی) اور نور شید میری ہم سنیں تھیں۔ ان کی ابھی رنڈیوں میں گنتی نہ تھی۔ ان کے علاوہ کس بارہ ایسی تھیں جو الگ الگ کمروں میں رہتی تھیں ہر ایک کا حملہ جدا تھا، ہر ایک کا دربار علیحدہ ہوتا تھا۔ ایک سے ایک خوبصورت تھی، سب گنتے پاتے سے آراستہ، ہر وقت بنی ٹھنی تولواں جوڑا پہنے۔ سادہ کپڑے جو ہم لوگ پہنتے تھے وہ اور رنڈیوں کو عید بقرعید میں بھی نصیب نہیں ہوتے۔ خانم کا مکان تھا کہ پرستان تھا۔ جس

کمرے میں بالکل سوائے ہنسی مذاق، گانے بجانے کے کوئی اور چہانہ تھا..... ایک دن خانم صاحب کے سامنے رام کھلی گارہی تھی دھیموت سدھ لگا گئی، اُستاد جی نے نہ ٹوکا، خانم صاحب نے پھر اُسے کہلویا، میں نے پھر اُسی طرح کہا، اُستاد جی باخبر نہ ہوئے، خانم صاحب نے گھور کر دیکھا، میں اُستاد جی کا منہ دیکھنے لگی، انہوں نے سر جھکا لیا، پھر تو خانم صاحب نے انہیں آڑے ہاتھوں لیا۔“

خانم کے یہاں نوپیموں کو گانے بجانے ہی کی تعلیم نہیں دی جاتی تھی پڑھنے کے لئے مکتب بھی تھا، مولوی صاحب نوکر کرتے۔

یونان کی پیرا، ہند کی رنگی، لکھنؤ کی ڈیرہ دارطوائف کی طرح جاپان میں گیشا کو بھی معاشرے میں اہم مقام حاصل رہا ہے۔ گیشا کی تعلیم و تربیت پر کئی سال صرف ہوتے ہیں۔ اُسے آدابِ مجلس، مہمانوں کی پذیرائی، اُن سے بات چیت کے سلیقے، چائے دم کرنے اور پیش کرنے کے طریقے اور ناچ گانے کی تعلیم دلائی جاتی ہے۔ جاپانی اپنی عورتوں کو رفیقہٴ حیات نہیں سمجھتے محض اپنے بچوں کی مائیں خیال کرتے ہیں اور لطفِ محبت کے لئے گیشا کے ہاں جاتے ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد امریکیوں کے قیام کے اثرات جاپانی معاشرے پر گہرے ہوئے ہیں لیکن جاپانیوں میں ابھی تک گیشا میں بے پناہ کشش کا سامان موجود ہے۔ مصر میں گانے اور ناچنے والیوں کو غازیہ اور عالمہ کہتے ہیں۔ یہ دراصل قدیم مصر کی اُن کسبیوں سے یادگار ہیں جن کے برہنہ ناچ کی تصویریں پرانی عمارتوں کے در و دیوار پر دکھائی دیتی ہیں۔ عالمہ اور غازیہ سیلی ڈانسنگ کی ماہر ہوتی ہیں جو خالصتاً قدیم مصری ناچ ہے۔ ناچتے وقت وہ اپنے سینے، شکم اور سر نیوں کو عجیب ہوس پرور طریقے سے کھرت دیتی ہیں اور جوش میں آکر اس تیزی و تندہی سے کو لپے لگاتی ہیں کہ تماشائی بے قرار ہو جاتے ہیں۔ آج کل بیروت اس ناچ کا سب سے بڑا مرکز ہے جہاں خلیج فارس کے عرب شیوخ ناچنے والیوں پر اپنی دولت لٹاتے ہیں۔

لیسکی تاریخِ اخلاق یورپ میں لکھتا ہے کہ ازمنہ و سطلی میں یورپ کے بڑے بڑے شہر

قبسگی کے اڈے بن گئے تھے جہاں دن رات فسق و فجور کا بازار گرم رہتا تھا۔ پادری نہ صرف قبسہ خانوں کی سرپرستی کرتے تھے بلکہ بعض نے اپنے قبسہ خانے کھول رکھے تھے۔ نشاۃ الثانیہ کی صدیوں میں قدیم یونانی علوم کے ساتھ اہل یونان کی جنسی قدروں کا اجیاء بھی عمل میں آیا اور کامل جنسی آزادی کا دور دورہ ہو گیا۔ یہ آزادی ۱۸ ویں صدی کے اواخر تک نقطہ عروج کو پہنچ گئی۔ ۱۹ ویں صدی یا عہد وکٹوریہ میں اس جنسی بے راہ روی پر قابو پانے کی کوشش کی گئی لیکن صنعتی انقلاب نے جہاں زندگی اور معاشرے کے دوسرے شعبوں کو متاثر کیا وہاں قبسگی کے حلقہ اثر و نفوذ کو بھی وسیع تر کر دیا اور عصمت فردوشی کی نئی نئی صورتیں سامنے آنے لگیں۔ عصمت فردوشی کے کاروبار کو وسیع تجارتی بنیادوں پر نئے سرے سے مرتب کیا گیا چنانچہ آج مغرب کے شہروں میں قبسگی کو مہنگے داموں شپین، بچنے کا وسیلہ بنایا گیا ہے۔ نیویارک، پیرس، نیواڈا ریوری جینرو، بیروت وغیرہ کے قبسہ خانے رسوائے دہر ہیں۔ سومرسٹ مام کہتا ہے کہ جنسی آسودگی کے لئے پیرس بہترین شہر ہے۔

”جب میں دیکھتا ہوں کہ میرا نفسانی ہیجان میرے کام میں ہاراج ہو رہا ہے تو میں عورت کے پاس چلا جاتا ہوں جیسے قبض ہو جائے تو یمن دوا لی جاتی ہے۔“

بڑے بڑے ہوٹلوں اور قبسہ خانوں میں انیم کھانے والے منگول اور حبشی بیرے بطور کاسب کے موجود ہوتے ہیں۔ ان اداروں میں کوئین، ہیروئن، ایل ایس ڈی، چرس وغیرہ منشیات کی فروخت پر درجہ بندی رہتی ہے۔ بعض عمر رسیدہ امیر عورتیں مستقلاً اپنے ساتھ ایک نوجوان کاسب رکھتی ہیں۔ ایسی طرح عیاش بڈھے فوجیہ داشتادوں کو لئے لئے پھرتے ہیں۔ پیرس کو قدیم باہل کی طرح گناہ کا شہر کہا جاتا ہے۔ یہاں کے لوگوں کے بقول کامیو دوسری مشاغل ہیں، اخبار پڑھنا اور زنا کرنا۔ پیرس کے قبسہ خانوں میں جو شخص پہلی بار داخل ہوتا ہے۔ بھپک ہو کر رہ جاتا ہے۔ بیش قیمت ساز و سامان سے آراستہ کمروں میں حسین نیم برہنہ لڑکیاں صوفوں پر محبتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ موسیقی کی تانیں، شراب کا

♂ MALE PROSTITUTE ♀ GIGOLO

♂ GIGOLETTE

سرور، خوشبو کی لپٹیں، اور شباب کی سرمستیاں الف بسلانی فضا پیدا کر دیتی ہیں۔ ان قحبہ خانوں میں ہر عیامت، ہر رنگ اور ہر قد و قامت کی کسبیاں موجود رہتی ہیں اور ہر ذوق، ہر ہوس، ہر کھرجی کی تسکین کا سامانِ وافر موجود رہتا ہے۔ تماشینوں کو مختلف آئینوں کے مُصور کتابچے پیش کئے جاتے ہیں جن سے وہ انتخاب کرتے ہیں۔ ایک کسبی نے بتایا کہ اُن کے نوے فی صد سرپرست جنسی کج رویوں میں مبتلا ہوتے ہیں اور پچاس فی صد مدھی ہوتے ہیں۔ ایک کسبی نے کہا ”میں ان معزز حضرات کو خوب جانتی ہوں جو غلوت میں درندوں کا روپ دھار لیتے ہیں“ سمون دہوانے صدی رداں کے اوائل کا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ ایک قحبہ خانے پر چھاپا مار کر دو خود سال لڑکیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ایک کی عمر بارہ برس کی تھی اور دوسری کی تیرہ برس کی۔ مقدمہ عدالت میں پیش ہوا۔ ایک لڑکی نے بیان دیتے ہوئے ایک ’معزز‘ شخص کا نام لینا چاہا تو جج نے اُسے بھڑک دیا اور کہا ”ایک معزز رئیس کے نام کو آلودہ مت کرو“ چنانچہ رئیس کا وقار بجال رہا اور لڑکی کو ذلیل و خوار ہو کر قید خانے میں جانا پڑا۔ لندن، پیرس اور نیویارک کے بعض قحبہ خانے صرف کج رویوں کے لئے مخصوص ہیں جہاں ایذا کو شئی، ایذا پسندی وغیرہ کی تسکین کی جاتی ہے۔ قحبہ خانوں کے مالک ہمیشہ کسبیوں کو مفروض رکھتے ہیں تاکہ وہ اُن کے چنگل سے نجات نہ پاسکیں۔ شراب نوشی، کھیل، تاشروں، قیمتی ملبوسات اور زیورات کی شیدائی ہونے کے باعث کسبیاں فضول خرچ ہوتی ہیں۔ انہیں اپنے مستقبل کا کوئی خیال نہیں ہوتا اور وہ اپنی ناک کے آگے نہیں دیکھ سکتیں۔ وہ لمحہ گزراں میں زندگی گزارتی ہیں۔ جرموں کی تنظیم فرب المل ہے۔ انہوں نے عصمت فروشی کے کاروبار کو بھی ایک منظم ادارہ بنا دیا ہے۔ کسبیوں کے لئے خاص ہوسٹل کھولے گئے ہیں جہاں وہ بل کر رہتی ہیں بعض کسبیاں آزادانہ پیشہ کرتی ہیں اور بسا اوقات غنڈوں کے چنگل میں پھنس جاتی ہیں جو بسا اوقات اُن کے آتش اور محبوب بھی ہوتے ہیں اور اُن کی کمانی پر گھچڑے اڑاتے ہیں۔ ادنیٰ درجے کی کوہ

۱۰ THE SECOND SEX.

۱۱ DIRNENWOHNHEIME

گرد کسبیاں راتوں کو گلی کوچوں میں چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہیں اور ایک آدھ شنگ کے عوض رگنڑوں کے جوس نالی کی تسکین کرتی ہیں۔ پولیس والے جو انسدادِ فحاشی پر مامور ہوتے ہیں کسبیوں کے بہترین دوست ہوتے ہیں اور جنس اور نقد کی صورت میں ان سے نذرانے وصول کرتے رہتے ہیں۔ یورپ کی طرح جنوبی امریکہ کے ممالک میں بھی عصمت فروشی کا کاروبار بڑے وسیع پیمانے پر کیا جا رہا ہے۔ امریکی فوجیوں نے جنوب مشرقی ایشیا کے شہروں کو بڑے بڑے قبر خاکیں میں تبدیل کر دیا ہے۔ تعالیٰ لیسنڈ، جنوبی دیت نام، جنوبی کوریا، جاپان، تائیوان، ملایا اور فلپائن کے شہر فسق و فجور کے اڈے بن گئے ہیں جہاں امریکی اپنا طرز زندگی پھیلا رہے ہیں اور ایشیائیوں کے اخلاق و کردار کو تباہ کر کے انہیں اپنے رنگ میں رنگ رہے ہیں تاکہ ان کا انقلابی جوش و خروش ختم ہو جائے اور وہ آزاد دنیا سے باہر نکلنے کا خیال ترک کر دیں۔

یورپ میں اعلیٰ طبقے کی کسبیاں کال گرل، ماڈل گرل، میزبان عورتیں کہلاتی ہیں۔ امریکہ میں بعض کال گرلز ہزاروں ڈالر ماہوار کماتے ہیں۔ سمون دیوا کے خیال میں آج کل کی نسلی اداکارائیں یونان قدیم کی میٹرا کی جانشین ہیں۔ ان کے صن و جمال کا شہرہ ایسے اچھوتے اور نفسیاتی انداز میں کیا جاتا ہے کہ ان کی ذات کے گرد بخشش نامعلوم کا ہالہ بن جاتا ہے اور لوگ ان کی ادراؤں پر بے تحاشا دولت لٹا دیتے ہیں۔ ناتسی جرمن میں نسل کشی کے نام پر قبلی کا ایک عجیب و غریب ادارہ قائم کیا گیا تھا۔ ہٹلر کے ایسا پرگسٹاپو کے اعلیٰ افسر ملر نے ملک کے متعدد شہروں میں 'حرم' کھلوائے جہاں منتخب حسین اور صحت مند لڑکیاں رکھی گئیں۔ ان کے پاس ایسے نوجوانوں کو خلوت میں بھیجا جاتا تھا جو جسمانی لحاظ سے آریائی قد و قامت اور خد و خال کے مثالی نمونے سمجھے جاتے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ ایک پوتر آریائی نسل کو پروردان چڑھایا جائے جو دنیا کی راہنمائی کا فرض ادا کر سکے۔

قبلی کے اسباب و عوامل کے بارے میں جنیات اور نفسیات کے طبقہ میں اختلاف پایا جاتا ہے بالعموم تین اسباب زیر بحث آتے ہیں۔ نفسیاتی، عرانی، معاشی

افلاک کے عالم نفسیات کو بروہو کے خیال میں کسبیاں خالق طور پر جرائم پیشہ ہوتی ہیں اور انہیں فلوہ کہتے ہیں مساعد حالات میں رکھا جائے بلاآخر وہ بازارِ حسن ہی کا رخ کرتی ہیں۔ سائرینِ کمر کے بقول بعض عورتوں کی جنسی خواہش غیر معمولی طور پر تشدد و تیز ہوتی ہے۔ انہیں بیاتنا زندگی راس نہیں آتی اور ان کا آخری ٹھکانہ قبرِ خانہ ہی ہوتا ہے۔ یہ عورتیں اصلاح پذیر نہیں ہوتیں اور انہیں کسی قسم کی ترغیب و تحریص عصمت فروشی سے باز نہیں رکھ سکتی۔ ان کی مطلوبیت کی کہانیاں محض فریب ہوتی ہیں۔ وہ اپنی زندگی سے مطمئن ہوتی ہیں اور نکاح سے گریز کرتی ہیں۔

ڈاکٹر مال، مارٹی نو، کارلر وغیرہ کے خیال میں اکثر کسبیاں چھپی ہوئی ہم جنسی ہوتی ہیں۔ اس نظریے پر صا د کرتے ہوئے فرنیک ایس کا پرلو کہتا ہے کہ میں نے مشرق و مغرب کے اکثر ممالک کا دورہ کیا اور وہاں کی کسبیوں سے بلا۔ مجھ پر یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ ہم جنسی کسبیاں دنیا بھر کے ممالک میں پائی جاتی ہیں اور مردوں سے ناسخ ہو کر آپس میں جنسی اشتلاط کرتی ہیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ تماش میوں کے ساتھ خلوت میں جا کر وہ حفظِ محسوس نہیں کرتیں محض انہیں خوش کرنے کے لئے محفوظ ہونے کا ڈھونگ رہ جاتی ہیں۔ دنیا بھر کے ممالک کی سیاحت اور تحقیق سے مجھے معلوم ہوا کہ ہم جنسی عورتیں خاص طور سے عصمت فروشی کا دھندا کرتی ہیں۔ دوسری حقیقت جو مجھ پر منکشف ہوئی ہے کہ کسبیاں ایسے گھروں سے آتی ہیں جہاں میاں بیوی ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔ انہیں ہر وقت آپس میں لڑتے جھگڑتے دیکھ کر ان کی بیٹیوں کو شادی سے نفرت ہو جاتی ہے اور وہ کسبیاں بن کر خود مختاری کی زندگی گزارنا چاہتی ہیں۔ ہم جنسی نوع کی کسبیاں مردوں کے لئے انتہائی مضر ہوتی ہیں لیکن مساحت سے پوری طرح حفظ اندوز ہوتی ہیں۔ بعض علمائے نفسیات کے خیال میں سنگین قسم کی احمق اور غبی لڑکیاں جو خوبصورت، کام چور، قیمتی ملبوسات کی شیدائی اور پرتکلف کھانوں کی رسیا ہوں یہ پیشہ اختیار کر لیتی ہیں۔ مسز سبل وولف نے کہا ہے کہ کسبیوں کے پاس کڑت و توار سے جانے والے مرد بھی غبی، فہم و شعور سے عاری

اور 'اخلاق کوڑھ' میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ قہر خانوں میں جنس اور عشق یا جنس اور جمالیاتی احساس کا ربط و تعلق مٹ جاتا ہے اس لئے سرد مہری کا جنسی ملاپ انہیں چوپایوں کی سطح سے بھی نیچے گرا دیتا ہے۔

غمرانی نقطہ نظر سے عصمت فروشی کی یہ توجیہ کی جاتی ہے کہ جو لڑکیاں ایسے گھرانوں میں پرورش پائیں جہاں انہیں بوجہ ماں باپ کی شفقت اور بھرپور پیار میسر نہ آ سکے وہ نفسیاتی خلفشار میں مبتلا ہو جاتی ہیں جو غیر معمولی جنسی ہیجان کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے چنانچہ جوان ہونے پر جب کوئی نوجوان اُن سے اظہار محبت کرتا ہے تو وہ بے اختیار سپردگی پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ یہ لڑکیاں بسا اوقات اپنے عشاق کے ساتھ کسی بڑے شہر کو بھاگ جاتی ہیں جہاں اُن کا چاہنے والا انہیں کسی دلال یا نالکے کے ہاتھ بیچ کر فرو چکر ہو جاتا ہے اور انہیں باہر مجبوری کسی کا پیشہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ چند سالوں کے بعد وہ بالعموم آتشک میں مبتلا ہو کر مر جاتی ہیں۔ دلکی کا لٹرنے اپنے ایک ناول میں معاشرے کی ریاکاری کا پردہ چاک کیا ہے۔ ایک پادری ایک کبھی سے نکاح کر لیتا ہے۔ راز فاش ہونے پر معاشرہ انہیں رد کر دیتا ہے اور انہیں ترک وطن کرنا پڑتا ہے۔ اس ناول میں دکھایا گیا ہے کہ کئی کبھی ہمارے معاشرے میں نکاح کر کے باعزت زندگی بسر نہیں کر سکتی اس لئے وہ نکاح سے گریز کرتی ہے۔ باڈلے ہیڈ نے ایک کبھی بچے کا ذکر کیا ہے۔ بچے کہتی ہے کہ مجھے سب سے زیادہ نفرت اُن مردوں سے ہے جو مجھ سے ہم کنار ہونے کے بعد میری زبوں حالی پر مجھ سے اظہار ہمدردی کرتے ہیں۔ بعض ارباب اصلاح کبھی کے وجود کو معاشرے کے حفظ و بقا کے لئے ضروری سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قہر خانے گندی نایاں ہوتی ہیں جن سے شہر بھر کی غلاظت خارج ہو جاتی ہے۔ سنکسن نے کہا تھا کہ تم کسی شخص کو گندی نالی میں دبوچ کر رکھنا چاہو تو تمہیں خود بھی اُس کے ساتھ گندی نالی میں رہنا پڑے گا۔ یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ عورت کو گندی نالی میں رکھنے

پر اصرار کرنے والے مرد خود بھی گندی نالی کے کٹرے بن جاتے ہیں۔

جو معاشرہ طبقاتی تفریق پر مبنی ہو اُس کی نادار عورتیں امراء کی عورتوں کو رشک اور حسرت کی نگاہ سے دیکھتی رہتی ہیں اور اُن جیسا سامان آرائش، قیمتی ملبوسات اور زیورات فراہم کرنے کے لئے بعض اوقات عصمت فروشی کا دغذا کرنے لگتی ہیں۔ ایسے معاشرے میں دوسری اجناس کی طرح عصمت و بخت کو بھی خرید اور بیچا جاتا ہے۔ ایسے ماحول میں عورت کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے حسن و شباب کا سودا کر کے اپنی بھروسہ و ریات پوری کر سکتی ہے۔ پنجابی کی ایک کہادت ہے کہ کوئلے اے گنٹاں تے بھکھیاں کی رہنماں۔ وہ اپنی عصمت بیچ کر اپنی تمام حسرتیں اور آرزوئیں پوری کر لیتی ہے جو وہ عظیم کی حیثیت میں شاید کبھی بھی پوری نہ کر سکتی۔ اشتراکی دانشوروں کے خیال میں جس عورت کو چھٹیں سے لے کر معاشی تحفظ میسر ہو وہ عصمت فروشی کی جانب مائل نہیں ہوگی۔ اشتراکی انقلاب کے وقت ماسکو میں پچیس ہزار اور شنگھائی میں تیس ہزار کسبیاں موجود تھیں۔ اشتراکیوں نے ان کسبیوں کی اصلاح کے لئے مستقل ادارے قائم کئے جنہیں 'اصلاح خانہ' کہتے تھے۔ ان میں کسبیوں کو کسب معاش کے ہنر سکھائے گئے۔ اس طرح چند ہی برسوں میں عصمت فروشی کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اشتراکی معاشرے میں عورت کو عملاً مرد کے برابر حقوق دیئے گئے ہیں اور اُسے معاشرے کا ذمہ دار فرد تسلیم کر لیا گیا ہے جسے ہر پہلو سے مرد کی ہمسری میسر ہے جو عورتیں کا رضانوں، بھیتوں، درس گاہوں، شفاخانوں اور نظم و نسق کے جملہ شعبوں میں مردوں کے دوش بدوش کام کرتی ہیں۔ یا مقصد اور مسلسل کام اُن کی زندگی میں معنویت پیدا کر دیتا ہے اور معاشی آسودگی انہیں جذباتی بحران سے محفوظ رکھتی ہے۔ اس طرح اُن کے ذہن و قلب میں وہ اعتدال اور زندگی میں وہ توازن پیدا ہو جاتا ہے جس نے سبب وہ عصمت فروشی کا تصور بھی نہیں کر سکتیں قبل کی دوسرے معاشرتی عوارض کی طرح استحصالی معاشرے کی پیداوار ہے جہاں کہیں استحصالی معاشرہ قائم ہے وہاں قبلی باقی دب و فرار رہے گی۔ اہل مغرب معاشی استحصالی کو بھی قائم رکھنا چاہتے ہیں اور قبلی جیسی معاشرتی برائیوں کا جو اس معاشی استحصالی کا نتیجہ ہیں انہیں اُردا کرنے کے بھی متمنی ہیں گویا وہ تصور ہر کے درخت سے سیب کا پھل لینا چاہتے ہیں۔

## جنس اور ادب و فن

تخلیقِ فن کے عمل سے بحث کرتے ہوئے فرانڈ نے اپنے ایک لیکچر میں کہا ہے کہ فنِ ادب اُس خیال آرائی سے جنم لیتا ہے جس میں فن کار اپنی محرومیوں کا مداوا تلاش کرتے ہیں۔ یوں تو روزِ خوابی اور خیال آرائی کی صورت میں سبھی لوگ اپنی تشنہ آرزوؤں کی تلافی کر لیتے ہیں لیکن فن کار اور عام آدمی میں یہ فرق ہے کہ عام آدمی خیال آرائی اور روزِ خوابی ہی پر اکتفا کرتا ہے جب کہ فن کار اپنی تخلیقی صلاحیت کے طیفِ خیال آرائی میں کھو کر نہیں رہ جاتا بلکہ مسرتِ بخش آرٹ کی صورت میں رہا ہے۔ اُسے اپنی خیال آرائیوں کو محفوظ بھی کر لیتا ہے۔ اپنے آرٹ کے باعث اُسے وہ شہرت، عزت اور حسین عورتوں کا پیار میسر آ جاتا ہے جس کے لئے وہ روزمرہ کی زندگی میں ترستا رہتا ہے۔ فرانڈ نے آرٹ کو ایک قسم کا نشہ قرار دیا ہے جو لوگوں کو زندگی کے تلخ حقائق سے فرار کا سامان فراہم کرتا ہے۔ آئنس ہلے فرانڈ کے اس نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

”اکثر و بیشتر قارئین کتابوں سے کردار مستعار لے کر اپنے آپ کو اُن پر منطبق کر لیتے ہیں لیکن وہ اس عمل کو انٹ بھی دیتے ہیں اور اپنے آپ کو حقیقی زندگی سے بے تعلق کر کے ادبیات میں پناہ لیتے ہیں اور عالمِ خیال میں اپنی کوتاہیوں کی تلافی کر لیتے ہیں۔ مقبول عام قصوں، تمثیلوں اور فلموں کا ایک کام یہ بھی ہے کہ لوگ اپنی ناکوردہ اور تشنہ آرزوؤں کی تسکین ان نفسیاتی منشیات و محرکات میں تلاش کرتے ہیں۔ اس قسم کے ادبیات کا عادی نشہ کرنے والے عالمِ کیف میں زندگی کے پست ترین حقائق اور تلخیوں کو بھی قبول کر لیتے ہیں۔ لوگوں کے ذہن و قلب پر ادب کا تسلط

نہایت محکم ہے..... ادبیات میں نرد مال اور ریس نہ ٹھاٹھ کی فراوانی دکھائی دیتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ حقیقی زندگی ان چیزوں سے یکسر عاری ہوتی ہے قصہ نویس اور ان کے قارئین اپنے افلاس اور معاشرتی کم مائیگی کا مداوا عالم خیال میں تلاش کرتے ہیں اور اسے پالیتے ہیں۔ افلاس اور بے وقری ہی سے قصہ نویسوں اور ان کے قارئین کے مسائل نہیں سمجھتے۔ عام طور سے وہ حسن و جمال اور وجاہت سے بھی محروم ہوتے ہیں اور ان کی زندگیاں رومان سے عاری ہوتی ہیں۔ اگر وہ شادی شدہ ہوں تو ان کی خواہش ہوتی ہے کہ کاش ہم مجبور نہ ہوتے مجبور ہیں تو شادی کے لئے ترستے رہتے ہیں۔ بوڑھے ہیں تو کھوئی ہوئی جوانی کے لئے آہیں بھرتے ہیں اور کم عمر ہیں تو شباب کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ مختصراً ان کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ ایسے کیوں ہیں جیسے کہ وہ ہیں، دوسروں کی طرح کیوں نہیں ہیں چنانچہ قصے کہانیوں اور فلموں میں ہمیں ہرجائی عاشق، مست و بے خود حسنائیں، نوخیز معصوم و شیرازیں، خوبصورت بے رحم فوجوان اور نفس پرست مہم جو عورتیں دکھائی دیتی ہیں۔ ہالی وڈ اور حسنائوں کی منڈلیوں کے قبول عام کی تہ میں یہی چیز کار فرما ہے..... آج کل عوام کے لئے مذہب کی نسبت سینما زیادہ موثر افیون ثابت ہو رہا ہے۔“

علمائے جنسیات نے جنسی جبلت کو فنون لطیفہ کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔ سینے ہال اور الین کہتے ہیں لے ”مذہب، آرٹ اور زندگی کے بہترین عناصر کی کشش کا راز جنسی جذبے کی مجہ جبلت کا فرمالی اور توسیع پر منحصر ہے۔“

معاشرہ انسانی کی ابتداء سے شعراء، مغنی، مفسر و نیزہ عشق و محبت کی ترجمانی کرتے رہے ہیں عشق جنسی جبلت کا زائیدہ ہے اس لئے آرٹ اور ادب بالواسطہ جنسی جبلت ہی سے سیراب ہوتے ہیں۔ رومانی اور کلاسیکی آرٹ کا فرق بیان کرتے ہوئے دل دیواراں نے لکھا ہے۔

« احياء العلوم کی مقدس ترین تصویروں میں عہدِ بت پرستی کی نفس پروری نے لغو  
 کیا۔ مریم عذرا کے نقوش میں عُن کی دیوی وینس کے بدن کی گدراہٹ نمایاں ہے  
 ولی جان کے مجسموں میں ادولس موجود ہے اور ولی سباستین کے مجسمے عرباں  
 نگاری کے واسطگاف نوٹے ہیں۔ جب احياء العلوم کی تحریک روم سے وینس  
 پہنچی تو قدیم بت پرستی کے عناصر غالب آگئے۔ عشقِ حقیقی کی جگہ عشقِ مجازی نے  
 لے لی، یوں لگا جیسے مذہبی آرٹ اپنی بقا کے لئے عشق کے دیوتا کا دستِ نگر  
 ہے۔ جنسی جبلت کی توانائی کا زمین دوز دریا فن کار کے تخلیقی جذبے کو سیراب  
 کرتا ہے۔ بعض طبائع میں ان دونوں کا تعلق جنس اور آرٹ کی فوری ترقی کا  
 باعث ہوا۔ اس ربط و تعلق سے رومانی قسم کا غیر معمولی تخلیقی ذہن جنم لیتا ہے۔  
 سیف، الگزنڈر، لکریس، بارٹن، شیلی، کیٹس، سون برن، ہیوگو، روسو،  
 ورلین، پیرارک، بروٹو، گیورگونی، شلر، ہائنے، پور، سومان، شوبرٹ، شوپاں،  
 مرٹنڈ برگ، آرتی باشر، اورچکو فکسی: یہ وہ نام ہیں جس میں تخیلِ عقل پر غالب  
 آجاتا ہے اور جس میں جنس اور آرٹ ایک ہی سرچشمے سے فیض یاب ہو کر فن کار کو  
 نڈھال کر دیتے ہیں۔۔۔۔۔ یہی لوگ ہیں جو شاعری، مصوٰی، موسیقی اور فلسفہ عشق  
 کی تدوین و تخلیق کرتے ہیں۔ ہر عاشق انہیں عزیز رکھتا ہے لیکن دوسرے فن کاروں  
 میں جنس کے انہار کے آگے بند باندھ دیا جاتا ہے اور وہ کُلّی طور پر تخلیق ہی کی  
 راہوں پر بہہ نکلتا ہے۔ عشق کا تصرف ٹوٹ جاتا ہے، جذبے پر قابو پایا جاتا  
 ہے، عقل و فرد پھولتی پھلتی ہے اور ہر چیز پر متصرف ہو جاتی ہے۔ اس عظیم ارتقاء  
 میں غیر معمولی کلاسیکی ذہن پیدا ہوتے ہیں۔ سقراط، سوفوکلز، ارسطو، ارسیمدس،  
 سیرز، گلیلیو، گاسٹو، لیونارڈو، تیشیانے، بیکن، ملٹن، ہالس، باخ،  
 کانٹ، گوٹے، میگل، ترگنیف، فلاہر، رینان، اناطول فرانس، مالک انلو،

بیٹ ہودن، پولین : ان میں ہر دو قسم کے غیر معمولی ذہنوں کا امتزاج عمل میں آیا اور فوق البشر اکائی کی صورت اختیار کر گیا۔

تحلیلی نفسی اور جنسیات کے طبقہ نے اس امر کی جانب بار بار توجہ دلائی ہے کہ عظیم فن کار غیر معمولی جنسی توانائی کے مالک ہوتے ہیں اور ان کا آرٹ تند و تیز جنسی میکان سے ذوقی فیضان حاصل کرتا ہے۔ ہم جنسیت اور تخلیق فن کے قریبی تعلق کو بھی معرض بحث میں لایا جاتا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ جن مردوں اور عورتوں میں ہم جنسی میلان خلقی طور پر موجود ہوتا ہے وہ ادبی ذوق اور تخلیق فن کی صلاحیت سے بدرجہ اولیٰ بہرہ ور ہوتے ہیں۔ عظیم فن کاروں کے سوانح حیات کے مطالعے سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ یا تو وہ غیر معمولی قوت رجولیت کے مالک تھے اور یا نمایاں ہم جنسی میلان رکھتے تھے۔ یونان کے نامور تمثیل نگار سوفوکلز کی زندگی عشق بازی اور کامجائی میں گزری، لزباس کی شاعرہ سیفوا اپنی شاگرد لڑکیوں سے پرجوش عشق کرتی تھی۔ اُس کی نظموں کے جو پارے ہم تک پہنچے ہیں وہ شاعری کے اعلیٰ نمونے ہیں، درجہ ہم جنسی تھا۔ اُس نے عمر بھر شادی نہیں کی اور اُردوں سے جی بھلا تا رہا، احياء العلوم کے دور کا عالم ایراکس ہم جنسی تھا، اٹالیہ کے معروف سنگ تراش لیونارڈو ڈا ونچی اور مائیکل انجلو ہم جنسی تھے۔ مشہور مصوٰۃ رافائیل جنسی عفریت تھا۔ اُس کی راتیں فسق و فجور میں گنتی تھیں، بٹشے نے کہا ہے

”جنسی نظام کی جدت کے بغیر رافائیل پیدا نہ ہو سکتا۔“

چیلینی کو جس کی خود نوشت سوانح حیات کلاسیک کا درجہ رکھتی ہے سدومیت کے جرم میں قید کیا گیا۔ شیکسپیر اور مارکو ہم جنسی تھے۔ شیکسپیر نے اپنے محبوب لڑکوں سے ایک سو سے زائد سناٹیوں میں اظہار عشق کیا ہے۔ ہمارے ہاں شیخ سعدی اور میر تقی میر اُرد پرست تھے۔ اس ضمن میں گلستان کا باب پنجم قابل مطالعہ ہے۔ شیخ شیراز خوبصورت حاشی نوٹوں کو گھونٹنے کے لئے کئی کئی میل پیدل سفر کر کے جایا کرتے تھے۔ میر تقی میر کے دوایں میں دہلی کے لونڈے بھرے ہیں جن سے وہ نہایت بازاری انداز میں اظہار عشق کرتا ہے۔ گوئے غیر معمولی جنسی توانائی کا مالک تھا۔ اُس

نے بے شمار عورتوں سے عشق کیا۔ بڑھاپے میں ایک نو عمر حسینہ بیتیان آرم سے اُس کا معاشرے ہوا۔ ویکل مان، ڈالٹر میٹر، فٹز جیرلڈ اور آسکر والد ہم جنسی تھے۔ آسکر والد پر سدومیت کا جرم ثابت ہو گیا اور قید کاٹا پڑی۔ آندر سے ٹرید خود اپنی سدومیت کا ذکر مزے لے لے کر کرتا ہے۔ وہ عمر بھر اُمردوں سے معاشرے کرتا رہا۔ عربی کا شاعر ابوالخواس ایک بدنام سدومی تھا۔ اُس نے آہو چشم اُمردوں کی تعریف میں پُر جوش قصائد لکھے تھے۔ جدرہ کا شاعر ملیاگر اُمرد پرست تھا۔ اپنی ایک نظم میں اُس نے سات حسین اُمردوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک کو سوس کا نام دیا ہے۔ دوسروں کو سفید نبضہ، گلاب، انگور، شگوفہ، سنہرا زعفران اور سدا بہار زیتون کی کھی کہا ہے۔ پٹر آرک نے اپنی محبوبہ لارا کے فراق میں پُر جوش ساینٹ لکھے۔ وہ اُسے 'نہا شعلہ' کہا کرتا تھا۔ اُس کا شمار رومانیت کے اولین ترجمانوں میں ہوتا ہے۔ فرانسیسی شعرا درلین اور راس بو کا آپس میں ہم جنسی معاشرے تھا۔ ایک دن درلین نے حد کے مارے راس بو پر پیچہ داغ دیا جس سے وہ زخمی ہو گیا اور درلین کو دو سال کی قید سنائی گئی۔ شعراء ایلن گنس برگ اور پیٹر اوسونسکی چودہ برس تک ہم جنسی رشتہ ازدواج میں منسلک رہے۔ وکٹر میوگو، دو ماکیہ، موباساں اور لیونال سائے جنسی عفریت تھے۔ وکٹر میوگو، بالزاک اور بارن پر عورتیں پروانوں کی طرح گرتی تھیں۔ عورت کے لئے اُس مرد سے زیادہ پرکشش کوئی ہستی نہیں ہوتی جو زندگی کے کسی شعبے میں ممتاز ہو اور غیر معمولی قوت رجولیت کی شہرت بھی رکھتا ہو۔ وکٹر میوگو اسی برس کی عمر سے متجاوز ہو کر بھی جنسی ملاپ کرتا رہا۔ اُس کی موت ۲۷ مئی ۱۸۸۵ء کو ہوئی تھی۔ اپنے روزنامے میں لکھتا ہے کہ یکم جنوری ۱۸۸۵ء سے لے کر ۵ اپریل ۱۸۸۵ء تک اُس نے آٹھ بار جنسی ملاپ کیا تھا۔ گائے کی میٹی جوڑتھ بڑھے میوگو پر دل دجان سے فدا تھی۔ دو ماکیہ ۲۶ برس کی عمر میں ایک نو عمر اکیڈم آڈا سے فیض یاب ہوتا رہا۔ لیونال سائے عمر بھر اپنے طوفان پروردہ جنسی میلانات کے خلاف کشمکش کرتا رہا اور شکست پر شکست کھاتا رہا۔ وہ ستر برس سے متجاوز تھا کہ ایک دن میں میل گھوڑے پر سوار کرنے کے بعد رات کو اپنی بیوی کی خلوت میں گیا اور وہ اُس کی توانائی پر

لے اصطلاح میں اس نوع کے تعلق کو GAY-MARRIAGE کہتے ہیں۔

شدد رہ گئی۔ سو پاساں قبہ خانوں میں جا کر ایک ہی تختے میں کئی کئی کبیوں سے قمع کیا کرتا تھا۔ آخر آتشک میں مبتلا ہو کر ناوقت موت مر گیا۔ بائرن جنسی پاچی تھا۔ وہ سولہ برس کا تھا جب اس کا معاشقہ اپنی بڑی بہن انگٹا سے شروع ہوا۔ جسے وہ پیار سے بلج، کہا کرتا تھا۔ اطالیہ کے دوران قیام میں وہ فحش و فجور کی دلدل میں غرق رہا۔ فرانس کا مشہور موزخ اور قس نگار والیئر بڑھا۔ میں اپنی بھابھی مادام دینی سے معاشقہ کرتا رہا۔ ناول نویس جارج سان مرد مکن عورت تھی۔ وہ ہلاکت آفریں اور مردانہ عورت کا ایک اچھوتا نمونہ تھی۔ اس کا اصل نام آدور سے دودے واں تھا لیکن اس نے اپنا نام مردانہ رکھ لیا۔ وہ مردانہ لباس پہنتی تھی اور سنگار پیاکرتی تھی۔ اس نے بے شمار معاشقے کئے۔ اس کے ہاں بچے بھی پیدا ہوئے لیکن اسے عمر بھر جنسی آسودگی میسر نہ آ سکی۔ اس کا معاشقہ شاعر اور قصہ نویس دمے سے مشہور ہے۔ ایک دفعہ وہ اس کے ساتھ وین کی سیر کو گئی جہاں دمے بیمار پڑ گیا۔ وہ شدید بخار میں تڑپ رہا تھا اور اس پر ہذیانی کیفیت طاری تھی کہ ڈاکٹر کو طلب کیا گیا۔ جارج سان نے باتوں باتوں میں نوجوان ڈاکٹر کو درغلا لیا اور ساتھ کے کمرے میں اس کے ساتھ خلوت میں چلی گئی۔ موسیقار شوپن سے دس برس تک اس کا معاشقہ رہا حتیٰ کہ شوپن کی صحت تباہ ہو گئی۔ اس کی موت کے بعد وہ ایک اور موسیقار فرانتز لیٹ پر فریفتہ ہو گئی۔ وہ کہا کرتی تھی میرا جی چاہتا ہے کہ جب لیٹ زور زور سے پیانو بجا رہا ہو تو میں اس کے پیانو کے نیچے لیٹ جایا کروں۔ وہ کہتی تھی کہ حل کی حالت میں اس کا ادبی تخلیق کا سرچشمہ خشک ہو جاتا تھا۔ اور وہ ایک لفظ نہیں لکھ سکتی تھی۔ بادیئر لغزل آکٹس کہلے ”مسیحی امیں“ تھا اور صبی اور یوڈی کبیوں کی صحبت میں خوش رہتا تھا۔ آخر آتشک میں مبتلا ہو کر اس جہاں فانی سے رخصت ہوا۔ مشہور مصور دیں گورخ گھٹیا درجے کی ٹلیکوں کے پاس جایا کرتا تھا۔ ایک دن وہ ایک کبی کے ساتھ خلوت میں گیا۔ کبی نے خرچی طلب کی تو گورخ نے کہا میرے پاس تو چوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ کبی غصناک ہو کر بولی اچھا تو اپنا کان کاٹ کر مجھے دیتے جاؤ۔ دیں گورخ نے بلا تا مل اُس ترے

سے اپنا کان کاٹا اور اُس کے سامنے پھینک دیا۔ اُس نے اپنی بہترین تصویریں پاگل خانے میں چھپی تھیں۔ آخر ۲۴ برس کی عمر میں خودکشی کر لی۔ ان مثالوں سے یہ قاعدہ کلیتہً تو نہیں بنایا جاسکتا کہ ہر عظیم فن کار نمایاں ہم جنسی میلان رکھتا ہے۔ مُتنبی، عَرخیام، فردوسی، غالب، اقبال، خواجہ غلام فرید، وارث شاہ، ملکن، دانستہ، سروانیز وغیرہ میں ہم جنسیت کا کوئی کھوج نہیں ملتا البتہ غیر معمولی جنسی توانائی اور تخلیق فن کے ربط باہم سے انکار کرنا مشکل ہے جو فن کار اور ادبا، جنسی لحاظ سے کوتاہ بہت اور سرد مہر ہوں ان کی فنی و ادبی تخلیقات بھی سوز و گداز سے عاری ہوتی ہیں مثلاً کہا جاتا ہے کہ کارلائل اور رسکن مرد نہیں تھے۔ اس لئے ان کی تحریروں بھی پھیکی سیٹھی ہیں۔

شاعری، تھیں نگاری، موسیقی، مصوری اور بُت تراشی میں جنسی محرکات و عوامل شروع سے کارفرما رہے ہیں۔ اقوامِ عالم کے عظیم شعرا نے جذبہ عشق کی پُر جوش ترجمانی کی ہے اور جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں جذبہ عشق جنسی جبلت ہی کا دست پروردہ ہے۔ جزائینی ماحول اور تمدنی روایات کے اختلاف کے باوجود شعراء نے یکساں جوش و خروش سے عشق و محبت کے گیت گائے ہیں بلاشبہ ہر شخص اپنی مادری زبان کی عشقیہ شاعری ہی سے کما حقہ حظ اندوز ہو سکتا ہے لیکن یہ جذبہ عشق کی عمد گیری کا اعجاز ہے کہ دوسری زبانوں کی عشقیہ نظموں کے ترجمے بھی اثر انگیز ہوتے ہیں مثال کے بطور غزل الغزلات، سیفوی نظمیں، غلام فرید کی کافیاں اور میراں کے گیت جادو کا اثر کرتے ہیں کیوں کہ قادی خواہ کسی ملک کا باشندہ ہو ہر صورت دِل رکھتا ہے جو دھڑکتا ہے اور اسے رکھتا ہے جو مُرغش ہوتا ہے۔ شاعری کے علاوہ دنیا کی بعض بہترین تھیٹیوں، داستانوں اور قصوں کے موضوعات عشق و محبت کے مرہونِ منت ہیں۔ فردوسی کے شاہنامے میں زال اور رودابہ کا افسانہ، ایلیڈ میں پیرس اور ہیلن کا عشق، کالیداس کے نائک میں وِگرم اور اروس کا پیار، طرمیہ خداوندی میں دانستہ کا بیاطریچے سے پاکیزہ عشق، فادسٹ میں فادسٹ اور گرہین کا رومان، رمیو جولیت میں دودشمن خانوادوں سے تعلق رکھنے والوں کا المناک پیار، 'ہیر' میں ہیر اور راتھیا کا عشق بلاخیز، لاسٹائے کے جنگ وامن، میں آندرے اور ناسا کی محبت، ہیوگو کے 'فوٹوژام کا کبیرا' میں کواسمیڈ

کی خانہ بدوش لڑکی سے بے پناہ محبت و مہرہ ، پڑھنے والوں کو روح کی گہرائیوں تک متاثر کرتی ہے۔ ان کے مطالعے سے قارئین کے ذہن و قلب پر جمی ہوئی خود غرضی کی پھونسی دور ہو جاتی ہے اور وہ خود فراموشی اور بے نفسی کے جذبات سے سسٹا رہ جاتے ہیں۔ اس طرح ادب و فن میں جنسی جبلت مرقع ہو کر عشق و محبت کی صورت میں ان کے تزکیہ نفس اور رفعت احساس کا سبب بن جاتی ہے۔

موسیقی اور رقص بھی جنسی جبلت کے اظہار کی صورتیں ہیں۔ سرسٹے پرندے نہر ہوتے ہیں جو اپنی دلکش آواز سے مادہ کو اپنی جانب متغیت کرتے ہیں۔ سب سے سرسٹا پرندہ ٹیل ہے جو مادہ ٹیل کو بھانے کے لئے گاتا ہے۔ دیہات کے لوگ گیتوں سے لے کر جمیدہ نغماتی تمیلوں اور اور خیالوں میں جنسی جبلت کی تحریک کے مختلف مدارج کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ بیٹ ، ہودن ، واکنر ، موتسارت ، فیاض خاں ، عبدالکریم خاں ، وغیرہ استادوں کے نغمات میں کوئل سر جنسی خواہش کی خفتگی اور بیداری کو ظاہر کرتے ہیں۔ آہستہ آہستہ بلند ہوتے ہوئے سر عشق و محبت کی وارفتگی کی نشان دہی کرتے ہیں اور آخر نقطہ عروج پر جا پہنچتے ہیں جو جنسی مواصلت کی از خود رفتگی کی علامت ہے۔ خیال کی گائیکی میں الپ ابتدائی کشش اور دلوں میں ابھرتے ہوئے پیار کی عکاسی کرتی ہے۔ ولبت عشق کی گوناگوں کیفیات ، سوزِ ہجر اور حسرت دید کی آئینہ دار ہے ، درت اور ترانے میں وصال کی دالہانہ خود سپردگی کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ اقوام عالم کے ناچوں میں بھی جنسی ترغیبات اور عشقیہ واردات اپنی تمام لطافت اور رعنائی کے ساتھ منعکس ہو گئی ہیں۔ افریقہ کے قبائلی ناچ دافع طور پر جنسی مواصلت کو ظاہر کرتے ہیں۔ مہذب اقوام کے ناچوں میں والز ، کتھک ، بلی ڈانسنگ ، ٹانگو ، ٹوسٹ ، راک اینڈ رول دافع طور پر جنسی ہیں۔ ہسپانیک مشہور رقص خان دانگو میں ناچنے والے لڑکھو اپنے اعضاء کی حرکات سے عشق و محبت کی جلد منازل کی ترجمانی کرتے ہیں۔ آخری مرحلے میں عورت کامل سپردگی کی تصویر بن جاتی ہے۔ یہ ناچ اس

قدر نفس پرور ہے کہ ناپچنے والوں کے ساتھ دیکھنے والوں کی ہواد ہوس کو بھی بے پناہ اشتغالک  
ہوتی ہے۔ کتنا اپنے سوانح میں لکھتا ہے

” فان والگو ناچ نہایت ہوس پرور ہے اس میں ناپچنے والے مرد اور عورت نہایت  
نفس پرور اشارے کرتے ہیں اور اس میں عشق کے آغاز سے لیکر وصل کی انتہا  
تک تمام مراحل کی ترجمانی کی جاتی ہے گویا یہ ناچ عشق کی مکمل تاریخ ہے۔ میرا  
خیال ہے کہ کوئی بھی عورت اس ناچ میں حصہ لینے کے بعد اپنے ساتھی سے الگ  
نہیں کر سکتی کیوں کہ ناچ کے دوران میں جنسی خواہش تیزی سے بھرپور اُٹھتی ہے۔“

مشرق وسطیٰ کے عرب ممالک کا بیلی ڈانس واضح طور پر جنسی ہے۔ اس میں رقاصہ اپنے کو گھول کر  
نہایت ہوس پرور انداز میں تیزی سے شکلاتی ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ حرکات کس بات  
کی غمازی کر رہی ہیں۔ مصر صید کی ناپچنے والیاں جنہیں عالمہ اور غازیہ کہتے ہیں بے تکلفی کی محفوں  
میں برہنہ بھی ناپتی ہیں۔ یہ ناچ قدیم مصر کے فراعنہ سے یادگار ہے۔ ہندوؤں کے ناچ کتھک میں  
محبت کی متنوع کیفیات اور جنسی خواہش کے آغاز و ارتقاء کو انگلیوں، ابروؤں، آنکھوں، بازوؤں  
اور گولہوں کی جنبش و حرکت سے دکھایا جاتا ہے۔ ہیریاک ایلس لکھتے ہیں۔

” دوش اور پرندے ناچ کر جنسی جذبے کا اظہار کرتے ہیں۔ انسانوں میں بھی  
ناچ اس جذبے کی انگینت کا باعث ہوتا ہے۔ وحشی قبائل سے لے کر آج کل  
کے مہذب معاشرے تک میں مختلف قسموں کے ناچوں کا آغاز و ارتقاء جنسی  
جذبے کے اظہار و بیان سے وابستہ رہا ہے۔ والز کے ناچ میں ابتدائے عشق  
سے لے کر ملاجعت اور مواصلت تک کے جملہ مراحل کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ مرد  
عورت کے تعاقب میں جاتا ہے، وہ گریز کرتی ہے، پھر قریب آتی ہے، پھر دور  
بٹ جاتی ہے، گریزاں بھی ہوتی ہے اور دعوت بھی دیتی ہے حتیٰ کہ جوش و

خوش کا آخری مرحلہ آجاتا ہے جو مواصلت کے لفظ عروج کی نشان دہی کرتا ہے۔ وحشیوں کے ناچ صاف صاف جنسی ہوتے ہیں۔ ان کے اعضاء کی حرکات و سکنات سے مواصلت کے عمل تک کی ترجمانی کی جاتی ہے۔“

شاعروں اور موسیقاروں کی طرح مصوّر بھی جنسی جبلت سے فیضان حاصل کرتے رہے ہیں حسین و جمیل عورتوں کے نقوش میں محبت کے جذبے اور جنسی ترغیب نے رنگ بھرا ہے۔ اشیاء العلوم کے اعلیٰ مصوّر نے نہایت خوبصورت نسوانی پیکر تراشے ہیں۔ تیشیائے، بوٹے اور دیلا کرانے کی حسین برہنہ عورتوں کی تصویریں ہر ادبوس کے اُبھار کا باعث نہیں ہوتیں بلکہ ذوقِ حُسن کی تربیت کرتی ہیں۔ اقوامِ عالم کے مصوّر صبح تا یح سے حُسنِ نسوانی کے مرقعے پیش کرتے رہے ہیں۔ اربابِ بصیرت کے خیال میں نسوانی حُسن و جمال سے قطع نظر کر کے حُسن و جمال کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا اور ظاہر ہے کہ حُسنِ نسوانی کا شعور و ادراک جنسی خواہش ہی کا مرہونِ منت ہے۔ جنسی خواہش کے فطری اظہار میں رکاوٹ پیدا ہو تو وہ مرفع ہو کر فنونِ لطیفہ کی آبیاری کرتی ہے۔ ایلورا، اجنٹا اور پومپائی کے دیواری نقوش اس کی معروف مثالیں ہیں۔ اجنٹا کے غاروں میں بودھ ہیکشو تجرد اور زاویہ نشینی کی زندگی گذارتے تھے اور بستیوں سے عدا گریز کرتے تھے تاکہ عورت کی کشش سے محفوظ رہ سکیں لیکن جنسی جذبے کو کچلا نہیں جاسکتا۔ اس لئے ان کے دبائے ہوئے جنسی جذبے نے مرفع ہو کر تخلیقِ فن کی صورت میں اظہار و بیان کی راہ تلاش کی اور وہ فراغت کے اوقات میں تصویر کشی سے دل بہلاتے رہے، ان نقوش میں ہندو عورت کے حُسن و جمال کے بے مثل نمونے ملتے ہیں۔ بعض نقوش میں ملاہیت اور اختلاط کے مناظر بھی دکھائے گئے ہیں۔ نیم برہنہ عورتوں کے گدائے ہوئے بدن اور سانچے میں ڈھلے ہوئے اعضاء اپنے جنسی مآخذ کی طرف واضح اشارے کرتے ہیں۔

مصوّروں کی طرح سنگ تراش بھی مثالی حُسنِ نسوانی کے تعبیر و تشکیں میں کوشاں رہے ہیں۔ یونانِ قدیم کے سنگ تراشوں نے دنیا بھر کے حسین ترین مجسمے پیش کئے ہیں۔ یونانِ دانیلو

اُن کے کلاں فن کی ایک خوبصورت یادگار ہے۔ اعیاء العلوم کے دور کے سنگ تراشوں نے اس یونانی روایت کا اعیاء کیا۔ فلورنس، میلان، فیلیز وغیرہ کے نگار خانوں میں اُن کے شاہکار محفوظ ہیں۔ اُن کے تراشے ہوئے حسین عریاں نسوانی جیسے رفعت احساس کا سامان وافر رکھتے ہیں۔ مالک انجلو نے قدماے یونان کی طرح مردانہ حسن کی ترجمانی کی۔ اُس کا مجسمہ دَودِ اپالو کی یاد تازہ کرتا ہے۔ جنوبی ہند کے مندروں میں میتھن کا علامتی محرک خالصتاً جنسی ہے۔ اس میں جنسی مواہلت کے مختلف پہلوؤں اور آسنوں کو بے محابا دکھایا گیا ہے۔ کونارک، کھیموراہر، بیلور وغیرہ کے مندروں کے درو دیوار پر اس قسم کے نقوش کثرت سے تراشے گئے ہیں۔ بعض ناقدین فن انہیں جین سنگ تراشی کی روایت قرار دیتے ہیں لیکن ظاہراً میتھن کا علامتی محرک ماقبل آریائی دور کے درادڑوں سے یادگار ہے جو لنگ اور یونی کی پوجا بڑے انہماک سے کرتے تھے۔ فن تعمیر میں بھی جینیاتی عوامل کا کھوج ملتا ہے۔ ہندوستان میں آج بھی شوالے شو لنگ کے نمونے پر تعمیر کئے جاتے ہیں۔

جنسیات کے طلبہ کہتے ہیں کہ مذہب اور ادب و فن میں ہر قسم کی کج رویاں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ ادعا شائبہ صداقت سے خالی نہیں ہے۔ بعض شاعروں، تیش نگاروں اور قصہ نویسوں نے جنسی غلامی، ایذا کوشی، ایذا طلبی، جنسی عفتیوں، مردانگن عورتوں، حیوانیت، ہم جنسیت، معاشرۂ محرمات، نرگسیت، زنانے مردوں، مردانہ عورتوں، نوجیزوں کے ساتھ بڑوں اور بڑوں کے ساتھ نوجیزوں کے معاشرقوں سے موضوع لئے ہیں۔ یورپی پیڈیز کی تمثیل 'ایس' محرمات کے معاشرقے پر مبنی ہے۔ شیکسپیر کی تمثیل انٹنی کلیو پیڈ کا مرکزی خیال جنسی غلامی ہے۔ انٹنی کوشش کے باوجود اپنے آپ کو کلیو پیڈ کی جنسی غلامی سے آزاد نہیں کرا سکتا۔ وہ کہتا ہے "میں ایک کسی کی آتش بوس کو بھڑکانے کے لئے دھونکنی اور نپکھان کر نہیں رہوں گا۔" لیکن آخر تک وہ اس غلامی کا جوا اپنی گردن سے نہ اتار سکا۔ میہلٹ کی ماں اُس کے باپ کے قتل کے بعد اپنے دیور سے شادی کر لیتی ہے جسے میہلٹ معاشرقۂ محرمات کہہ کر سخت نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ سیفو

اور ابو نواس کی شاعری میں ہم جنسی عشق کی پرجوش ترجمانی کی گئی ہے۔ ۱۸ ویں صدی کے مشہور فرانسیسی قاموسی دیدیر نے اپنے ناول 'راہبہ کی سرگزشت' میں عشق ہم جنسی کا اُستادانہ تجزیہ کیا ہے۔ ایک حسین و جمیل لڑکی کو اُس کی مرضی کے خلاف لُٹبہ بنا دیا گیا ہے۔ خاتقاہ کی منظمہ جو لُزبائی ہے نووارد راہبہ پر فریفتہ ہو جاتی ہے اور مردوں کی طرح اُس سے اظہارِ مدعا کرتی ہے۔ نوجوان راہبہ اعترافِ سننے والے پادری کو سب کچھ بتا دیتی ہے۔ وہ اُسے منع کرتا ہے کہ منظمہ کے پاس خلوت میں کبھی نہ جانا۔ لڑکی اس حکم کی تعمیل کرتی ہے منظمہ آشوبِ فراق کی تاب نہ لا کر پاگل ہو جاتی ہے اور آخر مر جاتی ہے۔ لُزبائی عشق پر اس ناول کو کلاسیک کا درجہ حاصل ہے۔ خلوت کے مناظر حقیقت نگاری کے دلاویز نمونے ہیں۔ سوفوکلز کی تمثیل فیڈرا اور رسیں کی اسی نام کی تمثیل کا موضوع بھی عشقِ عورت ہے۔ لکھنؤ کی ریختی کی تہ میں زنانہ پن ہے جو اس معاشرے کی زوال پذیری کی علامت بھی ہے اور پیداوار بھی ہے۔ سعادت یار خاں رنگین اور انشا و الدخاں اس کے مخترع تھے۔ صاحبجران، جان صاحب، نازنین اور عصمت ریختی گو تھے عصمت لکھنوی زنانہ لباس پہن کر مشاعروں میں شرکت کرتا تھا۔ لاطینی شاعر ادوڈ کی نظم 'فن عشق بازی' میں ایک جنسی پاپی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ قدیم داستانوں میں بھی ہر نوع کی کج رویاں دیکھنے میں آتی ہیں مثلاً الف لیلہ و لیلہ کی لہر کے عشاق کی داستان میں دو لُزبائی عورتوں کا معاشرہ بیان کیا گیا ہے۔ اسی کہانی میں ایک عورت ذاتِ الدواحی مسافحہ کی عادی ہے اور نوجوان لڑکیوں کو دامِ فریب میں پھانس لیتی ہے۔ بائرن نے اپنی جنسی کج رویوں کی سرگزشت لکھی تھی جسے اُس کے دوست ہاب ہونس نے نذیرِ آتش کر دیا۔ بائرن کہتا ہے

” میں نے ہونس کے تمام سرچشمے خشک کر دیے ہیں، میں ہوں ایک بوڑھا جوان آدمی۔“

لے آج کل لُزبائی عشق کو فلموں میں دکھایا جا رہا ہے مثلاً STAIRCASE ، THE FOX  
- MIDNIGHT COWBOY

ایک نقاد نے کہا ہے کہ ڈان لیوان کی فلم ایک خبیث شیطان (بائرن) ہی لکھ سکتا تھا۔ بائرن کو ایلیسانہ شاعری کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ بے دیو کی گیتا گووند میں کرشن کو ایک جنسی عفریت کی صورت میں پیش کیا گیا ہے جو بے پناہ قوتِ رجولیت کا مالک ہے اور ہر دم گویوں کے تعاقب میں بھاگتا پھرتا ہے۔ دانزلیو، کامیو، سارتر اور موریاک کے قصوں میں معاصر اہل مغرب کی عورت دشمنی، جنسی کلیت اور نابکاری کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ مغرب میں ایذا کو شہی اور جنس کے امتزاج سے ٹھوس کے موضوع لئے جاتے ہیں۔ ان میں خودخوار قاتل اور نیم برہنہ عورتیں رروش بدوش دکھائی دیتے ہیں۔ فلم سازوں کے خیال میں قتل و غارت کے مناظر اور بہتا ہوا خون دیکھ کر ناظرین جنسی حظ محسوس کرتے ہیں جس کی پرورش خوش گل عورتوں کے گدرائے ہوئے سین بدن کی تلاش سے کی جاتی ہے۔ برہنگی شبانہ مجالس تک محدود نہیں رہی بلکہ سکریں اور سٹیج پر بھی آگئی ہے لندن کے 'مرید' تھیٹر میں اوقیلو کی تمثیل دکھائی گئی تو آخری منظر میں ڈیسڈے مونا کو بستر پر برہنہ دکھایا گیا تاکہ وہ اپنے بدن کی رعنائی سے اپنے غضبناک شوہر کو لبھا سکے۔

ازدواجی زندگی کے عقد سے معاشرہ انسانی کے اہم مسائل میں شمار ہوتے ہیں۔ بہت ہی کم خوش نصیب میاں بیوی ایسے ہوں گے جنہیں بھرپور ازدواجی مسرت ارزانی ہوئی ہو اور جو کامل جسمانی، ذہنی اور ذوقی موافقت سے بہرہ یاب ہوئے ہوں۔ اکثر گھروں میں ازدواجی زندگی بڑے یا چھوٹے ایسے کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور میاں بیوی ایک دوسرے سے بے زاری اور بد مزگی کی زندگی گزارتے ہیں۔ مشاہیر تھیل نگاروں اور قصہ نویسوں نے ازدواجی زندگی کے اس پہلو کو موضوعِ سخن بنایا ہے اور اس کے المناک پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی ہے مثلاً لیوناسٹائے کے ناولوں آنا کیسے مینا اور کراٹر سوٹا اور فلاٹر کے ناول مادام بواری کا موضوع یہی ہے۔ ان میں ازدواجی زندگی کے عذاب کا ذکر کیا گیا ہے۔ کراٹر سوٹا کا مرکزی کردار پوزنی شیف صد کے مارے اپنی بیوی کو قتل کر دیتا ہے۔ وہ اپنی ازدواجی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے۔

” ہماری حالت ان مجرموں جیسی تھی جو کالے پانی کی سزا کاٹ رہے ہوں اور اس

قیدِ بامشقت میں انہیں ایک ہی زنجیر میں جکڑ دیا گیا ہو۔ ہم ایک دوسرے سے نفرت کرتے تھے۔ ہم نے ایک دوسرے کی زندگی کو جہنم کا نمونہ بنا رکھا تھا۔ لیکن بظاہر ہماری کوشش یہی تھی کہ یہ عذاب ہماری آنکھوں سے اوجھل رہے اس وقت مجھے اس بات کا علم نہیں تھا کہ تناؤ سے فی صد لوگ اسی جہنم میں عذاب بھگت رہے ہیں۔“

یہ حالات تھے جب ایک موسیقار اُن کے گھر آیا اور اُس نے پایا پریٹ ہوؤں کا نغمہ کرکمز سونا بجایا۔ پوننی شیف کی بیوی مسکور ہو گئی اور دل و جان سے اُس پر فریفتہ ہو گئی۔ ایک دن پوننی شیف اپنا گھر آیا تو اُس نے دونوں کو اکٹھا دیکھا۔ اُس نے تاؤ کھا کر بیوی کو قتل کر دیا۔ یہ کہانی بڑی حد تک سوانحی ہے۔ لیوٹالسٹائے کے اپنی بیوی سونیا سے آئے دن کے جھگڑے اذیت ناک صورت اختیار کر گئے تھے۔ اُن کے یہاں گیارہ برسوں میں آٹھ بچے پیدا ہوئے۔ سونیا نے ایک دن جل کر ٹالسٹائے سے کہا کہ تم نے تو مجھے نسل کشی کی گھوڑی بنا رکھا ہے۔ ٹالسٹائے اپنی بیوی سے سخت متغیر تھا لیکن کوشش کے باوجود ضبط نہیں کر سکتا تھا۔ اپنے روزنامے میں لکھتا ہے۔

”میں ایک غلیظ شہوت پرست بڈھا ہوں۔“

ان ایام میں ٹالسٹائے کا ایک عقیدت مند موسیقار پیٹیف اُن کے یہاں آکر ٹھہرا۔ سونیا اُس کے نفخے سُن کر اُس پر فریفتہ ہو گئی۔ ٹالسٹائے حد کے مارے جل کر کہاں ہو گیا اور کرکمز سونا لکھ کر دل کی بھر اس نکالی۔ جب یہ قصہ شائع ہوا تو سونیا نے جزیرہ شوہر اپنے شوہر سے کہا کہ یہ کہانی لکھ کر تم نے میری رسوائی کا سامان کیا ہے۔ اواخر عمر میں ٹالسٹائے ازدواجی زندگی کو قانونی عصمت فروشی کہا کرتا تھا۔ اُس کے عظیم ناول آناکرے نینا کا موضوع بھی یہی ہے۔ آنا اپنے شوہر رسیدہ شوہر سے بیزار ہے۔ اُس کی ملاقات ایک نوجوان فوجی افسر درونسکی سے ہوتی ہے اور وہ اُس کی مردانہ وجاہت پر فریفتہ ہو جاتی ہے۔ شوہر کے طعن و طنز سے تنگ آکر وہ اپنے محبوب کے ساتھ جھگ جاتی ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد درونسکی اُسے دھتاتادیتا ہے اور آنا مایوسی کے عالم میں ریل

کے انجن کے آگے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لیتی ہے۔ مادام بواری میں بھی متاہل زندگی کے المناک پہلو کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مادام بواری اپنے سیدھے سادے شوہر سے مطمئن نہیں ہے اور اٹھتے بیٹھتے نوجوانی تخیلات میں کھولی رہتی ہے۔ آخر ایک اوباش اسے اغوا کر لیتا ہے اور اس سے فیض یاب ہو کر اس قطع تعلقی کر لیتا ہے۔

گائیتے کے ناول میں ٹیول مایاں کی میروئن مراد لباس پہنتی ہے۔ وہ کہتی ہے تمام مرد بدھوت ہوتے ہیں۔ میرا گھوڑا ان مردوں سے زیادہ خوبصورت ہے۔ مجھے اس کے چومنے سے اتنی خواہش محسوس نہیں ہوتی جتنی کہ مرد کے بوسے سے ہوتی ہے۔“ فرانس کے شاعر پارے لوئی نے ہم جنسی عشق پر پُر جوش نظمیں لکھیں تھیں جن کے مجموعے کا نام تھا ”بلاٹس کے گیت“۔ آج کل یورپ اور امریکہ میں ’بلاٹس کی بیٹیاں‘ کے نام سے عورتوں نے انجمنیں قائم کر رکھی ہیں جن میں آزادی نسواں اور لڑبائی عشق کے حق میں پرچل کیا جاتا ہے۔ امریکی شاعر والٹ وٹمین نے بھی ہم جنسی محبت کی تعریف کے گیت گائے ہیں۔ ۱۹۶۰ء سے پہلے جنسی ملاجعت و مواصلت کے مناظر نیلی فلموں تک محدود تھے، اب عام فلموں اور ناٹکوں میں دکھائے جاتے ہیں جس سے ہوس دید کی تسکین مقصود ہوتی ہے۔ ’لڑبائیں‘ اسی نوع کی ایک فلم ہے اور ’ادہ کلکوتا‘ اسی قسم کا ایک ناٹک ہے۔ اس میں مادر زاد برہنہ مرد عورتوں کو گردہ پی رقص کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ خود لذتی کی خیال آرائی پر جین ٹرینے کا ناول ’پھول والی خاتون‘ قابل ذکر ہے جو قید خانے میں لکھا گیا تھا۔ یاد رہے کہ دساد کے ناول بھی قید خانے ہی میں لکھے گئے تھے اور انہیں بھی اسی خیال آرائی کی تخلیقات سمجھا جاتا ہے۔

آخر میں ہم فحش نگاری کا ذکر کریں گے جو ادبیات کا ایک اہم مسئلہ ہے فحش نگاری کی روایت قدماے یونان و روم سے یادگار ہے۔ یونان قدیم میں فحاشی کی دیوی تھی جس کے سالار تہوار پر مرد عورتوں کا اور عورتیں مرد کا لباس پہنتی تھیں اور ہر قسم کے کجروی کے مظاہرے کئے جاتے تھے۔

ہومرنے ایڈم میں خداوند خدا زلیں اور اُس کی زوجہ ہیرا کی مواصلت ساٹھ مصرعوں میں بیان کی ہے جو نہایت ہوس پرور ہے۔ وہ اوڈیسی میں لکھتا ہے کہ ایک دن دیوتا پیٹھے سُس نے اپنی زوجہ افروڈائی کو دیوتا ایریز کے ساتھ ناگفتہ بہ حالت میں دیکھا تو وہ تمام دیوتاؤں کو بلا لایا اور انہیں یہ منظر دکھایا۔ ہومرنے اس منظر کی وصف نگاری میں خوب خوب پیر پھیلانے ہیں۔ قدیم روم میں غش نفیس لکھی جاتی تھیں۔ جوان لڑکے لڑکیاں انہیں چھپ نک کر پڑھا کرتے تھے۔ ایک باقاعدہ تحریک کی صورت میں غش نگاری کا آغاز ۱۷ ویں صدی عیسوی میں ہوا اور ۱۸ ویں صدی میں غش تحریریں تمام مغربی ممالک میں رواج پانگیں۔ وکٹوریہ کے عہد حکومت میں غش نگاری کے وہ تمام اسالیب معین ہو گئے جو آج تک باقی ہیں مثلاً سائنسی مقصد کے لئے جنسی فعل کا تفصیلی تذکرہ، علم الانسان اور تقابلی مذہب کے نام پر قدیم اقوام و مذاہب کی عجیب و غریب جنسی رسوم کا ذکر، لوک بت کہاؤ اور لوک گیتوں کے حوالے سے غش نگاری کرنا، شادی کے ہدایت نامے وغیرہ۔ ہنری سپنسر الیش بی نے اپنی تالیف انڈکس کی تین ضخیم جلدوں میں جملہ غش تحریروں کو جمع کر دیا۔ وہ کہتا ہے کہ کسی قوم کے غش ادب میں اُس کے اخلاق کا عکس پڑتا ہے جیسا کہ مثلاً میرا، دساد، نرسیا، لے کلو وغیرہ کے قصوں میں ۱۸ ویں صدی کے فرانسیسی امراء کی فاسقانہ زندگی کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ ان مصنفین نے معاصر معاشرے ہی کی تصویر کشی کی ہے۔ الیش بی کہتا ہے کہ کسی عہد کے اخلاقی محاسن کو بھی اُس زمانے کے معائب کے بغیر سمجھا نہیں جاسکتا۔ اُس کا یہ خیال محل نظر ہے کیوں کہ غش قصوں میں کسی معاشرے کی قدروں یا کسی فرد کے احوال کی حقیقی ترجمانی نہیں کی جاتی بلکہ وہ سراسر مرئیانہ خیال آزادی پر مبنی ہوتے ہیں لہذا غش قصوں کا اس خیال سے مطالعہ کرنا کہ اُن سے کسی معاشرے کی اخلاقی قدروں کا ادراک ہوگا سچی بے مہر ہوگی غش تحریروں میں زندگی کے تلخ حقائق سے گریز کر کے ایک ایسے خیالی عالم میں پناہ لی جاتی ہے جس میں سوائے جنسی مواصلت کے کچھ بھی نہیں ہوتا اور یہ وہ عالم ہے جس میں مرد و عورتیں ہمہ وقت ہمہ تن جنسی مواصلت میں غرق رہتے ہیں۔ یہ خیالی عالم وہ لوگ بساتے ہیں جو جنسی محرومی اور کمزوری کے شکار ہوتے ہیں۔

اور اپنی ولامانگی اور کوتاہ ہمتی کی تلافی شہوانی خیال آرائی سے کرتے ہیں۔ اس خیالی آرائی میں شہوت رانی کی بجائے برپا کی جاتی ہیں جن کی وصف نگاری واضح طور پر لکھنے والے کی جنسی فاقہ زدگی کی غمازی کرتی ہے۔ اس تفصیل نگاری میں اگتا دینے والی تکرار ہوتی ہے اور وہ برابر میکا لکی ہوتی ہے۔ پورنو ٹوپیا میں تمام مرد غیر معمولی رجولیت کے مالک ہوتے ہیں اور تمام عورتیں دن رات جنسی ہیمان میں مبتلا ہوتی ہیں۔ اس میں عشق و محبت یا حسد و رقابت کا کوئی وجود نہیں ہوتا، کہانی کا اتار چڑھاؤ نہیں ہوتا، ڈرامائی صورت احوال نہیں ہوتی، جذبات کا تصادم نہیں ہوتا، فطری مناظر اور معاشرتی عقدوں سے اعتنا نہیں کیا جاتا۔ اس کے کردار میکا لکی انداز میں جنسی مواصلت کئے جلتے ہیں اور اس سے کبھی سیر نہیں ہوتے۔ ایک مرد اور دوسرے مرد میں کچھ بھی فرق نہیں ہوتا، عورتیں بھی سبھی ایک جیسی ہوتی ہیں۔ غرض کہ مرد عورتیں پلاسٹک کے کھلونے ہوتے ہیں اور کھلونوں ہی کی طرح ایک عمل کو بار بار دہراتے رہتے ہیں۔ فحش قہقے میں وقت کے گزرنے کا احساس نہیں ہوتا۔ اس کا آغاز پہلے جنسی تجربے سے ہوتا ہے۔ جب تک آدمی زندہ رہتا ہے اس کی رجولیت بحال رہتی ہے اور جب تک اس کی جنسی توانائی برقرار رہتی ہے وہ زندہ رہتا ہے فحش ناول کے کردار ہر عنوان سے ہر بہانے سے جنسی مواصلت پر کمر بستہ رہتے ہیں۔ ان کا مذہب لنگ اور یونی کی پرستش کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ فحش ناول نگار عالم خیال میں اپنے آپ کو جنسی پہلوان تصور کر لیتے ہیں۔ راقم الحروف کو ایک نوجوان کی تحریریں دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے جو جبری خود لذتی میں مبتلا تھا اور اپنی کم ہمتی اور احساس کمتری کی تلافی فحش نگاری سے کیا کرتا تھا۔ وہ ایک سوکھا ہوا مرل سار کا تھا لیکن اپنی تحریروں میں وہ ایک قوی ہیکل شدہ زور جوان دکھائی دیتا ہے جس کے پیچھے عورتیں دیوانہ وار بھاگتی پھرتی ہیں۔

راقم الحروف کے خیال میں سچا ادب اور سچا فن فحش ہو ہی نہیں سکتا کیوں کہ وہ محض خیال

آرائی پر مبنی نہیں ہوتا بلکہ اس کا ذہنی اور ذوقی رشتہ روزمرہ کی زندگی اور اس کے مسائل سے بلا واسطہ  
 استوار ہوتا ہے اور وہ زندگی ہی سے اپنے موضوع تلاش کرتا ہے۔ اس کے ہاں جنسی جبلت  
 میں عشق و محبت کا پاکیزہ جذبہ مشمول ہوتا ہے اور عشق وہ کھلائی ہے جس میں جنسی خواہش ذوق  
 جمال کا زرخیز بن کر نکھر آتی ہے چنانچہ وہ تحریریں قطعی طور پر فحش ہیں جن میں جنسی مواصلت کا  
 ذکر سرد مہری سے کیا جائے اور اس کی وصف نگاری میکا لکی بن کر رہ جائے۔ اس نوع کی مواصلت  
 انسان کو حیران سے بھی پست تر کر دیتی ہے فحش قصوں میں ایذا کو شہی کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ اس  
 کی وجہ یہ ہے کہ فحش نگار ہمیشہ مرد ہی ہوتے ہیں اور کوتاہ ہمت مرد لازماً ایذا کو شہی ہوتا ہے۔ راقم  
 کے مشاہدے میں ایسے کئی واقعات آئے ہیں کہ مرد نے خلوت صحیحہ میں اپنی کوتاہ ہمتی سے جھلا  
 کر فریقِ ثانی کا گلا گھونٹ دیا یا اسے گولی مار دی۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ کسی بھی عورت نے  
 فحش ناول نہیں لکھے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ جنسی کوتاہ ہمتی کے شکار اکثر و بیشتر مرد ہی ہوتے ہیں۔  
 'فحش ادب' کی ترکیب مغالطہ آفرین ہے فحش تحریروں پر ادب کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔  
 کسی فاجر العقل کی خیال آرائی کو حیطہ تحریر میں لایا جائے تو وہ ادب نہیں کہلائے گی۔ اس طرح  
 ایک کوتاہ ہمت کی مریضانہ شہوانی خیال آرائی کو ادبیات میں شمار نہیں کیا جائے گا کیوں کہ ایک تو وہ  
 روزمرہ کی زندگی سے ذوقی فیضان حاصل نہیں کرتا، دوسرے جمالیاتی قدر کی قربانی سے قاصر رہتا ہے۔  
 فحش تحریریں پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے انسانی زندگی کی کوئی اساس نہیں ہے نہ اس  
 میں کسی نوع کی قدیم یا معنویت پائی جاتی ہے۔ دساد کے ناول جسن کی مثال ہمارے سامنے ہے۔  
 ۱۸ دیں اور ۱۶ ویں صدیوں کے فحش نگاروں نے اسی کو اپنے لئے نمونہ بنایا ہے جسن ایک  
 حسین دوشیزہ ہے جو ماں باپ کی وفات کے بعد بے یار و مددگار رہ جاتی ہے اور مصائب و  
 آلام اسے چاروں طرف گھیر لیتے ہیں۔ اسے کچھ عرصے کے لئے ایک ڈاکٹر کے یہاں قیام کرنا پڑتا ہے۔  
 یہ ڈاکٹر ایک جنسی عفریت ہے جس کی بدعنوانیوں میں ایذا کو شہی اور عشقِ محرّمات مشمول ہیں جسن  
 ڈاکٹر سے چھٹکارا پاتی ہے تو چند فاسق و فاجر راہبوں کے ہتھے چڑھ جاتی ہے خانقاہ کے دربار

قیام میں جو کچھ اُس پر گزرتی ہے وہ ہوسناکی اور ایذا کو شہ کی بدترین مثال ہے۔ اس قہصے کے مطالعے سے دساد کی اہلیست کھل کر سامنے آجاتی ہے اور قاری کے پست ترین جذبات بھراک اٹھتے ہیں جب کہ سچا ادب و فن جذبات کی تنقیح کا باعث ہوتا ہے اور انسان کے تعمیری اور مثبت میلانات کی پرورش کرتا ہے جنوبی ہند کے مندروں کے دیواری نقوش اور آرٹینو کی کتاب کی رسوائے زمانہ تصویریں بھی فحش ہیں۔ ہندو روحانیت کے حوالے سے یقین کی توجہ و تقدیس کرتے ہیں لیکن یہ محض جواز جوئی اور تاویل آرائی ہے۔

ڈاکٹر اسپر ہارڈ اور فلیس کردن ہاس نے فحش نگاری اور نفسیاتی حقیقت نگاری میں فرق کیا ہے۔ نفسیاتی حقیقت نگاری کا مقصد معروضی اور غیر جذباتی انداز میں جنس سے متعلق حقائق کو کھول کر بیان کرنا ہوتا ہے جب کہ ایک فحش نگار کا مقصد واحد ہوس انگیزی ہوتا ہے فحش قصوں اور نظموں کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک تو سراسر فحش ہیں اور دوسروں کے بعض مقامات کو فحش کہا جاسکتا ہے۔ سراسر فحش قصوں سے ہم طوالت کے خوف سے دو مثالیں دیں گے، 'ہوس پرست ترک' اور 'ہندوستان میں زہرہ'۔

'ہوس پرست ترک' خطوط کی شکل میں ہے۔ ایک انگریز لڑکی ایمیلی بارلو کو بھڑی تراق اغوا کر کے الجریا کے حاکم کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں۔ حاکم کے حرم میں جو کچھ ایمیلی پر گزرتی ہے وہ ان واردات کو خطوط کی شکل میں اپنی سہیلی سلویا کیری کو لکھ بھیجتی ہے۔ حرم کی دوسری لڑکیاں جو ترک حاکم کی ہوس کا نشانہ بنتی ہیں، ایمیلی کو بادی بادی اپنی آپ بیتی سناتی ہیں۔ قہصے میں ہر عنوان سے ترک حاکم کی جنسی فتوحات کا ذکر نہایت نفس پرور انداز میں کیا گیا ہے۔ ناول کا بیشتر حصہ اسی قسم کی وصف نگاری پر مشتمل ہے۔ اس میں معاشرہ انگریزی یا الجرائری معاشرے کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ جنسی مواصلت کے مناظر عجیب انگیز ہیں، انداز بیان میکافکی اور

ٹھس ہیں۔

دوسرا ناول انگریزی فوج کے ایک افسر کی خود نوشت سوانح ہے جس میں اُس نے ہندوستان کے دوران قیام میں اپنی جنسی مہمات کا ذکر کیا ہے۔ مصنف کیپٹن ڈیورڈ فوجی خدمات انجام دینے کے لئے ہندوستان آتا ہے اور صوبہ سرحد کی جھڑپوں میں حصہ لیتا ہے۔ اپنی ریجنٹ کے کیمپ کی طرف جاتے ہوئے راستے میں وہ ایک سرائے میں ٹھہرتا ہے جہاں اُس کی ملاقات ایک حسین انگریز عورت سے ہوتی ہے۔ عورت اُسے اپنے کمرے میں بلا لیتی ہے اور پھر جنسی مواصلت کی دھف نگاہی کا وہی چکر پالتا ہے جس میں حقیقت کم اور خیال آرائی اور آرزو پروردی زیادہ ہوتی ہے۔ ہر بار خلوت میں نئے نئے اسالیب اختراع کئے جاتے ہیں اور دونوں بے پناہ جنسی توانائی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد یہی کپتان اپنے میجر کی تین جوان کنواری لڑکیوں فینی، ایمی اور میبل سے اسی انداز میں تمتع کرتا ہے۔ میبل نہیں یکے بعد دیگرے اُس پر فریفتہ ہو جاتی ہیں اور باری باری سپردگی پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ دوسرے فٹش قصوں کی طرح اس ناول کا مقصد واحد عالم خیال میں اُس جنسی لذت ادا سودگی کا حصول ہے جن سے مصنف اپنی حقیقی زندگی میں محروم رہا ہے۔ یہ نام نہاد خود نوشت سوانح عمری سراسر دروغ و جعل ہے۔ اس میں ہندوستانی معاشرے کی جو جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں وہ محض چند الفاظ و تراکیب اور سنسنی خیزی با توں تک محدود ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے ہندوستان میں قدم تک نہیں رکھا۔

آج کل یورپ اور امریکہ کے شہروں میں فٹش قصے بر ملا فروخت ہوتے ہیں جو عورتیں اور مرد بوجہ جنسی آسودگی سے محروم رہتے ہیں اور اُس مُسرت کے لئے ترستے رہتے ہیں جو جنسی خواہش کی بھرپور تسکین ہی سے میسر آ سکتی ہے وہ فٹش قصوں کے مطالعے سے اپنی محرومیوں کی تلافی کر لیتے ہیں۔

مغرب میں فٹش قصوں نہیں ہر لباس اتارنا شانہ مجالس کی مقبولیت اس حقیقت

کی غمازی کرتی ہے کہ جنسی آزادی کے باوجود مغرب کے بے شمار عورتیں مرد بیزاری اور اکتاہٹ  
 کی زندگی گزار رہے ہیں اور اس کے مداوا کے لئے فحاشی اور عریانی سے رجوع لانے پر مجبور  
 ہیں۔ یہ امر قابل غور ہے کہ اشتراکی ممالک میں فحش نگاری کا کوئی کھوج نہیں ملتا۔ اشتراکی  
 معاشرے میں لوگ اس قدر مصروفیت کی زندگی گزارتے ہیں اور انہیں معاشی آسودگی کے ساتھ  
 ساتھ جذباتی تسفی کے اتنے سامان میسر ہیں کہ وہ مریضانہ خیال آرائی سے رجوع نہیں لاتے جو  
 شخص محنت مشقت کی صاف ستھری سیدھی سادی زندگی گزار رہا ہو اس کی جنسی جبلت  
 میں بھی ہمواری اور اعتدال کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے چنانچہ اشتراکی معاشرے میں ذہنی و جذباتی  
 آسودگی کے باعث شہوانی خیال آرائی بلکہ کسی قسم کی مریضانہ خیال آرائی یا ذہنی فرار کا کوئی عنصر  
 ہی باقی نہیں رہتا۔

---

# برده فروشی

برده فروشی نے افراد و اقوام عالم کی جنسی زندگی پر گہرے اثرات ثبت کئے ہیں۔ جیسا کہ معلوم عوام ہے برده فروشی کا انسداد ۱۹ ویں صدی میں کیا گیا۔ اس سے پہلے کم و بیش دس ہزار برسوں تک غلاموں اور لونڈیوں کی خرید و فروخت کا بازار گرم رہا۔ شاہیت اور جاگیر داری کے زمانوں میں حکومت کی باگ ڈور مطلق العنان بادشاہوں اور ان کے درباریوں کے ہاتھوں میں تھی جو برہمنی بے رحمی سے عوام کا استحصال کرتے تھے اور ان کے گارٹھے پسینے کی کمانی کو اپنی عیش و عشرت پر بے دریغ خرچ کرتے تھے۔ چین و جیل لونڈیاں جن جن کرہم سراؤں میں داخل کی جاتی تھیں اور انہیں اپنے آقاؤں کی بوسنائی کی تسکین کرنا پڑتی تھی۔ فوئیز، خوش گل غلاموں سے ساتی گرمی کا کام لیا جاتا تھا اور ایرانی ذوق رکھنے والے امراء ان سے متمتع ہوتے تھے چنانچہ جنسیات کے طلبہ بجا ہمد پر برده فروشی کو خصوصی مطالعے کا مستحق سمجھتے رہے ہیں۔ معاشرۂ انسانی پر برده فروشی کے جنسی اثرات کا ذکر کرنے سے پہلے ہمیں اوائل تمدن سے رجوع لانا ہو گا۔

برده فروشی کا آغاز زرعی انقلاب سے وابستہ ہے جب انسان نے عہدِ حجریہ کی شکار کی زندگی کو ترک کر کے کھیتی باڑی اختیار کی اور ذاتی املاک کا تصور معاشرۂ انسانی کا مرکز و محور قرار پایا۔ شروع شروع میں فاتحین جنگی قیدیوں کو تہ تیغ کر دیتے تھے، پھر انہیں دیوتاؤں کے مناجات پر قربان کرنے کا رواج ہوا اور تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ انہیں گائے بیل، بھیڑ بکری کی طرح ذاتی املاک میں شمار کرنے لگے۔ آقا کو اپنی دوسری املاک کے ساتھ غلاموں اور لونڈیوں کو بیچنے کا حق بھی تھا۔ چنانچہ مہر، بابل، یونان، چین، اشوریا، ہند، فینیقیہ، روم، ایران اور اسرائیل میں برده فروشی رواج پا گئی۔ یونانی، رومی اور اسرائیلی اپنے ہم قوموں کو لونڈی غلام نہیں

بناتے تھے لیکن بابل اور چین میں اسے بھی جائز سمجھا جاتا تھا۔ ان اقوام میں باپ اپنی سرکشی اولاد کو اور شوہر اپنی نافرمان بیوی کو لونڈی غلام بنا کر بیچ دیا کرتا تھا۔ چین اور اسرائیل میں قرضخواہ اپنی رقم کے وصول نہ ہونے پر مقروض اور اُس کے بچوں کو غلام بنالینے کا مجاز تھا۔ افریقہ، ہسپانیہ، گال، الٹی، روس اور ایشیا سے غلاموں اور کنیزوں سے لدے ہوئے جہاز رومہ آتے تھے۔ بعض اوقات ایک دن میں سیکڑوں لونڈی غلام نیلام کئے جاتے تھے۔ اُس زمانے میں جنگ کا ایک مقصد ملک گیری کے علاوہ لونڈیوں اور غلاموں کی فراہمی بھی تھا۔ بڑے بڑے شہروں میں رات غلاموں اور لونڈیوں کی خرید و فروخت کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ سلاطین اور اُمراء اظہارِ قول اور نفس پرورمی کے لئے لونڈیاں اور غلام خریدتے تھے اور ایک دوسرے کو تحفہ بھی پیش کرتے تھے۔ جرجی زیدان لکھتا ہے۔

”خسرو پرویز شاہ ایران نے قیصر روم موریتس کے پاس سو غلام بھیجے جو ترکی کے شاہی خاندان سے تھے اور نہایت حسین تھے۔ ان کے کانوں میں سونے کی بالیاں تھیں اور بالیوں میں موتی پروے ہوئے تھے۔ قیصر روم نے ان کے عوض دوسرے تحائف کے ساتھ بیس لونڈیاں بھیجیں جو سب کی سب برگنڈی، ایسکین وغیرہ شاہی خاندانوں کی لڑکیاں تھیں اور جن میں ہر کنیز کے سر پر طلائی تاج تھا۔“

غلام اور کنیزیں خراج میں بھی وصول کئے جاتے تھے۔ ہیروڈوٹس کہتا ہے کہ ہر سال کاپس کے باشندے ایک سولہ کے اور ایک سولہ لڑکیاں بطور خراج شہنشاہ ایران کو بھیجتے تھے۔ ان میں سے بعض لڑکوں کو، مچھڑے بنا کر حرم کی خدمات پر مامور کیا جاتا تھا۔ مچھڑوں کی تین قسمیں تھیں۔ ۱۔ صدنی، جس کا قصب اور خصیتیں دونوں قطع کر دیتے تھے۔ ۲۔ جن کا صرف قصب قطع کیا جاتا تھا۔ ۳۔ جن کے صرف خصیتیں قطع کئے جاتے تھے۔ اول الذکر سے معاشقے بھی کئے جاتے تھے انہیں

۱۰ CASTRATO

۱۱ THLIBIAS

۱۲ عربی میں ان تینوں قسموں کو غُشی کہا جاتا ہے۔

برہہ فروشوں سے خرید کر قبر خانوں میں بھی رکھا جاتا تھا۔ فیدہ جس کے ساتھ سقراط کا مشہور مکالمہ منسوب ہے قبر خانے ہی سے خریدایا گیا تھا۔ فنیقیوں کے شہر سدوم اور یونانی شہر کورنتھ میں اُمرؤں اور ہیجڑوں کے بڑے بڑے قبر خانے موجود تھے۔

افلاطون اور ارسطو نے اپنے سیاسی اور عمرانی نظریات میں غلاموں کے حقوق سے اعتنا نہیں کیا نہ انہیں شہریوں میں شمار کیا ہے۔ ارسطو اپنی کتاب سیاست میں لکھتا ہے کہ غلاموں کا وجود کسی معاشرے کے استحکام اور بقا کے لئے ضروری ہے۔ رومہ میں غلام اور کینز کو شہری تسلیم نہیں کیا جاتا تھا بلکہ انہیں ذاتی املاک میں شمار کرتے تھے۔ غلام اپنے آقا کی رضامندی کے بغیر شادی نہیں کر سکتا تھا۔ کینز کے بطن سے جو بچے پیدا ہوتے خواہ وہ آزاد باپ کے صلب سے ہوں غلام ہی سمجھے جاتے تھے جس طرح ہندوؤں میں شوہر عورت کے بچے خواہ وہ ایک برہمن کے صلب سے ہوں شوہر ہی منظور ہوتے تھے۔ آقا کو اپنے غلاموں اور کینزوں کے جسم و جان پر پورا پورا تصرف حاصل تھا اور وہ آقا کے ظلم کے خلاف عدالت سے رجوع نہیں لا سکتے تھے۔ معمولی لغزش پر لونڈیوں اور غلاموں کو دردناک عذاب دیئے جاتے تھے۔ رومہ کا قانون تھا کہ کوئی آقا اپنے کسی غلام کے ہاتھ سے مارا جاتا تو مقتول کے دوسرے غلام بھی بے دریغ جان سے مار دیئے جاتے تھے۔ ایک رومی رئیس سکنڈس کو اُس کے ایک غلام نے قتل کر دیا باقی کے ساتھ مقتول کے چار سو غلام موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ رومہ میں اُمر و پرستی یونان سے آئی تھی۔ نوفیز ساہ عذر غلام گراں بہا سمجھے جاتے تھے۔ ہمارے حساب کی زد سے ایک حسین لڑکا دس ہندہ ہزار روپے میں بکتا تھا۔ ایک دفعہ کیٹو کیر نے جل کر کہا ”ایک خوبصورت لونڈا میر حاصل جاگیر سے زیادہ مہنگا بکتا ہے۔“ جو غلام اراضی کی کاشت پر مامور تھے انہیں اراضی کے ساتھ ہی خریدنا اور بیچنا تھا۔ یونان اور رومہ کا معاشرہ غلامی کے ادارے پر تعمیر کیا گیا تھا۔ جب غلاموں کی رسد ختم ہو گئی تو معاشرہ بھی منہدم ہو گیا۔

اسلام سے پہلے برہہ فروشی کا رواج عام تھا۔ مسعودی نے ایک برہہ فروش عبد اللہ بن جبرائیل

کا ذکر کیا ہے۔ جو شخص غلام خریدتا تھا وہ اُس کے گلے میں رسی ڈال کر اُسے کھینچتا ہوا اپنے گھر لے جاتا تھا گویا وہ انسان نہیں اُونٹ گھوڑا ہے۔ عرب اپنی لونڈیوں سے نکاح بھی کر لیتے تھے لیکن اُن کی اولاد کو غلام ہی سمجھا جاتا تھا۔ بعض حالات میں باپ اس قسم کے بیٹوں کو مُتبنی بنا کر آزاد کر دیتا تھا۔ عرب کے مشہور شہسوار اور شاعر عمر بن شداد کو اسی طرح آزادی ملی تھی۔ اسلام میں کینزوں کو ملکِ یمین کہا گیا ہے۔ شیخین کے زمانے میں جب ایران اور روم کی فتوحات کے سلسلے میں لاکھوں رومی اور ایرانی عورتیں مرد گرفتار کر کے لائے گئے تو حجاز میں ہر کہیں لونڈیوں اور غلاموں کی ریل پل ہو گئی۔ فاتحین نے چار منگوحہ بیویوں کے علاوہ بیسویں کینز حرم میں داخل کر لیں۔ ان کینزوں کے بطن سے جو اولاد ہوتی تھی اسے ہمیں یاد دہلے کہتے تھے۔ ایک ایک شخص کے گھر میں سیکڑوں بچے پیدا ہوئے۔ عبدالرحمن بن الحکم نے پچاس بیٹیاں اور ایک سو پچاس بیٹے چھوڑے۔ تیم بن المعز کے ایک سو پچاس بیٹے اور پچاس سے زیادہ بیٹیاں تھیں۔ عمرو بن الولید کے نوے بیٹے تھے جن میں ساٹھ شہسوار تھے اور باپ کے جلو میں نکلتے تھے۔ شہر لکھنوی نے بڑی سنجیدگی سے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ کثرتِ ازدواج اور کینز داری نے عربوں میں اولوالعزمی پیدا کی تھی۔ فرماتے ہیں لے

» عرب کی سوسائٹی میں یہ کوئی معیوب بات نہ تھی صوفیوں کی وضع کا اِتِّقَالُ

میں آیا ہے تمام معزّین اسلام مرد نکاح کرنے، حسین عورتوں کو پیغام دینے

اور خوبصورت لونڈیاں رکھنے میں کسی قسم کا عیب خیال نہیں کرتے تھے۔ یہی عرب

کی سادہ زندگی تھی اور یہی وہ زندگی تھی جس نے عربوں میں اولوالعزمی پیدا کی۔

نبو امیہ کے زمانے میں مدینۃ النبی ناچ گانے کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔ شہر میں ہر کہیں بیت القیان

(گانے والی کینزوں کے گھر) دکھائی دیتے تھے جہاں لوگ گانا سننے اور ناچ دیکھنے جاتے تھے۔

نبو عباس کے دورِ حکومت میں بھی کینزوں کو ناچ گانے کی تربیت دلانے کے لئے مدینہ بھیجا جاتا تھا۔

بغداد میں گانے بجانے والیوں کے گھروں کو دارالغرائب کہتے تھے۔ بنو امیہ اور بنو عباس کے زمانوں میں روم اور ایران کے علاوہ ترکستان، جارجیا (گرجستان)، سرکاشیا (چرکس)، مصر، سوڈان، بربر، حبشہ، صقلیہ اور ہسپانیہ عربوں کی مملکت میں شامل ہو گئے اور مفتوح عوام کی لاکھوں نوڈیاں دمشق، بغداد، سامہ، حلب، موصل، بصرہ اور کوفہ کے بازاروں میں فروخت کے لئے آئے لگیں۔

نیوبا کی بہترین کینز جسے بڑی چاہت سے خریدا جاتا تھا، تین سو دینار میں آتی تھیں۔ سفید فام کینز میں بیش قیمت سمجھی جاتی تھیں۔ ایک سفید فام کینز کی قیمت ایک ہزار دینار سے کم نہ ہوتی تھی۔ غوازمی کو ایک دفعہ ایک کینز کے دس ہزار دینار پیش کئے گئے تھے۔ سفید فام غلاموں کو مالیک (جمع ملوک کی ہے) کہتے تھے۔ ان میں اکثریت ترکی، ارمنی، سلاوی اور چرکسی غلاموں کی ہوتی تھی۔ سادہ عذار خوبصورت لڑکے کو غلمان کہتے تھے۔ ان سے انہماک عشق کرنا آداب معاشرہ میں داخل تھا۔ مجالس ناؤ و نوش میں ساقی گری کا کام انہیں کے سپرد کیا جاتا تھا۔ وہ عورتوں کی طرح ریشمیں مٹھ لاس پہنتے تھے، آنکھوں میں سرمہ لگاتے تھے اور لب و رخسار پر غازے کی تہہ جاتے تھے۔ نوجوان کینزوں کو جواری (جمع جبارس کی) کہتے تھے۔ ان میں سے حسین کینز غلوت کی زینت بنتی تھیں۔ صوبوں کے والی منتخب پر سی جمل کینز بطور تحائف حرم خلعت میں بھیجتے تھے۔ ترکستان سے ہر سال سیکڑوں کینز اور غلام بطور خراج بغداد کو بھیجے جاتے تھے۔ بغداد کا سوق النخاس بردہ فروشی کا بڑا مرکز تھا جہاں دن رات چہل پہل رہتی تھی اور ہر روز سیکڑوں نوڈیوں غلاموں کے سودے پکائے جاتے تھے۔ بغداد کے سوق النخاس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا عبدالرزاق لکھتے ہیں۔

”بغداد میں غلاموں کا بازار سوق النخاس علاحدہ تھا جس میں ایشیا اور یورپ کے غلام اور کینز فروخت ہوتی تھیں۔ اس بازار میں جو بیس گھنٹے لین دین جاری رہتا تھا۔ کینزوں کی خریداری میں من ظاہری کے علاوہ ان کے اعضاء کے عیب و صواب بھی دیکھتے تھے۔ یہ کینز عموماً تعلیم یافتہ ہوتی تھیں اور امقدر شوخ اور فتنہ انگیز کہ خریداروں سے آنکھوں ہی آنکھوں میں سودا کر لیتی تھیں اور اپنے اوصاف برجستہ

اشعد میں بیان کرتی تھیں کہ خریدار مجبور ہو جاتا تھا۔ اس بازار میں جشیات، رومیات، جرجیات، شرکیات اور عریات کینزیں فروخت ہوتی تھیں۔“ لے

دلیل بونی دے کر غلام اور کینزیں نیلام کرتے تھے اور سودا ہونے پر تاجرانہ وصول کرتے تھے کچھ رقم سرکاری محصول کے طور پر ادا کی جاتی تھی۔ خریدار اور بردہ فروش کے درمیان سودے کی بابت تحریر ہو جاتی تھی جس پر شہادتیں قلم بند کی جاتی تھیں۔ جرمن مستشرق آدم میٹز اس عہد کی بردہ فروشی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے لے

”دور عباسیہ میں ہر بڑے شہر میں بردہ فروشوں کا بازار مخصوص تھا۔ یعقوبی نے سامرہ کے بازار کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ بردہ فروش بڑا مکڑ اور متغنی ہوتا تھا۔ کیندی کہتا ہے کہ یہ لوگ کینزوں کے چہرے اور بدن کا رنگ بھی تبدیل کر دیتے تھے اور سانولے رنگ کی کینز کو صبح اور سہرے بالوں والی میں تبدیل کر کے اور بعد جسم والی کو نازک بدن بنا کر بیچتے تھے۔ نیلی آنکھوں کو سیاہ آنکھوں میں بدل دیتے تھے اور زرد رخساروں کو لال بھوکا کر دکھاتے تھے، دُبیلے پتلے جسم کو گلابی بدن میں تبدیل کرنے کا سلیقہ رکھتے تھے، چہرے پر سے چمپک کے داغ اور مسے وغیرہ دور کر دیتے تھے۔ ایک بردہ فروش کہتا ہے ”ایک درہم قیمت کی جنا سے ایک کینز کی قیمت میں ایک سو درہم کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ چھوٹے بالوں میں سیاہ رنگ کے باریک بال اور دھاگے لگا کر انہیں زلف دراز بنا دیتے تھے، دانتوں کو چمکانے کے لئے کوئے اور نمک کو پس کر بنایا ہوا منجن استعمال کراتے تھے۔ بردہ فروش کینزوں کو ہدایت کرتے کہ وہ بوڑھے خریداروں کے ساتھ ناز و ادا سے پیش آئیں لیکن نوجوانوں کے سامنے شرمیلی بن جایا کریں۔ اس طریقے سے دونوں کے جذبات کو بھر پور کیا جاسکتا ہے۔ گوری کینزوں کے ناخنوں پر سرخی لگاتے اور سانولی کینزوں

کے ناخن سنہرے رنگتے تھے۔ اس طرح وہ خیر کی تقلید کرتے تھے جو پھولوں کے  
 مختلف رنگوں سے جاذبیت اور فریب نگاہ کا سامان کرتی ہے۔ یہ بیان ابن تہمان  
 کا ہے جس نے کینزوں کو خریدنے کے گرا اپنی کتاب میں لکھے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ  
 ہندی عود میں حلیم الطبع اور نازک مزاج ہوتی ہیں لیکن ان کا وزن جلد ہی زائل ہو جاتا  
 ہے۔ ہندی غلام اچھے منظم ہوتے ہیں اور صنعت و حرفت میں کامل ہوتے ہیں۔  
 سندھ کی عود میں کمر کی نزاکت اور زلف دراز کے لئے ممتاز ہیں۔ مدینہ کی کینز  
 شائستہ، شوخ و شنگ اور کافرا ہوتی ہے اور بہترین منظر بہ بنتی ہے۔ مکہ کی  
 کینزوں کے ٹخنے خوش وضع گداز ہوتے ہیں، کلاسیاں نازک ہوتی ہیں اور آنکھوں  
 میں شیریں خستگی کی کیفیت ہوتی ہے۔ طائف کی کینزیں بھورے سنہرے رنگ کی  
 نازک بدن ہوتی ہیں اور بذلہ سنج، خندہ جیس ہوتی ہیں بچے پیدا کرنے کے لئے  
 بربری کینزیں بہترین ہیں۔ وہ حلیم الطبع ہوتی ہیں اور ہر قسم کے حالات سے موافقت  
 پیدا کر لیتی ہیں..... بردہ فروشوں کے دلال ابو عثمان کے خیال میں بہترین کینز  
 بربر کی ہے جسے نو برس کی عمر میں اُس کے وطن سے لایا جائے اور جو تین تین برس  
 تک مکہ اور مدینہ میں قیام کرے اور اُس کے بعد عراق لائی جائے جہاں اُس کی  
 مناسب تربیت کی جائے۔ اس طرح اُس میں قدرتی اوصاف کے ساتھ مدینہ کی شوخی  
 و دلبری، مکہ کی نزاکت اور عراق کی شائستگی پیدا ہو جائے گی۔ تمام کینزوں میں  
 جشتی کینزیں خوش طبع ہوتی ہیں، تنکی کینزیں گوری اور نازک ہوتی ہیں۔ ان کی  
 آنکھیں بے شک چھوٹی ہوتی ہیں لیکن ان میں ہلاکی محسوس ہوتی ہے۔ وہ اچھی  
 شہسوار بنتی ہیں، فیاض اور خوش خصال ہوتی ہیں۔ وہ کھانا بھی خوب پکاتی ہیں  
 لیکن ان پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ یونانی کینزیں سرخ و سپید ہوتی ہیں۔ ان کے سر  
 کے بال نرم اور چمکیے ہوتے ہیں اور آنکھیں نیلی ہوتی ہیں۔ وہ فرماں بردار، باوقار،

اور قابلِ اعتماد ہوتی ہیں۔ آرمینیا کی کیزیں تمام سفید فام کیزوں میں بدترین ہوتی ہیں۔ وہ مناسب الاعضاء ہوتی ہیں لیکن اُن کے پیر پیرے بڑے ہوتے ہیں۔ انہیں چوری کی عادت ہوتی ہے اور عموماً بد چلن ہوتی ہیں۔ آرمینیا کی کیز یا غلام کو ایک ساعت کے لئے بیکار چھوڑ دو وہ کوئی نہ کوئی فتنہ ضرور جگا دیں گے۔“

برہہ فروشوں کے گھروں نے ہمارے یہاں کے اربابِ نشاٹ کے کوٹھوں کی صورت اختیار کر لی تھی جہاں رئیس زادے جوق و جوق جلتے تھے اور کیزوں سے بی بھلا تے تھے۔ الف لیلو و لیلہ میں طاہر بن الاعلیٰ کا ذکر کیا ہے جو ایک کیز کے پاس غصوت میں جاکر دس دینار وصول کرتا تھا شیخ صلاح الدین خدابخش نے کتاب الموشح کے حوالے سے برہہ فروشی کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں

» جب کوئی کیز کسی مجلس میں کسی رئیس زادے کو دیکھ پاتی ہے تو اُسے اپنی جانب مائل کرنے کے لئے آرزو پرورد نگاہوں سے اُس کی جانب دیکھتی ہے، اُس کے پیالے سے بچی ہوئی شراب پیتی ہے، انگلیاں چٹھا چٹھا کر اُس کی طرف بوسے پھینکتی ہے۔ جب وہ اُس کے رام محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے تو مکر و فریب سے اُسے یقین دلاتی ہے کہ تمہارے فراق میں میری راتوں کی نیند حرام ہو گئی ہے۔ وہ کبھی اُسے اپنی انگشتی جھیمتی ہے، کبھی اپنی زلف کا حلقہ کاٹ کر ساتھ کرتی ہے، کبھی اپنے ناخن کاٹ کر، کبھی خود کاٹ کر اور کبھی ٹوبان کا ٹکڑا جو بوسے کی علامت سمجھا جاتا ہے، کبھی اُسے رقعہ لکھتی ہے جسے اپنے خود کی تار میں پٹ کر جھیمتی ہے اور کاغذ پر اپنے آنسوؤں کے دھبے لگا دیتی ہے۔ جب وہ اُس پر قابو پالیتی ہے تو طرح طرح کی فرمائشیں کرنے لگتی ہے، معدن کا قیمتی کپڑا، نیت پور کے زرتار پر دے، سوس کے دستار، ریشمیں کر بند، کباجہ کے مُرصع جوتے، زرد اور الماس کے جڑاؤ ہار، انگشتیاں وغیرہ، کبھی وہ بیماری کا بہانہ کرتی ہے تاکہ اپنے عاشق سے تجلیف وصول کرنے یعنی مُشک و عنبر کی خوشبوؤں میں بسائی ہوئی قیغ، کاغذ پر قیمتی شراب وغیرہ اور جب وہ تلاش ہو جاتا ہے تو بڑی

سنگ دلی سے اُسے دھتا بادیتی ہے؟

خلفاء اور اُمراء تربیت یافتہ کینزوں کو حاصل کرنے کے لئے اپنے خزانے لٹا دیتے تھے۔ ہارون یحییٰ برمکی کی کینز دنیا پر فریقہ ہو گیا تو ملکہ زبیدہ نے اُس کا دل مٹانے کے لئے دس حسین کینز ہارون کو پیش کیں۔ انہی میں ملاحظہ تھی جس کے بطن سے مامون الرشید پیدا ہوا۔ مہدی جشی کینزوں کا دلدارہ تھا۔ اُس کا سیاہ نام بیابا ابراہیم جس نے موسیقی میں کمال حاصل کیا ایک جشی کینز کے بطن سے تھا۔ مامون الرشید نے عرب کو ایک لاکھ درہم میں خریدا۔ عرب ایک باکمال مہینہ تھی۔ اُس کے کمالات موسیقی پر خلیفہ المعتز باللہ نے ایک کتاب لکھی تھی۔ وہ ایک ہزار دھنوں کی موجود تھی۔ اُمراء شریف گھرانوں میں شادی کرنے سے گھبراتے تھے اور کینز کو اطروہ (اکراد عورت) پر ترجیح دیتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کینزوں کو خود دیکھ بھال کر خریدتے تھے جبکہ اطروہ کو عورتیں منتخب کرتی تھیں جن کا ذوق جن مشتبہ ہوتا تھا۔ چنانچہ یہ معلوم کر کے تعجب نہیں ہوتا کہ سفاح اور امین کے سوا تمام خلفائے بنو عباس کینزوں کے بطن سے تھے۔ منصور کی ماں سلامہ ایک بربر لونڈی تھی۔ المتکفی ایک یونانی کینز کے بطن سے تھا۔ المصطح کی ماں ایک سلاوی کینز تھی جو سیٹی خوب بجاتی تھی اور زبان پر پتہ رکھ کر بڑی دلکش سُریں نکالتی تھی۔ ہارون الرشید ایک ایرانی لونڈی خندان کا بیٹا تھا۔ خلفاء بنو عباس کینزوں پر بے دریغ دولت لٹاتے تھے۔ مہدی نے مکنونہ کو ایک لاکھ درہم میں خریدا اور بصبص پر سترہ ہزار دینار خرچ کئے۔ اسی طرح حلد اور حسنہ پر لاکھوں خرچ کئے تھے۔ ہارون نے ذات الحال کو ستر ہزار دینار میں خریدا تھا۔ مسعودی نے سوکھ کے بارے میں لکھا ہے کہ اُس کے حرم میں چار ہزار کینز تھیں۔ تلخیص عالم کا سب سے بڑا حرم خسرو پرویز کا تھا جس کی کینزوں کی تعداد بارہ ہزار تھی۔ کرشنار او والئی وجیانگر کے پاس بارہ سو خوبصورت لونڈیاں تھیں۔ مارکو پولو لکھتا ہے کہ قبلائی خان کے لئے ہر سال ارغوت (تاتار کا ایک علاقہ) سے ایک حسین کنوارا لائی جاتی تھی جن میں سے تیس چالیس منتخب کی جاتی تھیں۔ انہیں بوڑھی عورتیں اپنی نگہانی میں رکھتی تھیں۔ وہ

لے طبری

دیکھتے کہ ان میں کوئی جسمانی عیب تو نہیں ہے یا وہ رات کو سوتے میں خراٹے تو نہیں ملتے، اُن کی سانس خوشبودار ہے کہ نہیں اور جسم سے کوئی ناگوار بدبو نہیں آتی۔ اس معاینے کے بعد اُن کے بدن کو خوشبوئیات میں لسا کر اور لوبان کی دھونی دے کر خاقان کے شہستانِ عیش میں بھیجا جاتا تھا۔ فتح علی شاہ قاجار شاہ ایران نے اولاد پیدا کرنے کا ریکارڈ قائم کیا ہے۔ اُس کی سیکڑوں کینزوں اور متاع سے تین ہزار بیٹے بیٹیاں پیدا ہوئے۔ فتح علی شاہ کا پسندیدہ محل نگارستان تھا۔ اس میں سنگ مرمر کا نہایت خوبصورت حمام تھا جس میں ایک اونچی نرم سطح والی سرسروک (پھسلنے والی جگہ) بنائی گئی تھی جس کا پچھلا حصہ سطحِ آب سے ملا ہوا تھا۔ اس سرسروک سے پھسل کر فتح علی شاہ کی حسین کینزیں اُس کے بازوؤں میں آگرتی تھیں۔ اس پہلو سے صقلیہ کا بادشاہ ڈائیونیسس عجیب ذوق رکھتا تھا۔ وہ بہت سی فاختائیں پکڑوا کر اور اُن کے پر نچا کر ایک بند کمرے میں پھونڈ دیتا پھر اپنی برہنہ کینزوں کو حکم دیتا کہ اُنہیں پکڑیں۔ وہ اُن کے پیچھے بھاگتی پھرتیں اور بادشاہ اُنہیں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ یونان کے شہر ٹرنین میں رواج تھا کہ برہنہ کینزیں مہمانوں کو کھانا کھلاتی تھیں۔ مہمان اُن کے بالوں سے ٹونے کا کام لیتے تھے۔ ہارون الرشید کا وزیر جعفر برمکی باکرہ کینزوں کا رسیا تھا۔ ہر جمعے کو ایک باکرہ کینز اُس کی خلوت میں بھیجی جاتی تھی۔

کینزوں کی حفاظت پر خواجہ سرا (ہیجرے) مامور تھے جنہیں معلم، شیخ اور خادم بھی کہا جاتا تھا۔ مقابلہ ہیجرے فرانس سے درآمد کئے جاتے تھے جہاں لڑکوں کو تخت بنانے کے لئے یہودیوں نے کارخانے کھول رکھے تھے۔ وردوں کا کارخانہ ازمنہ وسطی میں رسولے زمانہ تھا۔ وینس، جینوا اور فلورنس کے شہروں میں غریب ماں باپ کے بچے خرید کر ہیجرے بنائے جاتے تھے اور اسلامی ممالک کو برآمد کئے جاتے تھے۔ خواجہ سرا نہایت سنگدل اور بے رحم ہوتے تھے اور کینزوں کی کڑی نگرانی کرتے تھے۔ معمولی سی لغزش پر بھی کینزوں کو عبرت ناک سزا دی جاتی تھی ایک دن شاہ عباس کبیر صفوی

نے سرور کے عالم میں اپنی تین محبوب کیزوں سے کہا کہ وہ اُس کے ساتھ شراب نوشی میں شریک ہوں۔ کیزوں نے معذرت کی کہ وہ زیارت کے سفر پر جانے والی ہیں۔ بادشاہ نے اُسی وقت یتیموں کو زندہ آگ کے الاؤ میں پھکوا دیا۔ غلاموں اور کیزوں کو ایک دوسرے سے عشق کرنے کی سخت ممانعت تھی۔ جاحظ نے اپنا چشم دید واقعہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

”ایک دن میں کشتی میں محمد بن ابراہیم کے ساتھ سامرا سے بغداد جا رہا تھا۔ ابھی ہم ساحل سے ٹھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ محمد بن ابراہیم نے حکم دیا کہ عرشے پر چڑھ لٹکا دیئے جائیں اور کیزیں ناچ گانا شروع کریں۔ ایک کیز نے قتارہ بجا کر اس مطلب کے شعر گائے۔

”میں اُن عشاق کے لئے رُح کی درخواست کرتی ہوں جو بے یار و مددگار ہیں  
انہیں کب تک ایک دوسرے سے جدا رکھا جائے گا اور کب تک چپ چاپ  
غم فراق برداشت کرتے رہیں گے۔“

گانا ختم ہوا تو ایک کیز نے مزاحاً پوچھا ”ان حالات میں عشاق کو کیا کرنا چاہیے؟“  
یہ سن کر گانے والی کیز نے اچانک دریا میں پھلانگ دیا۔ ایک نوجوان غلام نے جو  
اپنے آقا کے پیچھے کھڑا انگس رانی کر رہا تھا کیز کو دریا کی موجوں میں غلٹا دیکھا تو  
نپک کر آگے بڑھا، دریا میں کود گیا اور اپنی محبوبہ سے جا ملا۔ اس طرح عشاق  
کو وصلِ بدام حاصل ہو گیا۔“

سلاطین و امراء کی حرم سراؤں میں سیکڑوں کیزیں رہتی تھیں۔ ان میں سے اکثریت ایسی کیزوں  
کی ہوتی تھی جنہیں دو ایک بار خلوت میں بلا کر فراموش کر دیا جاتا تھا اور وہ اپنی بے مصرف زندگی  
کے تلخ ایام یاس و حرماں کی انتہا تاریکیوں میں کاٹ دیتی تھیں۔ خواجہ سرا اور قہرمانہ ان کی ایک ایک  
حرکت پر نگاہ رکھتی تھیں لیکن وہ اپنی آسودگی کی کوئی نہ کوئی راہ تلاش کر ہی لیتی تھیں میڈم کل برنیل  
محمد پاشا لکھتی ہیں کہ سلطان عبدالحمید کی کیز بہت بڑھو کوں سے راہ گیروں کو اشارے کر کے بلالیا

کرتی تھیں اور ان سے متع کرنے کے بعد انہیں قتل کر دیتی تھیں۔ سلیمان قافنی کا رویہ زیادہ حقیقت پسندانہ تھا۔ اُس کے حرم میں تین سو کنیزیں تھیں۔ جب حرم سرا میں سلطان کی آمد آمد ہوتی تو وہ ہارنگھا کر کے قطار میں کھڑی ہو جاتیں۔ سلطان چلتے چلتے کسی کنیز کے کندھے پر اپنا رومال ڈال دیتا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ آج کی رات تم میری خلوت میں بسر کرو گی۔ جو کنیز پچیس برس کی عمر تک اس رومال سے محروم رہتی تھی اُسے آزاد کر کے کسی امیر سے اُس کی شادی کر دی جاتی تھی۔ سلیمان قافنی کے ایک درباری ایاز پاشا کا حرم اتنا وسیع تھا کہ وہ کہا کرتا تھا کہ اُس کے یہاں بیس گہواروں میں ہمیشہ شیر نوار بچے موجود رہتے ہیں۔ اسمعیل قلی خان شہنشاہ اکبر کا ایک درباری تھا۔ وہ دربار جاتا وقت اپنی کنیزوں کے ازار بندوں پر مہریں کر جاتا تھا۔ آخر انہوں نے تنگ آ کر اُسے زہر دے کر مار ڈالا۔ عرب ممالک کی بہ نسبت ہندوستان میں لونڈی غلام بہت ارزاں تھے جیسا کہ ابن بطوطہ کے سفر نامے سے مفہوم ہوتا ہے۔ علاء الدین خلجی نے دوسری اجناس کی طرح لونڈی غلاموں کے نرخ مقرر کر دیئے تھے۔ گھر کا کام کاج کرنے والی باندی کی قیمت پانچ سے بارہ ٹنکے تھی جو لونڈی اپنے آقا کی خلوت میں بار پاتی اُسے بیس سے تیس ٹنکوں میں خریدا جاسکتا ہے۔ غلام ایک سے دو سو ٹنکوں میں بکتا تھا۔ خوبصورت اُمرد بیس تیس ٹنکوں میں مل جاتا تھا۔ کام کاج کرنے والے غلام کی قیمت دس سے پندرہ ٹنکے تھی۔ میر جمد، شالستہ خان، ابوالحسن تانا شاہ اور بازار ہار کی کنیزیں حسن و جمال کے لئے مشہور تھیں۔ یہ لوگ روم، چین، فرنگ وغیرہ سے خوبصورت کنیزیں خرید خرید کر حرم میں داخل کرتے تھے۔ شرر لکھنوی واجد علی شاہ کی معذرت خواہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

” معترضین نے اس بارے میں بادشاہ کی حالت پر غور نہیں کیا اس لئے کہ ممتنعیات کی کثرت تو ان کے اتفاقاً اور پابندی شرع کی دلیل تھی اور اتفاقاً بھی ایسا تھا کہ مولیٰ مساند میں بہت کم دیکھا گیا ہے تمام بادشاہان اسلام کی نسبت آپ سُنئے آئے ہیں کہ ان کے محل میں چند بیویوں کے ساتھ ہزاروں کنیزیں بھری ہوئی تھیں۔ بنی امیہ،

نبی عباس اور بنی فاطمہ خلفاء کے حرم خلافت کا یہی حال تھا۔ سلاطین آل عثمان کے محلوں کی یہی کیفیت تھی۔ شاہان مغلیہ کی حرم سراؤں کا یہی رنگ تھا اور اب پورہ برہہ فروشی اور جائز کنیزوں کی فراہمی کا سلسلہ سدود ہو گیا ہے مگر ہندوستان کے دیوان ریاست کے محل اور زنان خانے اسی طرح بے شمار عورتوں سے بھرے ہوئے ہیں۔

۱۹ویں صدی میں اہل مغرب نے برہہ فروشی کو خلافِ قانون قرار دیا لیکن بعض اسلامی ممالک میں برہہ فروشی کا کاروبار جاری رہا۔ بھر کے جلاب (برہہ فروش) نیوبیر اور حبشہ سے کم سن لڑکیاں خرید کر یا جبراً پکڑ کر لاتے اور شہروں میں فروخت کرتے رہے۔ ان میں بعض لڑکیوں کے ساتھ ایسا ہیمانہ سلوک کیا جاتا تھا کہ وہ دریائے نیل میں کود کر خودکشی کر لیتی تھیں۔ خلیج فارس کے کرد و چچی شیوخ آج بھی سفید غلامی کے سب سے بڑے سرپرست سمجھے جاتے ہیں۔

ہم نے طوالت کے خوف سے اپنی ہی تاریخ سے برہہ فروشی کی اکثر مثالیں دی ہیں۔ شاہی اور جاگیر داری عہد میں ہر کہیں غلاموں اور لونڈیوں کی حالت زار و زبوں تھی۔ صدیوں کی برہہ فروشی کے اثرات معاشرۃ النسانی پر نہایت ضرر رساں ہوئے۔

۱۔ عورت کا مقام پست تر ہو گیا اور وہ مرد کی ہوسناکی کا وسیلہ بن کر رہ گئی۔ خود عورت کے ذہن میں یہ خیال راسخ ہو گیا کہ وہ مرد کو بٹھانے اور بہلانے کا ایک کھلونا ہے اور اس کی زندگی کا واحد مقصد مرد کی ہوا و ہوس کی تسکین کرنا ہے۔ حرم سراؤں کی غیر فطرتی زندگی نے عورت کے کردار و سیرت کو مسخ کر کے رکھ دیا۔ اس کی دلچسپیاں تمام تر ہار، سنگھار، لباس کی آرائش و زیبائش اور زیوروں کی نمائش تک محدود ہو کر رہ گئیں کہ انہی سے مردوں کی توجہ کو جذب کیا جاسکتا تھا۔ عورت کی بیداری کی اس صدی میں بھی بعض عورتیں گڑیا کا یہ کردار ادا کرنے پر مقرر ہیں۔

۲۔ عورت کو پستی کے گڑھے میں گر کر مرد کے اپنے اخلاق بھی پست ہو گئے۔ اُس نے الا ماشاء اللہ اعلیٰ قدروں سے مرف نظر کر کے چنی چنی ہوس کی تسکین کو سب سے اعلیٰ قدر تسلیم کر لیا۔ جنس کا ضبط اُس کے اعصاب پر اس بُری طرح سوار ہو گیا کہ دن رات کی کاجھولی اور ہوس رانی نے اُس کی قوتِ اہلِ قہم

پیش رفت کو سلب کر لیا۔ شاہیت کے دور کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بردہ فروشی اقوام و مل کے سیاسی و عسکری تنزل کا ایک اہم سبب رہی ہے۔ حرم سراؤں میں کینزوں کی فراوانی اور شبانہ روز کی عیش و عشرت نے سلاہین و امراء کو دنیا و مافیہا سے غافل کر دیا اور وہ نامساعد حالات و حوادث کا سامنا کرنے کے قابل نہ رہے۔ بردہ فروشی اور منشیات کا چولہا دامن کا ساتھ دہا ہے۔ عرب عورت اور شراب کو الاطیان (دو اچھی چیزیں) کہا کرتے تھے یہی اطمینان اُن کی تباہی کا باعث ہوئیں۔

۲۷۔ مرد نے عورت کو عصمت و عفت کا پابند کر دیا لیکن خود آزادانہ ہوس رانی کرتا رہا۔ وہ خود سیکڑوں عورتوں سے تمتع کرتا تھا لیکن اُس کی حرم سرا میں کوئی محروم محبت لونڈی لغزش کر جاتی تو اُسے بے دریغ جان سے مار دیتا تھا۔ یہ صریح ظلم تھا۔ مرد کی یہ دروغی آج بھی باقی ہے۔ وہ اپنی جنسی بے راہ روی کے لئے ہر قسم کا جواز تلاش کرتا ہے لیکن عورت کے فطری تقاضوں کی تشفی پر قدغن لگا دیتا ہے۔ مرد اپنے آپ کو عفت سے مستثنیٰ کر کے عورت سے اس کی پابندی کی توقع کرتا رہا ہے۔

۲۸۔ جنسیات کے نقطہ نظر سے اہم بات یہ ہے کہ جنسی ملاپ کا مقصد مرد کی ایک طرفہ تسکین قرار پائی عورت محض ایک شے بن کر رہ گئی جو مرد کو جنسی حفظ کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔ مرد بھول گیا ہے کہ عورت کو بھی جنسی حفظ اندوزی کا اتنا ہی حق حاصل ہے جتنا کہ خود اُسے ہے جس مرد کی سیکڑوں بانڈیاں ہوں وہ ظاہراً اُن کی تشفی پر قادر نہیں ہو سکتا۔ محض اپنے حفظ کے لئے سیکڑوں عورتوں کو حرم سراؤں میں بند کر دینا فطرت، دیانت اور انصاف کے منافی تھا لیکن جاگیر دارانہ استحصالی معاشرے میں مقتدر طبقے سے عدل و انصاف کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔

۲۹۔ لونڈیوں اور غلاموں کو انسان ہی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ روس اور فرانس میں ۱۸ ویں صدی تک یہ دستور رہا کہ غسل خانوں میں غلام اور چاکر گیات کو نہلایا کرتے تھے۔ فرنیڈو مہرک کہتا ہے کہ ہندوستان میں انگریز افسروں کی میس غسل کرتے وقت اپنے چاکروں سے مدد یا کرتی تھیں گویا غلام اور چاکر ذی جس انسان نہیں تھے بلکہ کاٹھ کے پتے تھے۔

## جنس اور مذہب

ذریعہ انقلاب کے بعد ہر کہیں بار آوری کا منت پھیل گیا جس میں لنگ پوجا کو اہم مقام حاصل تھا۔ معاشرہ انسانی کی ابتدائی صورت، مادری تھی یعنی عورت کو سیادت حاصل تھی۔ اس زمانے میں لنگ اور یونی کو حیات و افزائش کی علامت سمجھا کر پوجتے تھے۔ مہرِ قدیم میں کوڑی کو مقدس مانتے تھے کیوں کہ وہ یونی کی شکل کی تھی چنانچہ اسے میں دین کا سکہ بھی بنایا گیا۔ پدری نظام معاشرہ میں مرد کو فوقیت حاصل ہو گئی۔ اس دور میں بھی آسمان، دھرتی، آفتاب، سیاروں اور چاند کی پرستش کے دوش بدوش لنگ اور یونی کی پوجا جاری رہی۔ قدما اپنے معدوں کے صحن میں کئی کئی سوٹ کے اونچے لنگ نصب کرتے تھے۔ لنگ کو سعد مان کر اس کے نقشے شتے جیسے سونے چاندی یا تانبے کے بنوا کر گلے میں لٹکاتے تھے یا بازوؤں پر باندھتے تھے تاکہ نظربد سے محفوظ رہیں۔ مہری لنگ کو حیات نو کا ضامن سمجھتے تھے اور اعزہ کی قبروں پر لنگھ۔ دستہ دار صلیب جو لنگ یونی کے اتصال کی علامت تھی۔ رکھتے تھے تاکہ مرد سے پھر سے زندہ ہو جائیں۔ کنج کل بھی کلیسیائے روم کے پرورد اپنے عزیزوں کی قبروں پر ایسی مقصد کے لئے صلیب نصب کرتے ہیں۔ ان کی صلیب مہری لنگھ سے ماخوذ ہے۔ یونان قدیم میں دائونیسیس اور ہرمس جیسے دیوتاؤں کے لنگ کو توالد و نکاح کا سبب مان کر پوجتے تھے۔ پرلے پس بار آوری کا دیوتا تھا جو کھیتوں اور باغوں کا محافظ تھا۔ اُس کے عجسے لنگ کی صورت میں کھیتوں اور باغوں میں نصب کرتے تھے تاکہ اُن کا پھل نظربد سے محفوظ رہے۔ اُس کے لنگ کے سرے پر انسانی چہرہ تراشا جاتا تھا۔ لامہور کے عجائب گھر میں ایک بہت بڑا سنگی لنگ رکھا ہے جس کے

اُسے یونانی زبان میں فیلس، ت میں پالا، پنجابی میں پھالا۔

لنگ یونی کا لغوی معنی ہے فاختہ۔ فاختن کل یونی کی سی ہے اس لئے یمن کی دیوی لکھامنت بھی بن گئی۔

برے پر انسانی شبیہ تراشی گئی ہے۔ اس وضع کا لنگ ظاہراً یونان سے گندھارا آیا تھا۔ روم میں فیسائٹس، ٹوٹوٹس، موٹوٹس اور لائبرٹیوٹاؤں کے لنگ کی پوجا کی جاتی تھی۔ عورتیں ہانڈھپن کے علاج کے لئے اس سے ہم کنار ہوتی تھیں اور ان پر پھول پتے چڑھا کر مرادیں مانگتی تھیں۔ امریکہ میں مایا اور پیرو کے باشندے بھی ذوق و شوق سے لنگ کی پوجا کرتے تھے۔

مہوڑ آدم کا اسطور عالمگیر ہے۔ اس میں سیدب دوشیزگی کی علامت تھی بعض اقوام میں دانہ گندم کا بھی ذکر آیا ہے جو یونی کی علامت تھی۔ سانپ اور شجر لنگ کی علامتیں تھیں۔ علم سے مراد جنسی ملاپ کا علم تھا۔ جتنے جتنا ہے کہ صابٹین کے بعدوں میں منہ اور گند لنگ اور یونی کی علامات تھیں اور محراب جس میں نہرہ دیوی کی مورتی رکھتے تھے یونی کی شکل کی بنائی جاتی تھی۔ اس کے خیال میں مذہبی رسوم کے برتن مرتبان، کھنکول وغیرہ بھی یونی کی علامتیں ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ہندو پرنام کرتے وقت جس انداز میں دونوں ہاتھ جوڑتے ہیں اس سے بھی تبرکات یونی کی شکل بنانا مقصود ہوتا ہے۔ جتنے کے بقول آج بھی گرجا گھروں میں محرابیں اور کھڑکیاں یونی کی شکل کی بنائی جاتی ہیں۔ وہ تالوت سکینہ کو بھی رحم کی علامت سمجھتا ہے جس میں دو پتھر اور ایک عصا رکھے جاتے تھے۔ بعض صحرائی اقوام میں مقدس درخت لنگ کی علامت بن گئے تھے۔ نجد میں بلیدۃ الذاکہ مقام پر ایک درخت تھا جس سے عورتیں حصول اولاد کے لئے ہمکنار ہوتی تھیں۔ محمد بن عبدالوہاب نے اسے کٹوا دیا تھا۔ بلوچی عورتیں اسی مقصد کے لئے شاہ و ماوا کے مزار کے درخت سے ہم کنار ہوتی تھیں۔

شہر ٹرائے کی کھدائی پر سطح زمین سے تیس فٹ نیچے لنگ یونی کے مجسمے دستیاب ہوئے تھے۔ مزیٹہ کے کھنڈوں سے بھی لنگ یونی کے مجسمے برآمد ہوئے ہیں۔ اسی او، جیمز کے خیال میں ہندوؤں کی لہ انگریزی کا لفظ FASCINATION اسی سے یادگار ہے، قدما، لنگ کو طبعی کشش کا پیکر مانتے تھے۔ لہ انگریزی کا لفظ LIBERTINE (اوباش) اسی سے مشتق ہے خیال یہ تھا کہ یہ دیوتا شرم و حیا سے بے نیاز ہوتا ہے۔

لہ سے بزرگ دانش چیزے عجیبے دو دانہ گندم آدم فریے۔

لہ قانون اسلام، جعفر شریف، SEX SYMBOLISM IN RELIGION

لنگ پوجا دراوڑوں سے مستعار ہے۔ ہندوستان واحد ملک ہے جس میں لنگ اور یونی کی پوجا آج بھی ذوق و شوق سے کی جا رہی ہے۔ ملک کے طول و عرض میں شیو لنگ کی پوجا کا رواج ہے شیو دراوڑوں کا بار آوری کا یوتا تھا جسے کالی اور کرشن کے ساتھ آریاؤں نے دراوڑوں سے مستعار لیا تھا۔ لنگ کو جس حلقے پر نصب کیا جاتا ہے اس سے یونی مراد ہے۔ شیو لنگ پر ہر روز تیل گرا کر اس کی پوجا کی جاتی ہے۔ لنگامت کا بانی بساوا تھا۔ اس کے پیرو سونے چاندی کے لنگ بنوا کر انہیں گلے میں لٹکاتے ہیں اور پیشانی پر لنگ یونی کی شکل کا تلمک لگاتے ہیں۔ انہیں لنگ دھاری اور شیو بھگت بھی کہا جاتا ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ کائنات پرش (توانائی) اور پرکرتی (ماہ) کے اتصال سے عالم وجود میں آئی ہے۔ مرد عورت کی مواصلت کو اس آفاقی اتصال کی ایک صورت مانتے ہیں۔ چھاندو گیار اُنشد میں جنسی مواصلت کو مقدس سمجھا گیا ہے۔ برہما دارنیک اُنشد میں ہے۔

”اپنی محبوبہ سے ہلکا ہو کر جس طرح مرد دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے اسی

طرح جو آتما برہم سے ہم آغوش ہوتی ہے وہ سب کچھ فراموش کر دیتی ہے۔“

کرشن گیتا میں کہتا ہے

”میں نبوں کام (نفسانی خواہش) جو خلق کرتا ہے۔“

گیتا ہی میں کرشن کہتا ہے ”یہ پرکرتی میری بچہ دانی ہے جس میں حمل قائم کرتا ہوں اور جس سے تمام موجودات پیدا ہوتے ہیں۔“ شکر اچار یہ نے ”دیوی کے منتر“ میں کہا ہے ”شیو پرکرتی سے واسل ہو کر ہی تخلیق کر سکتا ہے ورنہ وہ بے جان محض ہے۔“ اس قول میں تنزمت کا یہ عقیدہ بتاتا ہے کہ تخلیق و تکوین کے عمل میں نسوانی پہلو زیادہ اہم ہے۔ یاد رہے کہ تنزمت مہاتما کی پوجا پر مبنی ہے شیو مت کے پیرو لنگ کو شیو اور یونی کو شکتی کی علامت سمجھتے ہیں۔ شکت فرقتے کے پیرو لنگ پوجا کے ساتھ بھگ پوجا (فرخ کی پرستش) بھی کرتے ہیں۔ بولی کے تہوار پر جو دراوڑوں سے یادگار ہے یہ لوگ لنگ اور یونی کے جسے اُٹھا کر جلوس نکالتے ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ رام نے رامیشورم میں شیو لنگ نصب کر کے اس کی پوجا کی تھی۔ اس لنگ کو ہر روز گنگا جل سے غسل دیا جاتا ہے۔ اس پانی کو بامحہ عورتیں حصول اولاد کے لئے پیتی ہیں۔ کشمیر میں امر ناتھ ہندوؤں کا ایک بڑا تیرتھ ہے جہاں ہر سال ملک کے

دور دراز کے علاقوں سے یا تری دشوار گزار راستے طے کر کے آتے ہیں۔ اس مقام پر ایک غار ہے جس میں برف کی لاٹ نمودار ہوتی ہے اور ہر روز تھوڑی تھوڑی بڑھتی رہتی ہے یہاں تک کہ چاند کی ۱۵ دس رات کو دس گز لمبی ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد بتدیج گھٹنے لگتی ہے۔ ہندو اسے مہادیو کا لنگ سمجھ کر اس کی پوجا کرتے ہیں۔ ہندوؤں کی رسوم عبادت میں گندہ سورج گندہ، ہون گندہ کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ گندہ کا معنی ہے گرہا یا گنواں۔ گندہ یونی کی علامت ہے جو ہندوؤں کے یہاں پوجا کا لازمی جز بن گئی ہے۔

قدیم زمانے کے یہودی اشیرات (مقدس کھجے) اور نوک دار چٹانوں کی صورت میں لنگ کو پوجتے تھے۔ یہودیوں کے ہاں یہ دستور تھا کہ جب کسی شخص کو قول و قرار کرنا ہوتا تو وہ دوسرے آدمی کے خصیتین پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاتا تھا۔ ہندو آج بھی شیو کے پل ننڈی کے خصیتین پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاتے ہیں۔ یہودیوں کی روایات میں سانپ لنگ اور جنسی عیسان کی علامت تھا۔ دراوڑوں کی ناگ پوجا میں بھی ناگ کو لنگ کی علامت سمجھ کر پوجتے تھے۔ ہندوؤں کی ناگ پوجا انہیں سے ماخوذ ہے۔ آج کل بھی ناگ پنچمی کا تہوار ہر سال سادون کے مہینے میں منایا جاتا ہے۔ چین کے پھریرے پر اڑ دیا کا نشان بیسویں صدی کے اوائل تک موجود رہا ہے۔ لنگ پوجا کے آثار کلیسیائے روم میں بھی باقی ہیں۔ فرانس کے اصلاح یافتہ کلیسیا کے پیروؤں نے جنہیں ہیوگو نو کہتے تھے ایک دفعہ حملہ کر کے امبروم کا شہر فتح کر لیا جہاں راہب فاتاں کا مقدس لنگ نصب تھا۔ لوگ اس پر تیل اُنڈیل کر اور نرڑا لٹھا کر اُس سے مُرادیں مانگتے تھے جس سے اس کا رنگ سیاہی مائل سرخ ہو گیا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کسی راہب کا لنگ نہیں تھا بلکہ قدیم زمانے سے موجود تھا۔ جیسے مقامی لوگوں نے اپنا لیا تھا۔ ہیوگو نو نے اسے توڑ پھوڑ کر پھینک دیا۔

مادری نظام معاشرہ میں مل چلانے اور جنسی ملاپ کرنے کو یکساں شر اور خیال کرتے تھے جس سے لے آرائشِ علف، شیر علی انوس۔ لے یونانی زبان میں CYNTHIOS، جرمنی میں KUNDT، انگریزی میں KUNT، انگریزی زبان کا لفظ TESTES، (قول و قرار) اس سے مشتق ہے۔

TESTIMONY

یہ خیال پیدا ہوا کہ جنسی ملاپ سے زمین کی بار آوری کو تعویت ہوتی ہے۔ اس مقصد کے لئے فصلانہ تہوار منائے جاتے تھے جن پر جنسی ملاپ کی کھلی چھٹی دے دی جاتی تھی۔ اور سانس، وزن، جیومیٹر، امورا، دیوس پتر، آسمانی باپ کے مشیل تھے جو مینہ برسا کر دھرتی دیوی کو حاملہ کر دیتا تھا۔ اور اس کی کوکھ سے فصلیں اگتا تھا۔ رابرٹ برفالٹ نے طویل بحث کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ قدیم اقوام میں فصلانہ تہواروں پر کامل جنسی آدادی دی جاتی تھی تاکہ فصل کی برداشت زیادہ ہو۔ دیویوں کے ہاں فصل بونے کے موقع پر سیئر نیلا کا تہوار منایا جاتا تھا جس میں عورتیں لنگ کے بجائے اٹھا کر چلتی تھیں اور ناپتی ہوئی جلوس نکالتی تھیں۔ جلوس کے خاتمے پر اجتماعی رقص ہوتا تھا اور جنسی ملاپ کی کھلی چھٹی دے دی جاتی تھی۔ یونانیوں کے یہاں ڈائیسیس کے تہوار پر عورتیں مردوں کے دیوانہ وار ناپتے تھے۔ جنسی ملاپ کو پوجا کا لازمی جز سمجھا جاتا تھا۔ مصر قدیم میں آئیس دیوی نے گہوؤں اگانے کا راز دریافت کیا تھا۔ وہ زمین کی بار آوری کی علامت بھی تھی۔ اس کے پجاری چار برو کا صفیا کرتے تھے اور صبح و شام دلاؤیز لمن میں اس کی مناجات کرتے تھے۔ وہ زمانہ لباس پہنتے تھے اور اعضائے تناسل قطع کر کر دیوی کی بھینٹ کرتے تھے۔ خنزیر کرانے کی رسم اسی سے یادگار ہے۔ زمانے کے گزرنے کے ساتھ ذکر کو قطع کرانے کی بجائے غلاف حشفہ کاٹنے پر اکتفا کرنے لگے۔ یونان میں افرو دیسیس کا تہوار بڑی شان و شوکت سے منایا جاتا تھا۔ اس میں کسبیاں برہنہ ہو کر جلوس نکالتی تھیں۔ فلوریلیا کے تہوار پر کسبیاں برہنہ عام ناپتی تھیں اور متع کی دعوت دیتی تھیں۔ یہ سب کچھ زمین کی بار آوری کو تحریک دینے کے لئے کیا جاتا تھا۔ مرد و زمانہ سے یہ روایات قدیم مذاہب کی خفیہ رسوم میں باد پا گئیں۔ ہندوستان میں نام دھاری، چولی مارگی اور شاکت خفیہ مجالس میں لنگ اور یونی کی پوجا اور اجتماعی جنسی ملاپ کرتے تھے۔ دیانند کے الفاظ میں لے

”چولی مارگی بھیو چکر کے وقت تمام عورتوں کی چولیاں مٹی کے ایک برتن میں اکٹھی رکھ دیتے ہیں، جب شراب پی کر بدست ہو جاتے ہیں تو چولیاں پر ہاتھ مارتے

ہیں جس عورت کی چھلی ہاتھ آجائے خواہ وہ اپنی بہن یا بیٹی ہو اُس سے ساگم کرتے ہیں۔“

فیروز تعلق نے چولی مارگیوں کے استیصال کی کوشش کی تھی۔ وہ لکھتا ہے۔ لے

”ملاحظہ اور اہمیتوں کا ایک فرقہ تھا جو الحاد و زندقہ سے عوام کو گمراہ کرتا تھا۔ وہ رات کے وقت مقررہ جگہ پر جمع ہو جاتے اور ان میں اغیار و اجانب بھی شامل ہو جاتے۔ وہاں خوب شراب پی جاتی، اُن کا خیال تھا کہ یہ جزو عبادت ہے۔ وہیں اُن کی بیویاں، بیٹیاں، بہنیں، ماںیں بھی موجود ہوتیں۔ سب لوگ زمین بوس ہو جاتے اور پھر جس شخص کے ہاتھ جس عورت کی چولی آجاتی وہ اُس سے متمتع ہوتا تھا۔ میں نے اس فرقے کے سرداروں کے سرکاٹ دیئے اور باقی ماندہ کو جلا وطن یا قید کر دیا۔“

ابا دلوا لکھتا ہے کہ نام دھاریوں کی خفیہ مجالس میں تمام جاتیوں کے عورتیں مرد رات کے وقت مل بیٹھتے، شراب، ناٹھی، افیون وغیرہ منشیات برتنوں میں چُن کر رکھ دیئے جاتے۔ بھنے ہوئے گوشت کے چمچے ٹھانوں میں سجائے جاتے۔ پھر شراب کے ٹکے کے پاس ایک مرد اور ایک عورت کو برہنہ کر کے کھڑا کر دیا جاتا اور اُن کے ننگ اور یونی کی پوجا شیو اور شکتی سمجھ کر کی جاتی، اس کے بعد سب ایک ہی برتن سے شراب پینے لگتے اور گوشت کھاتے۔ نشہ طوع ہوتا تو عورتوں پر ہاتھ ڈالتے تھے اور ساری رات فسق و فجور میں بسر کرتے تھے۔ ان میں برہمن، شودر سمبھی شامل تھے۔ یہ لوگ کہتے تھے کہ اس رات کو ذات پات کی تیز آٹھ جاتی ہے۔ شیو بھگتوں کے گرد کسی چیلے کے ہاں قیام کریں تو مرد باہر چلے جاتے ہیں اور گرد و جی جوان عورتوں سے بلا تکلف فیض یاب ہوتے ہیں۔ لی بان گرات کے دیشنوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ لے

”جگت میں زیادہ تر فرقہ ویشٹوئل کا ہے جن کا مذہب عجیب قسم کا ہے یعنی یہ صرف پچیس تیس برہمن پجاریوں کی جو مہاراج کہلاتے ہیں کو راند پرستش کرتے ہیں۔ ان پجاریوں کی زندگی اور ان کے پوجنے والوں کی خوش اعتقادی کے متعلق ہم مسٹر ملا باری ایڈیٹر انڈین سیکسٹر بمبئی کی کتاب سے نقل کرتے ہیں۔

یہ پجاری جسے مہاراج کہتے ہیں ویشٹو اور کرشن کا جسمانی اوتار ہے اور کل خوش اعتقاد ویشٹو اپنے جسم اور روح اور عزت کو بھی جو ان سے وابستہ ہیں ان پر نثار کر دیتے ہیں۔ یہ مہاراج اپنے پوجنے والوں سے حسب ذیل فیس وصول کرتے ہیں۔ دور سے پرستش کے لئے ۵ روپے، جسم بھونے کے لئے ۲ روپے، ان کے پیر دھونے کے لئے ۲۵ روپے، ان کے پہلو میں بیٹھنے کے لئے ۱۰ روپے، ان کے نہلے ہوئے پانی یا میلے کپڑوں کی دھوون کے لئے ۱۹ روپے اور بالآخر ان کے ساتھ وصل کرنے کے لئے عورتیں ۱۰۰ سے ۷۰۰ روپے تک نذر کرتی ہیں۔“

یہی حال رادھا بلجی فرقے کا ہے۔ ہمارے ہاں کے پیران سالوس کو جنہیں اقبال نے ’کچے کے برہمن‘ کہا ہے خوش کرنے کے لئے عقیدت مند عورتیں اپنا تن، من، دھن نثار کر دیتی ہیں۔

شکستی پوجا کے فرقے کے گوسائیں کو بھی جنسی ملاپ کی آزادی ہے۔ گوسائیں ترلوچن کا ذکر عمن فانی نے دبستان مذاہب میں کیا ہے کشمیر کے صوبہ دار ظفر خان نے تبت پر فوج کشی کا ارادہ کیا تو

”ظفر خاں نے اپنے بعض مقربوں کی وسالت سے جو گوسائیں سے بھی تعلق رکھتے تھے گوسائیں سے درخواست کی کہ وہ اُس کی فتح تبت کے لئے دُعا کرے گوسائیں ترلوچن نے کہا میرے پاس چند سیم کیسیاں بھیج دو جو ہر وقت میرے پاس رہیں گیں کہ ہمارے مسلک میں کبھیوں سے اختلاط کرنا دوسری عورتوں سے خلوت کرنے کی بہ نسبت زیادہ مستحسن ہے اور شراب اور دوسرے منشیات کی بھی فراہمی ضروری ہے۔

ظفر خان نے گوسائیں کی فرائض کی تعمیل کی۔

دنیا اسلام میں بعض باطنیہ فرقے آزادانہ جنسی ملاپ کے قائل تھے۔ یہ لوگ مزدک کی تعلیمات سے متاثر ہوئے تھے۔ مزدک نے کہا کہ عورت اور مرد مالِ فتنہ و فساد کے موجب ہیں۔ اسن قائم کرنے کے لئے فردی ہے کہ انہیں ہر خاص و عام پر مباح کر دیا جائے، اُمراء سے دولت چھین کر غریبوں میں بانٹ دی جائے اور جن کے پاس ایک سے زیادہ بیویاں اور لونڈیاں ہوں وہ اُن سے لے کر ایسے اشخاص میں تقسیم کر دی جائیں جن کے پاس کوئی عورت نہیں ہے۔ بابک بن عبد اللہ کے پیروؤں کو خرمیہ کہتے تھے۔ یہ لوگ سال بھر میں ایک رات مقررہ کر لیتے۔ جوان عورتیں مرد کثیر تعداد میں ایک بڑے کمرے میں جمع ہو جاتے، پھر روشنی گل کر دی جاتی اور مرد شکار! شکار!! لکارتے ہوئے عورتوں پر پل پڑتے۔ جس کسی کے ہاتھ جو عورت آجاتی وہ اُس سے مقاربت کرتا تھا محمد بن علی شلمغانی نے اعلان کیا کہ عورت ہر شخص پر طیب حلال ہے یہاں تک کہ ہر شخص عورت سے بھی احتلاظ کر سکتا ہے۔ شرم لکھنوی کے الفاظ میں لے

”شلمغانی نے کہا اب جو تکلیف اس زمانے کے مناسب حال ہے یہ ہے کہ لوگوں کو اپنی عورتوں کو ہر شخص کے لئے حلال کر دینے کی تکلیف دی جائے تاکہ لوگ دوسروں کو اپنی عورتوں سے ہم بستر ہوتے دیکھیں اور عقہ نہ آئے چنانچہ عورتیں مطلقاً ہر شخص کے لئے طیب حلال ہیں، انسان اپنے ذوی الارحام اور عورتیں ایک کے ساتھ چاہے تو مقاربت کر سکتا ہے کوئی مضائقہ نہیں باپ اپنے بیٹے کی عورت سے تعلق پیدا کر سکتا ہے بلکہ دین حق والوں (شرعیات شلمغانی کے پیروں) کو چاہیے کہ ہر شخص جو دوسروں سے افضل ہو اپنے سے کم درجے والوں کی عورتوں سے حسبہ لبتہ مقاربت کرے تاکہ اُن میں نور کو پہنچا دے اور جو کوئی انکار کرے گا اُس کا جہنم بہ پابندی قوانین تناسخ آنے والے بعد کے دہ میں عورت کے سیکر میں ہوگا۔“

قدیم اقوام میں مقدس جگہ کی ادارہ ہر کہیں موجود تھا۔ دھرتی دیویوں کے معبدوں میں سکڑوں منتخب حسین لڑکیاں بھینٹ کی جاتی تھیں۔ پجاری اور یاتری دیوی کے نام پر پانڈی کے بکے دے کر اُن سے تمغے کرتے تھے۔ آئس، عشتار، افزوداسی، اناہتا وغیرہ کے معبدوں کے صحن میں اُن رات مقدس عصمت فروشی کا کاروبار جاری رہتا تھا۔ اس کی تہ میں یہ عقیدہ کارفرما تھا کہ مندر محل میں جنسی ملاپ کرنے سے زمین کی بار آوری بھل و برقرار ہو جاتی ہے اور فصلیں باخراہ آگتی ہیں۔ ہندوستان میں بعض اوقات بے رحم اور سفاک پروہت سات سات آٹھ آٹھ برس کی دیوداسیوں کو اپنے تصرف میں لاتے تھے۔ بس گیتھیرن میو نے ایسے کئی ایسے قلم بند کئے ہیں۔ اُن کے بقول بعض لڑکیاں اپنی ہم جویوں کا دردناک مشرودیکھ کر مندروں سے بھاگ جاتی تھیں اور انگریزوں کے ہاں پناہ لیتی تھیں۔ بس میو نے ایک آٹھ سالہ بچی کا المناک واقعہ بیان کیا ہے جسے ایک درندہ صفت برہمن نے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا تھا۔ اُسی رات کو مندر کے درو دیوار اُس مظلومہ کی چھجوں سے گونجتے رہے لیکن وہ عالم پروہت کے چنگل سے نجات نہ پاسکی۔ جنوبی ہند کے بعض مندروں میں آج بھی دیوداسیاں موجود ہیں اور مذہب کے نام پر یہ ناپاک کاروبار جاری ہے۔

کہا جاتا ہے کہ انسان نے اپنے معبود اپنی ہی ذات کے نمونے پر خلق کئے تھے چنانچہ قدما کی جنسی بے راہ روی کے آثار اُن کے دیوتاؤں اور دیویوں کے احوال میں بھی ملتے ہیں۔ دیوتا اور دیویاں، گندھرو اور اپسرائیں آپس میں معاشرت کرتے تھے اور بعض اوقات انسانوں کے عشق میں بھی مبتلا ہو جاتے تھے۔ یونان کے ایک دیوتا کروئس نے اپنی بہن ریا سے اختلاط کیا جس سے سالی سلی پیدا ہوئی جو بعد میں تمام دیوتاؤں کی ماما قرار پائی۔ مصر کے دیوتا اوسائرس نے اپنی بہن آئس سے نکاح کیا، کوئن صبح و شام گویوں کے تعاقب میں سرگرم رہتا تھا۔ مہا بھارت میں لکھا ہے ”ایک دن ایک رشی کی کنواری لڑکی نے سورج دیوتا کو بلانے کا متر پڑھا، وہ ایک جوان خوش رو کی شکل میں آگیا اور کہا تم نے مجھے کیوں تکلیف دی لڑکی نے کہا میں نے

محض آزمائش کے لئے منتر پڑھا تھا۔ اُس نے کہا اب تو میں آگیا ہوں اور اپنی یادگار پھوڑ جاؤں گا۔ لڑکی جھجکی اور کہا دیوتا میں بدنام ہو جاؤں گی۔ دیوتا نے کہا ”نازنین! ڈرتی کیوں ہو اس عمل کے رہ جانے سے تیری بکارت زائل نہ ہو پائے گی۔“ اس عود سے کرن پیدا ہوا جو پانڈوؤں کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا اور یہ لڑکی پانچوں پانڈوؤں کی ماں بنتی تھی۔“

سندھیا برہما دیوتا کی بیٹی تھی۔ برہمانے اُس کی عصمت دری کرنا چاہی تو شیو دیوتا نے اسے بچا لیا۔ اندر دیوتا نے گوتم رشی کی اہلیسے دھوکے سے صحبت کی رشی نے بددعا دی جس سے اندر کے بدن پر ہزار نشان جام مخصوص عورت کے نمودار ہو گئے۔ صنمیت یونان میں افرو دانتی مَن و عشق کی دیوی تھی۔ اُسے لنگڑے، میضے سُس سے بیاہ دیا گیا لیکن وہ دیوتاؤں اور انسانوں سے معاشرے کیا کرتی تھی۔ ایریز، برمس، پوزی دوں، ڈائیسیس، انکی سس، ادونس اُس کے عشاق تھے۔ یونانیوں کا خداوند خدا دیس ہر وقت نئی حسینہ کی تلاش میں سرگرداں رہتا تھا۔ ایک دن وہ فیثی شہزادی یوروپا کو جب کہ وہ پھول چن رہی تھی بھگا کر لے گیا۔ یورپ کا نام اسی شہزادی سے یادگار ہے۔ یونانی ایک عجیب و غریب حیوان نما انسان کے وجود کے قائل تھے جس کا دھڑ بکرے کا اور چہرہ انسان کا تھا۔ اُسے ساٹر کہتے تھے۔ یہ ساٹر نہایت مغلوب الشہوت تھے اور ہر وقت جنگل کی دیویوں کے پیچھے بھاگتے پھرتے تھے۔ ہندوؤں کے اندر لوک میں اپسراؤں کا ذکر آیا ہے جو حسین نوخیز لڑکیاں ہیں اور دیوتاؤں اور گندھروؤں کا دل بہلاتی ہیں۔ کبھی کبھار کسی تپسوی کو بہکانے اور دیوتاؤں کو اُس کی نشستی سے بچانے کے لئے انہیں زمین پر بھیج دیا جاتا ہے۔ رمبھا اور اُردوسی مشہور اپسراؤں تھیں۔ عیسائیت کی اشاعت سے مغرب کی بت پرست اقوام کی جنسی آزادہ روی کا خاتمہ ہو گیا۔ قیصر قسطنطین نے ۳۲۵ء میں مقدس عصمت فروشی کا استیصال کر دیا اور وہ تمام مہذبہ سمار کر دیے جہاں مقدس کسبیاں بٹھاکرتی تھیں۔ اُس نے نکاح کے تقدس کو بحال کیا اور عصمت و عفت کی اہمیت

لے ہندو کلاسیکل ڈکشنری، دیوی سہائے

واضح کی۔ ولی امبروس نے کہا ہے کہ محض اسی بنا پر کہ عیسائیت نے عصمت و عفت کا قصہ بحال کیا اُسے الہامی مذہب سمجھا جاسکتا ہے۔ جناب عیسیٰ نے ساری عمر تجرد کی حالت میں گزار دی تھی اور وہ جنسی ملاپ کو مجبوری کا امر سمجھتے تھے۔ مٹی کی انجیل میں لکھا ہے۔

”شاگردوں نے اُس سے کہا کہ اگر مرد کا بیوی کے ساتھ ایسا ہی حال ہے تو یہ کتنا ہی اچھا نہیں۔ اُس نے اُن سے کہا کہ سب اس بات کو قبول نہیں کر سکتے مگر وہی جن کو یہ قدرت دی گئی ہے کیوں کہ بعض خوبے (بہترے) ایسے ہیں جو ماں کے پیٹ ہی سے ایسے پیدا ہوئے اور بعض خوبے ایسے ہیں جن کو آدمیوں نے خوب بنایا اور بعض خوبے ایسے ہیں جنہوں نے آسمان کی باد شاہی کے لئے اپنے آپ کو خوب بنایا۔ جو قبول کر سکتا ہے وہ قبول کر لے۔“

پوپ گریگوری ہفتم نے تمام پادریوں کو مجبور رہنے کا حکم دیا اور راہبات پر بھی یہی پابندی عائد کر دی نکاح پر یہ پابندی نہایت غیر فطری اور منفرت رسال تھی۔ جوان پادری اور نوجوان کنواریاں خلفاءوں میں مل جل کر رہتے تھے۔ ہر وقت کے میل ملاپ سے قدرتا اُن کی جنسی خواہش بزرگ اُٹھتی اور وہ ہوا دھوس کی رو میں بے اختیار بہ جاتے چنانچہ زمانے کے گزرنے کے ساتھ خانقاہیں فق و فجور کے مرکز بن گئیں۔ پادری بر ملا داشتائیں رکھتے تھے اور اپنے حرامی بچوں کی پرورش کرتے تھے۔ اس پر ایسا کس نے جل کر لکھا کہ پادریوں کو زنا کرنے کی اجازت ہے لیکن اُن کے لئے نکاح کرنا ممنوع ہے۔ وہ داشتائوں سے بھی بہلائیں تو پکے عیسائی ہیں لیکن نکاح کریں تو مردود و عاصی سمجھے جاتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ راہبوں اور راہبات کے اقامت خانے اور قبہ خانے میں کچھ بھی فرق نہیں ہے۔ نو تھر نے پادریوں کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ لوگ دوسروں کی کمائی پر گھٹے اڑاتے ہیں اور فق و فجور میں غرق رہتے ہیں۔ پاپائے روم کے حرامی بیٹے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے تھے۔ ایک انگریز عورت جو ان کو بھی پوپ کا اعلیٰ عہدہ تفویض ہوا۔ اُسے پوپ جو نا کہتے تھے اور وہ ۱۸۵۵ء میں پوپ یوہانم کی موت کے بعد پوپ بنی تھی۔ ایک اتوار کو مذہبی جلوس کے دوران میں پوپ جو نا نے عین

سربازانہ بچہ جن دیا جس پر اُسے قید کر دیا گیا۔ پوپ کے شہر اوگنوں میں جہاں اُسے جلا وطن کیا گیا تھا، مذہبی پیشواؤں نے ایک قحبہ خانہ قائم کیا جس کی سرپرست نیپلز کی ملکہ تھی کبھیوں کے لئے ضروری تھا کہ وہ تمام عبادات میں باقاعدگی سے حصہ لیں۔ ان کبھیوں کے ساتھ خلوت میں صرف راسخ العقیدہ عیسائی ہی جا سکتے تھے، یہودیوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ یہ تجربہ اس قدر منفعت بخش ثابت ہوا کہ بعد میں پوپ جوہس دوم نے روم میں بھی اس نوع کا ایک قحبہ خانہ کھلوا دیا۔ پادری خود قحبہ خانے کے منظم تھے۔ مشہور عالم لٹریچر منر کے متعلق مشہور تھا کہ اُس کے یہاں اتنی ہی تعداد میں کبیاں تھیں جتنی کہ کتابیں۔ احتساب کلیسیا والے ان کبھیوں سے تعرض نہیں کرتے تھے جو قحبہ خانوں میں پیشہ کرتی تھیں بلکہ ان عورتوں کو پکڑتے تھے جو چوری پھیسے یہ کاروبار کرتی تھیں۔ ان پر جادوگرئی کا الزام لگا کر انہیں آگ میں بھونک دیا جاتا تھا۔ کہتے تھے کہ یہ جادوگریاں شیطان سے ہم کنار ہوتی ہیں جب کہ عام کبیاں انسانوں کے پاس جاتی ہیں۔ مذہبی سنگیت مندلیوں میں گانے والے لڑکوں کی آواز کی لطافت اور شیرینی کو برقرار رکھنے کے لئے انہیں آختہ کرا دیتے تھے۔ اس مقصد کے لئے پاپائے روم ہر سال دو ہزار کم سن لڑکوں کو بیڑے بناتے تھے۔ پادری ان لڑکوں کو بھی اپنے تصرف میں لاتے تھے۔ ان حقائق کے پیش نظر برٹنڈرسل نے کہا ہے کہ عیسائیوں کے اخلاق قدیم بت پرستوں کے اخلاق سے بھی پست تر ہو گئے۔ ان کے الفاظ ہیں۔

”وحشیوں اور عیسائیوں کی فتح کے ساتھ مرد عورت کے تعلقات بربریت کی عمیق

تریں پستیوں میں جا گرے جن کا دُنیا سے قدیم میں صدیوں تک کوئی جواب نہیں ملتا۔ آج کل میں برائی یقیناً موجود تھی لیکن بربریت نہیں تھی۔ تاریک صدیوں میں مذہب اور بربریت کے امتزاج سے زندگی کا جنسی پہلو پست و زلوں ہو گیا۔ منکوہ عورتوں کے حقوق صفر کے برابر تھے، مرد کے حقوق و فخر پر شادی کے حلقے سے باہر کوئی پابندی نہیں تھی۔ مرد کی حیوانیت کو کھل کھیلنے کی عام اجازت تھی۔ ہر کہیں بدکاری کا دور دورہ تھا۔ لٹریچر اپنی عیٹوں سے منہ کالا کرتے تھے۔

آج لُٹپُٹ قرب و جوار میں اپنے لونڈوں کو اعلیٰ مذہبی عہدے تفویض کرتے تھے۔“  
لیکی تاریخ اخلاق یورپ میں لکھتا ہے۔

”یہ امر باعث حیرت نہیں ہے کہ اپنے مذہبی عہد و پیمان کو توڑنے کے بعد پادری ایسی زندگی گزارنے لگے جو عادی گناہ کی زندگی تھی۔ وہ فسق و فجور میں عام دنیا داروں سے بھی بازی لے گئے۔ جس اخلاقی پستی کی ایسی اکاؤنٹاں پر زور نہیں دینا چاہیے جیسے پوپ جان XXIII کی مثال جس پر دوسرے جرائم کے علاوہ زنا اور اباحت نسوان کا الزام بھی لگایا گیا تھا یا کنٹر بری میں ولی آگسٹائن کے منتخب امیٹ کی مثال جس کے متعلق تفتیش پر معلوم ہوا کہ صرف ایک ہی گاؤں میں اُس کے سترہ حرامی بچے تھے یا مہری سوم لشر کی مثال جسے ۱۲۴۴ء میں اپنے عہدے سے ہٹا دیا گیا کیوں کہ اُس کے ۶۵ ناجائز بچے تھے لیکن کلیسا کے اہل قلم اور کلیسائی مجالس کی شہادت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جس میں داشتائیں رکھنے سے کہیں زیادہ بھینانگ معاصی کا ثبوت ملتا ہے..... ازمنہ وسطی کے اہل قلم نے تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ رامبات کے اقامت خانے قبہ خانے بن گئے تھے اور اُن کی

چار دیواری میں سیکڑوں حرامی بچوں کو جان سے مار دیا جاتا تھا۔ پادریوں میں نحر مات کے ساتھ معاشرے کرنے کا رواج عام تھا جس کے باعث بار بار ایسے احکام جاری کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی کہ پادریوں کو اپنی ماؤں بہنوں کے ساتھ بل کر نہیں رہنا چاہیے۔ مدد میرٹ جس کے استیصال کو عیسائیت کی ایک نمایاں خدمت سمجھا جاتا تھا اُڑا بہوں کے یہاں باقی و برقرار تھی۔ اصلاح کلیسا کی تحریک سے کچھ عرصہ پیشتر یہ شکایات زور پکڑ گئی تھیں کہ اعتراف گاہوں کو بکری کے اڈے بنا دیا گیا تھا۔“

چامر، رے بے، والٹر، دساد، مولیر وغیرہ نے پادریوں کی ریاکاری اور ہوس ناک کی پرزے

بڑی بے رحمی سے چاک کئے ہیں۔ شہزادی مارگریٹ دِنوَار نے لکھا کہ پادری روپے پیسے کو ہاتھ  
 تک نہیں لگاتے لیکن عورتوں کی داین ٹوٹنے میں کوئی ہاک محسوس نہیں کرتے۔ جو عورتیں اعتراف گناہ  
 کے لئے گر جا کر جاتی تھیں وہ اکثر بیشتر پادریوں کی ہوسناکی کی شکار ہو جاتی تھیں۔ جب صلیبی  
 سُو داؤں کے لشکر ارض مقدس کو روانہ ہوئے تو ہزاروں کسبیاں اُن میں شامل ہو گئیں۔ پادری اُن  
 کے اس مذہبی جذبے کو قدس کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ پادریوں کی ریاکاری ہمہ گیر صورت اختیار کر  
 گئی۔ ہسپانیہ کے باشندے مذہبی جوش و خروش کے لئے مشہور ہیں لیکن اُن کی ریاکاری اور ظاہر و باطن  
 بھی ضرب امتل ہے۔ کسٹوا لکھتا ہے کہ ہسپانوی عورت یا کبھی اپنے کسی آشنا سے ہمکنار ہونے  
 سے پہلے مرم عذرا یا یسوع مسیح کی تصویر پر چاند ڈال دیتی ہے۔ ایک کبھی کے ہاں سبت (اتوار)  
 کے دن اس کا آٹا آیا اور کپڑے اتارتے ہوئے سیٹی بجانے لگا۔ کبھی نے غضبناک ہو کر اسے ھٹکا  
 دیا اور کہا کہ میں ایک ایسے شخص کے ساتھ خلوت میں نہیں جاؤں گی جو سبت کے مقدس دن کی  
 توہین سیٹی بجا کر کرتا ہے۔ یہی حال برہمنوں کا تھا وہ دیوداسیوں سے بلا تکلف قطع کرتے تھے اور  
 اسے اپنا حق جانتے تھے۔ وہ کم بن دیوداسیوں سے کھلم کھلا جنسی ملاپ کرتے تھے۔ پنڈت و اتسیان  
 نے کام شامتر بڑھاپے میں لکھی تھی جب وہ سنیاں کی حالت میں بنارس میں مقیم تھا اور سدا ہی  
 اور گیان دھیان میں غرق رہتا تھا۔ اس پر بھی اپنی کتاب میں غیر عورتوں کو پھانسنے کی ترکیبیں لکھی  
 ہیں مثلاً کہتا ہے کہ راجہ کا دل کسی حسینہ پر آجائے تو وہ اُس کے شوہر کو غداری اور جاسوسی کے  
 الزام میں قید کر کے اُس عورت کو اپنے تصرف میں لاسکتا ہے۔ تیورنیر اپنے سفر نامے میں لکھتا  
 ہے کہ کھمبایت کے نواح میں ایک گاؤں تھا جس کے مندر پر بوڑھی نالکائیں نو عمر لڑکیوں کو فرو  
 کر بیٹھ کر بیٹھتی تھیں۔ اُس چڑھاوے کو نیکی سمجھا جاتا تھا۔ ابادلو کے بقول تیرہ پتی کے مند میں  
 بانجھ پن کے علاج کے لئے عہد میں شب باش ہوتی تھیں۔ صبح سویرے وہ پروہت سے گذشتہ  
 شب کا ماجرا کہہ سناتیں تو وہ کہتا ”دھنبا د! تو کتنی بھاگو ان ہے دیوتا خود تیرے پاس آیا تھا۔“

ایک صبح راجہ جے سنگھ کی رانی بنارس کے بڑے مندر میں پوجا کے لئے گئی۔ وہاں کے ہوس پرست اور نڈر پروہت نے جبراً اُس کی عصمت دری کی۔ رانی نے واپس آکر راجہ سے اس کا ذکر کیا جسے سنگھ نے اورنگ زیب عالمگیر سے شکایت کی۔ شہنشاہ نے اس قیفے کو جسے سنگھ ہی کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔ راجہ غضبناک تو تھا ہی اُس نے مندر کو منہدم کروا دیا اور وہاں کے تمام پروہتوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ہمارے ہاں کے فارسی اور اردو شعراء نے مشائخ کی ہوس پرستی کا خاکہ اڑایا ہے۔ تصوف تنزل پذیر ہو گیا تو خالقا میں فسق و فجور کا مرکز بن گئے۔ مشائخ عشق مجازی کے نام پر مردوں سے معاشقہ کرنے لگے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ سدویت کو علت المشائخ کہا جانے لگا۔ مولانا روم نے اپنی مثنوی میں اس نوع کے ریاکار اور نفس پرست مشائخ پر جا بجا بھرپور طنز کیا ہے۔ ملا عبدالغلام نے لکھا ہے کہ ایک دن اُس نے ایک درگاہ میں ایک معشوق سے منہ کالا کیا۔ ملا کی بد قسمتی سے معشوق کے عزیزوں کو اس بات کی خبر ہو گئی۔ وہ تلواریں سونت کر جائے واردات پر پہنچ گئے اور ملا کو شدید زخمی کر دیا۔ ملا اپنی اس قبیح حرکت کے جواز میں کہتا ہے کہ انسان نے کچا دودھ پیا ہے اس لئے اُس سے لغزش ہو ہی جاتی ہے۔ ملا کی ریاکاری ملاحظہ ہو کہ وہ دوسروں کو معمولی لغزشوں پر بھی سخت سُست کہتا ہے۔

ازلی گناہ کا تصور پال ولی نے پیش کیا تھا۔ اُس کا استدلال یہ تھا کہ آدم کے گناہ کے ساتھ ہی اُس کی تمام اولاد گناہ میں ملوث ہو گئی ہے اس لئے مسیح مہنجی کی شفاعت ہی انسان کی نجات کا باعث ہو سکتی ہے۔ اُس نے جنسی ملاپ جیسے فطری عمل کو سراسر ناپاک قرار دیا ہے۔ کہتا ہے "جن کی بیویاں ہیں وہ ایسے رہیں گویا اُن کی کوئی بیویاں نہیں ہیں۔"

چنانچہ عیسائیوں کے ایک فرقے ابی لائٹ کے مرد نعلی مٹی لڑکیوں سے اور عورتیں خود سال بچوں سے نکاح کرتی تھیں تاکہ جنسی ملاپ سے بچ جائیں۔ آگسٹائن ولی نے ازلی گناہ کی تشریح کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ بنارس کی چار چیزیں خطرناک ہیں ۱۔ رائے، سائڈ، میٹھی، ہنسی ۲۔ ان سے بچو جو سوسائٹی

ہوئے کہا کہ آدم کا گناہ ہمیں ورثے میں ملا ہے اور ہم سب آدم کے گناہ کے ذمہ دار ہیں۔ اس لئے  
 یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ جنسی خواہش فی نفسہ مذموم اور شر آمیز ہے اور اسے کُل دینا النیب ہے۔ اس منفی  
 اور سلبی عقیدے نے لوگوں کو حُسن و جمال اور دنیا کی تمام رعنائیوں اور دلچسپیوں سے جو جنسی خواہش سے  
 وابستہ ہیں مرف نظر کرنے کی دعوت دی اور انسان کو افسردگی اور یاسیت کے حوالے کر دیا۔ یاد رہے  
 کہ آگسٹائن ابتدائے عمر میں مانی کا پیر وہ چکا تھا اور مانی بُدھ سے متاثر تھا۔ بُدھ نے کہا تھا  
 کہ بچے پیدا کرنا ظلم ہے کیوں کہ وہ پیدا ہوتے ہی جنم چکر میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور دُکھ بھوگتے  
 ہیں چنانچہ مانی نے بھی جنس کو تمام آلام و مصائب کا سبب قرار دیا اور اپنے پیروؤں کو بُدھ کی  
 طرح مجرور بننے کی تلقین کی۔ آگسٹائن نے اذلی گناہ کو جنسی ملاپ سے وابستہ کر دیا اور کہا کہ  
 جنسی ملاپ سے اذلی گناہ بچے میں سرایت کر جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مرد کا عورت سے جنسی  
 ملاپ — منکوحہ یا غیر منکوحہ سے — گناہ ہے۔ پوپ گریگوری نے اس پر صاف کیا اور یہ عقیدہ  
 کیسیائے روم کے شعائر میں داخل ہو گیا۔ مسیحی زہاد عورت کو شیطان کا آلہ کار سمجھنے لگے اور  
 اُس کی ترغیب و کشش سے بچنے کے لئے صومروں اور پہاڑوں کا رخ کیا۔ اُن کے خیال میں عورت  
 غول بیابانی ہے جو صداقت کی جستجو کرنے والوں کو راہِ راست سے ہٹکا دیتی ہے۔ زمانے کے  
 گزرنے کے ساتھ یہ عقیدہ عیسائیوں کے مزاج عقلی میں نفوذ کر گیا چنانچہ آج جنسی آزادی کے  
 باوجود گناہ کی یہ اُلجھن عیسائیوں کو پریشان کر رہی ہے۔ بہر کیف آگسٹائن کے خیالات کی  
 اشاعت سے لوگ یہ سمجھنے لگے کہ جنسی ملاپ کو ترک کر دینے سے انسان اس دنیا میں مسرت  
 اور آخرت میں نجات کو پالیتا ہے۔ جنسی خواہش کی قبر مانی سے بچنے کے لئے کئی راہبوں نے اعصاب  
 تناسل قطع کر دیئے۔ اور انجن نے اپنے آپ کو آختہ کر لیا۔ راہب ایلارڈ اور راہبہ ہیلو سے کی  
 مثل ہمارے سامنے ہے۔ وہ ایک دوسرے سے دلبانہ عشق کرتے تھے۔ اُن کے عشقیہ خطوط شائع  
 ہو چکے ہیں اور دُنیا نے ادب کا قیمتی سرمایہ سمجھے جاتے ہیں۔ ایلارڈ ایک مدت تک اپنی حسین  
 محبوبہ ہیلو سے تمتع کرتا رہا اور بقول خود اس دوران میں اُس نے ہوس رانی کا کوئی پہلو نہ چھوڑا۔

آخر احساسِ گناہ کی شدت اور پشیمانی کے عالم میں اپنے اعضاءے تناسل قطع کرادیے اور یوں اس گناہ کا کفارہ ادا کیا۔ دورِ جدید میں شوہنہائے مانوی تھا۔ اُس کے خیال میں شرکائے کائنات کا مایہ غیر ہے۔ اُس نے جنسی ملاپ کو جرم قرار دیا اور کہا کہ جنسی ملاپ کے بعد جو افسردگی ہم سب محسوس کرتے ہیں وہ ارتکابِ جرم کے بعد کا احساسِ ندامت ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کے تمام دکھ درد کا ایک ہی مداوا ہے اور وہ یہ ہے کہ جنسی ملاپ کو ترک کر کے نسلِ انسانی کا خاتمہ کر دیا جائے۔

فرانسس دلی کے پیروؤں نے گناہ کا ایک نیا فلسفہ پیش کیا جس کا مشہور ترجمان روس کا ایک راہب راسپوٹین تھا۔ راسپوٹین نے پہلی عالمگیر جنگ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ وہ زارینہ نکس کے دل و دماغ پر پوری طرح حاوی تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ جرمنوں کا جاسوس ہے۔ وہ گناہ کے راستے نجات کی تبلیغ کرتا تھا۔ اُس کے خیال میں جو لوگ زہد و اتقا کی زندگی بسر کرتے ہیں وہ عام انسانوں سے بالاتر ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُس کا استدلال یہ تھا کہ انسان کا تکبر اُس کی نجات کے راستے میں حائل ہوتا ہے۔ تکبر پر احساسِ ندامت ہی سے جو ارتکابِ گناہ کے بعد لاحق ہوتا ہے قابو پایا جاسکتا ہے۔ گناہ عاجزی اور انکسار سکھاتا ہے جو نجات کے لئے ضروری ہے۔ خداوند کے حضور نادم ہونے سے اُس کی رحمت کو تحریک ہوتی ہے اور گناہ کے بغیر ندامت محسوس نہیں ہوتی لہذا حصولِ نجات کے لئے گناہ کرنا ضروری ہے۔ دوسرے الفاظ میں تو یہ خدا کو محبوب ہے، توبہ کے بغیر نجات نہیں ہو سکتی، گناہ کے بغیر توبہ نہیں کی جاسکتی اس لئے گناہ کرنا لازم ہے چنانچہ راسپوٹین دن رات گناہ میں غرق رہتا تھا۔ جرمنی کے اشتراقی مائسٹر اکہارٹ کا قول ہے۔

”گناہ کے بغیر روح میں پختگی نہیں آسکتی نہ روحانی آفت میں وسعت پیدا ہو سکتی

ہے اس لئے خدا انہیں لوگوں پر گناہ کا بوجھ رکھتا ہے جنہیں اُس نے کسی اعلیٰ

مقام کے لئے منتخب کیا ہو۔“

دوستو! کسی نے ہی فلسفہ گناہ اپنے نادلوں میں پیش کیا ہے۔ اُس کا عقیدہ یہ تھا کہ گناہ اور توبہ سے

انسان خدا کا قرب حاصل کریتا ہے اور خدا گنہگاروں کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے چنانچہ اُس کے نادلوں کے کردار گناہ کا ارتکاب اس نے کرتے ہیں کہ بعد میں انہیں پشیمانی کا احساس ہو جو اُن کی روحانی سر بلندی کا سبب بن جائے۔ تو تھرا کا قول ہے۔

”جی ہر گناہ کرو۔ خدا صرف گناہ گیر کو معاف کرتا ہے۔“

گناہ اور نجات کے بارے میں ہمارے یہاں کے ملائیتہ سعیدائے سرمد، شاہ حسین، بلھے شاہ وغیرہ کا نقطہ نظر بھی یہی تھا۔

جنسی ملاپ اور عورت کے بارے میں کلیسیائے روم کے غیر فطرتی اور مرئیانہ تصور کے اثرات رامبوں اور راہبات کی زندگیوں پر بڑے ناخوشگوار اور ضرر رساں ہوئے کیوں کہ تجربہ سے جنسی خواہش پر قابو نہیں پایا جاسکتا۔ راہب پہاڑوں کی کھوپڑیوں میں بھی عورت کے خیال سے نجات نہ پاسکے۔ جنسی ترغیبت سے بچنے کے لئے وہ کٹھن ریاضتوں سے کام لیتے، مراقبے میں غرق رہتے اور فاقے کیا کرتے۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ جنسی خواہش کو جنسی سختی سے دبایا جائے یہ اتنی ہی شدت سے ابھرتی ہے چنانچہ کئی راہب اپنے حواس کھو بیٹھے۔ نوجوان مقدس کنواریوں نے جناب مسیح کو اپنا دوطھا تصور کر لیا اور پرجوش انداز میں اُن سے اظہارِ عشق کرنے لگیں۔ ایک مسیحی ولی مستھوڈیس نے کہا تھا۔

”ایک پاکباز دوشیزہ کی روح یسوع مسیح کی دہن ہے۔“

پھر کیا تھا۔ ’مسیح کی دہن‘ کی ترکیب میں طسماتی کشش پیدا ہو گئی اور جنسی پہلو سے فاقہ زدہ کنواریاں والہانہ شیفتگی سے آسمانی دوہا سے اظہارِ عشق کرنے لگیں اور اپنے وجود کو اُس کے وجود میں کھو دینے کے خواب دیکھنے لگیں۔ ولی ترلیسا جناب مسیح کو مخالف کرنے کہتی ہے۔

”ترے عشق کے طفیل میں یہاں، اس دُنیا میں تیرے بغیر زندہ ہوں۔ میری التجا

ہے کہ تو میرے رگ و پنے میں عشق کی آگ لگا دے۔ مجھے اس امر کا اذن دے

کہ میں اپنی شعلہ پرورد تمنا کے ساتھ ترے دل میں سما جاؤں، تیرے عشق میں فنا ہو جاؤں۔“

ولیعہ تریساوی سہیڈا کا سٹیں کے ایک ریٹس کی بیٹی تھی۔ وہ پھپھن ہی میں رومانی تصورات میں کھوئی رہتی تھی۔ دس برس کی ہو کر اُس نے ترک دنیا کر کے راہبہ بننے کا عزم کیا۔ چار برس کے بعد وہ جوان ہوئی تو حسن و جمال کی پتی بن گئی۔ وہ کھیل کود کی رسیا تھی اور ہنسی چٹپٹوں میں اپنا وقت گذارتی تھی۔ نوجوان اُس میں دلچسپی لینے لگے۔ وہ ایک خوب رو نوجوان کو دل دے بیٹھی اور اُسے ملاقات کا وقت دیا۔ اُس کے باپ کو اس بات کا علم ہوا تو اُس نے تریسا کو خانقاہ میں داخل کرا دیا جہاں اُسے بڑی کوفت محسوس ہوئی۔ اس زمانے میں وہ بیمار پڑ گئی۔ طویل علالت کے بعد اُس کی صحت تو بحال ہو گئی لیکن شباب کا ولولہ جاتا رہا۔ اُسے ہیریا اور مرگی کے دورے بھی پڑنے لگے۔ اس دوران میں اُس پر فاج گرا اور وہ فریش ہو گئی۔ تین برس کے بعد ایک صبح یک لخت اُسے محسوس ہوا کہ وہ تو بھلی جنگی ہے اور بستر سے اٹھ کر چلتے پھرنے لگی۔ لوگوں نے اُسے تریسا کی کرامت پر محمول کیا اور دور دور سے اُسکی زیارت کو آنے لگے۔ وہ اس خیال سے پریشان ہو جاتی کہ جب کبھی وہ کسی نوجوان کو دیکھے اُس کے رگ و پے میں مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ ایک دن وہ ایک نوجوان سے جیسے وہ چاہنے لگی تھی باتیں کر رہی تھی کہ معاً اُسے محسوس ہوا کہ جیسے یسوع مسیح اُس نوجوان کے پہلو میں کھڑے ہیں وہ مدہوشی کے عالم میں گر پڑی اور اُسے اٹھا کر اندر لے گئے۔ ایک مکاشفے میں اُس نے دیکھا کہ اُس کی روح جسم سے جدا ہو کر آسمان کی جانب پرواز کر گئی ہے اور وہ یسوع مسیح کی باتیں سن رہی ہے۔ ایک دن اُس نے

” ایک نہایت خوبصورت فرشتے کو دیکھا جس نے میرے دل میں ایک لمبا سونے کا تیر جس کے سرے پر آگ لگی ہوئی تھی جھونک دیا اور وہ اُسے بار بار گھنگھولتا رہا حتیٰ کہ وہ تیر میری انڈلیوں تک پہنچ گیا۔ مجھے اس قدر شدید درد محسوس ہوا کہ میں زور زور سے کراہنے لگی لیکن وہ تیر اتنا لذت بخش تھا کہ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ اُسے باہر نکالے۔ اس سے بڑھ کر آسودگی مجھے اپنی زندگی میں کبھی بھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ جب فرشتے نے وہ تیر باہر نکالا اور چلا گیا تو میں خداوند

کے عشق میں سراپا جل رہی تھی۔“

اس مکاشفے کے نفس پروردِ علام صاف عیاں ہیں۔ ولیہ ترسا کا ذکر کرتے ہوئے بے اختیار ذہن میراں کی جانب منتقل ہو جاتا ہے جس نے اپنے بھجنوں میں کرشن سے اظہارِ عشق کیا ہے۔ ایک بھجن میں کہتی ہے

”اے ماں! کرشن نے اپنی صفات سے جن کا گیت میں گاتی ہوں میری رنج کو پوری طرح اپنی پسٹ میں لے لیا ہے۔“

اے ماں! اُس کے پریم کا پتر میرے جسم کے اندر پیوست ہو گیا ہے۔“  
میراں رتن سنگھ راٹھور والی میراتا کی لڑکی تھی۔ وہ ۱۶۵۰ء میں پیدا ہوئی جسے کرشن چودھری لکھتے ہیں

”محل کے سامنے سے ایک برات گذر گئی۔ رانیاں اور بچے دریچوں میں سے جھانک کر تماشا دیکھنے لگے۔ برات گذر گئی تو مہارانی کرشن کی مورتی کی پوجا کرنے چلیں۔ کمسن راجکمار میراں بھی ساتھ تھی۔ اُس نے پوچھا ”ماں! میرا دولا کون ہے“

ماں نے ہنسی ہنسی میں کرشن کی مورتی کی طرف اشارہ کیا اور کہا ”تیرا دولا گردھر کوہاں ہے۔“ راجکمار نے نئی بیاہی ہوئی دلہن کی طرح مورتی کے سامنے اپنے منہ پر کپڑا اوڑھ لیا اور اسی دن سے کرشن کو اپنا دولا سمجھنے لگی۔ بچپن کی یہ شوخی جوانی میں عشقِ بلا نیز کی صورت اختیار کر گئی۔ میراں کا بیاہ کنودھوج بہراج سے ہوا جو رانا ساٹگا والی چتوڑ کا لڑکا تھا۔ سسرال والے درگا پوجا کرتے تھے۔

میراں کرشن کی مورتی ساتھ لے گئی جس سے سسرال والے خفا ہو گئے۔ میراں کا شوہر تخت نشینی سے پہلے ہی مر گیا اور اُس کا دیور گئی پر بیٹھا۔ اُس نے میراں کو کرشن جھگتی سے روکا تو وہ چتوڑ چھوڑ کر بھاگ گئی اور رام داس کی چلی بن گئی۔ اس کے بعد وہ برندا بن اور دوار کا کی یا ترا کو چلی گئی۔ وہاں کرشن کی مورتی سے

لے میراں کے گیت

لیٹ کر جاں بحق ہوئی۔ اُس کی محبت دیوانگی کی حد کو پہنچ گئی تھی اور وہ کرشن کا نام لے کر اُس کی مُدتی کے سامنے ناجیتی گاتی رہتی تھی۔“

میرا نے اپنے بھجنوں میں کرشن سے نہایت پُر جوش انداز میں اظہارِ عشق کیا ہے۔ وہ بار بار مختلف پیرایوں میں کرشن سے مواصلت کی آرزو کرتی ہے۔ ایک بھجن میں کہتی ہے۔  
 ”کرشن نے تیرا داجو میرے آرد پاد لکل گیا۔ برہ کا بھلا میرے اندر لگا اور تمام جسم بے چین ہو گیا۔“

دنیا کی شرم، خاندان کی عزت کا خیال نہیں رکھوں گی۔ پیا کے پدنگ پر جالیٹوں گی اور ہری کے رنگ میں رنگ جاؤں گی۔“

تریسا ولیہ کے مراقبات اور میرا کے بھجنوں میں منحرف جنسی خواہش پوری شدت سے ظاہر ہو گئی ہے۔ رنگ نے ایک عورت کا مکاشفہ بیان کیا ہے جس کے جنسی حلال اس ضمن میں قابلِ غور ہیں۔  
 ”میں پہاڑ پر چڑھی اور ایک جگہ پہنچی جہاں میں نے اپنے سامنے، دائیں بائیں اور پیچھے سات سرخ رنگ کے پتھر دیکھے۔ میں اس مستطیل کے درمیان کھڑی ہو گئی۔ پتھر زینوں کی طرح چبٹے تھے۔ میں نے اُن چار پتھروں کو اٹھانے کی کوشش کی جو میرے قریب تھے۔ ایسا کرتے ہوئے مجھے معلوم ہوا کہ پتھر اُن چار دیوتاؤں کے کھڑے ہونے کی جگہیں ہیں جو سر سے نیچے پاؤں اور پر زمین میں مدفون تھے۔ میں نے کھود کر انہیں باہر نکالا اور اپنے ارد گرد کھڑا کر دیا۔ معاوہ ایک دوسرے کی جانب بٹکے اور اُن کے سر ایک دوسرے سے پھونکنے لگے اور میرے سر کے اوپر خیمہ سا بن گیا۔ میں زمین پر لیٹ گئی اور کہا: ”میں تھک گئی ہوں، آؤ مجھ پر گر جاؤ۔“ دیکھتی کیا ہوں کہ چاروں دیوتاؤں کو شعلے کے ایک چکر نے گھیرے میں لے لیا۔ کچھ دیر کے بعد میں اٹھ کھڑی ہوئی اور دیوتاؤں کے جسموں کو

زمین پر لڑھکا دیا جس جگہ وہ گرے وہاں چار درخت اُگ آئے۔ شعلے کے چکر سے نیلے رنگ کے شعلے لپکے اور درختوں کی پتیوں کو جھلس دیا۔ یہ دیکھ کر میں نے کہا ”اس چیز کو ختم ہو جانا چاہیے۔ مجھے شعلوں میں گھس جانا چاہیے تاکہ پتے جل جانے سے بچ جائیں“ پھر میں آگ میں گھس گئی، درخت غائب ہو گئے، آگ کا چکر ایک بہت بڑے نیلے شعلے میں بدل گیا اور مجھے زمین سے اٹھا کر اُپر لے گیا۔

جنسی ترضیات سے بچنے کے لئے کلیسیائے روم نے ازمنہ وسطیٰ میں نہانے دھونے پر پابندی عائد کر دی تھی۔ خیال یہ تھا کہ جسم کو صاف ستھرا رکھنے سے نفسانی خواہش بھرک اٹھتی ہے۔ غلاظت کی تعریف کی جاتی تھی اور جسم کی بدبو کو ”تقدس کی خوشبو“ کہتے تھے۔ ولیہ بالا کا قول ہے ”جسم اور کپڑوں کی صفائی کا مطلب ہے روح کی آلالش“ جوڑوں کو ”خدا کے موتی“ کہا جاتا تھا۔ خیال یہ تھا کہ جس شخص کے بدن میں جتنی زیادہ جوڑیں ہوں اتنا ہی زیادہ وہ مقدس ہوتا ہے۔

جذبہ مذہبیت اور صوفیانہ احساس کے ساتھ غیر معمولی تند و تیز جنسی خواہش کے تعلق کا ذکر کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر فارستھ کے خیال میں تصوف منحرف جذبہ جنس کا دوسرا نام ہے۔ وہ کہتا ہے، یہ بات قابل غور ہے کہ صوفیہ اپنے آپ پر وجد و حال کی کیفیت طاری کرنے کے لئے جنسی خواہش کو دبائے کی تلقین کیا کرتے ہیں۔

”خدا سے رابطہ قائم کرنے کے لئے صوفی کئی نفسیاتی مراحل سے گزرتا ہے۔ آخری

مرحلہ وارفتگی اور جلوہ محبوب حقیقی کا ہوتا ہے جس میں ایک صوفی شدید جذباتی میجان محسوس کرتا ہے اور وجد و حال کے عالم میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں وہ عشاق کی زبان میں بات کرتا ہے اور روحانی وصل اور عروسی کا حوالہ دیتا ہے۔ جنسی خواہش کے جوش و خروش اور اس کیفیت میں واضح مماثلت پائی جاتی ہے۔ نقطہ خروج کو پہنچ کر موضوع اور معروض کی دوئی

بٹ جاتی ہے اور سب کچھ مٹ مٹا کر ایک ہو جاتا ہے۔“

تجربہ اور زاویہ نشینی سے اُن کے تخیل پر عورت کا تصور مسلط ہو جاتا ہے اور جس خواہش کی تسکین وہ روزمرہ کی زندگی میں نہیں کر سکتے اس کی تسکینی وہ عالم خیال میں کر لیتے ہیں۔ ہیویلاک ایلس نے لکھا ہے کہ صوفیانہ بے خودی اور جنسی جذبے کی از خود رفتگی میں گہرا ربط و تعلق ہے۔ کرافٹ ایبنگ نے جنسی خواہش اور مذہبی تقدس کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے مسیحی اولیاء کی حقیقت جنسی کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ مذہبیت اور جنسی جذبے کے عینان میں اشتراک پایا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ولیہ ترلیسا کے 'لذت بخش عذاب' میں جنسی جذبہ مشمول ہے۔ اُس کے خیال میں جنسی جذبے کو دبا دیا جائے تو انسان کے دل میں بے پناہ توانائی پیدا ہو جاتی ہے جس سے جذبہ مذہبیت سیراب ہوتا ہے۔ فریبِ نفس سے بچتے ہوئے فرائد نے اس کے جنسی عوامل کی طرف توجہ دلائی ہے اور ڈاکٹر شریر کی مثال دیتے ہوئے کہا ہے۔

”ڈاکٹر شریر کا فریبِ نفس مذہبی اور صوفیانہ رنگ اختیار کر گیا۔ وہ کہتا ہے

کہ ”مجھے خدا سے بلا واسطہ تعلق ہے، مجھے شیطان نے اپنا کھلونا بنا رکھا ہے،

مجھے معجزانہ پیکر دکھائی دیتے ہیں، میں مقدس راگ سنتا ہوں“ بالاخر اسے

اس بات کا یقین ہو گیا کہ وہ کسی اور ہی عالم میں رہتا ہے۔ اُس نے محسوس

کیا کہ وہ خدا کی زوہر ہے۔ وہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے ”میرے جسم کے اندر

کچھ ایسی تبدیلی واقع ہوئی جیسی کہ مریم عذرا کو مسیح کے استقرارِ حمل سے ہوئی

مقی یعنی ایسی باکرہ کو جو اچھوتی تھی، دو مختلف مواقع پر میرے اعضاء

تاسلیہ زنانه ہو گئے اگرچہ وہ پوری طرح عورتوں کے جیسے نہیں تھے اور میں

نے اپنے بدن میں جنسِ محسوس کی جو عورتیں جنس کی حرکت سے محسوس کرتی ہیں۔“

جنسیات کے طلبہ ایذا کو شہی اور ایذا طلبی کو بھی مذہبیت اور جنس میں قدر مشترک مانتے ہیں اور

کہتے ہیں کہ مختلف مذاہب کے پیروؤں نے ایک دوسرے پر بے پناہ ظلم توڑے ہیں۔ ایک  
 ہی مذہب کے مختلف فرقوں نے معمولی اختلاف کی بنا پر اپنے مخالفین کو قتل کرنے میں کوئی  
 باک محسوس نہیں کیا۔ یورپ کی مذہبی لڑائیوں میں اور جادوگرینوں، اویسودیوں کے قتل عام  
 میں نہایت درجے سفاکی سے کام لیا گیا۔ احتساب کلیسیا والوں نے عقیدے کے اختلاف  
 کے بہانے بے شمار بے گناہ مرد عورتوں کو رُوح فرسا عذاب دے دے کر موت کے گھاٹ  
 اتار دیا۔ انہیں شکنجوں میں کس کر ان کے جسم کی ہڈیاں چور چور کی گئیں، زبانیں گدھ سے  
 کھینچ لی گئیں، آگ کے الاؤ میں بھونک دیا گیا، آگ میں تپائی ہوئی لکڑیوں سے گوشت  
 کو ہڈیوں سے جدا کیا گیا۔ ولی سائرل کے حکم سے سکندریہ کی فلسفی خاتون ہانی پیشیا کو پاروں  
 نے سر بازار قتل کیا اور اس کا انگ انگ کاٹ کر آگ میں پھینک دیا گیا ہانی پیشیا کا جرم  
 محض یہ تھا کہ وہ فلسفے کا درس دیتی تھی۔ بے شمار علم دوست لوگوں کو مطالعہ کتب کے جرم  
 میں قید کیا گیا ہندوؤں نے سودروں پر بے پناہ ستم توڑے اور انہیں وحوش کی لپیٹوں تک  
 گرا کر دم لیا۔ اہل مذہب کی ایذا طلبی کا ثبوت ان ریاضتوں سے بھی ملتا ہے جو عیسیٰ رامب،  
 ہندو یوگی اور بعض صوفیہ کرتے رہے ہیں۔ کیلوں کے بستر پر لیٹا، کھوپڑوں سے پانی پینا،  
 اتنا عرصہ ایک ہی جگہ کھڑے رہنا کہ ہاتھ پاؤں سوکھ کر ٹھنڈے ہو جائیں، عمر بھر غسل نہ کرنا،  
 رات رات بھر دریا میں کھڑے ہو کر منتر پڑھنا، اپنے آپ کو کوڑے مار مار کر لہو بہا کر لینا،  
 اپنے آپ کو آختہ کر لینا، بالوں کا کھر درا لباس پہننا، غلاظت میں لتھڑے رہنا، چلے کاٹنا،  
 بیس بیس برس کھو ہوں میں اور مناروں کی چوٹیوں پر گزار دینا یہ سب اعمال ایذا طلبی کی  
 نشان دہی کرتے ہیں۔

## جنسی انحرافات

جنسی انحرافات سے مراد ہے جنسی خواہش کی تسکین کے لئے ایسا طریقہ اختیار کرنا جو طبعی معمول سے مختلف ہو اور جو اپنی انتہائی صورت میں جنسی ملاپ کا بدل بن جائے۔ تحلیل نفسی کے طبقہ کہتے ہیں کہ ہر شخص میں جنسی انحراف کے ممکنات پائے جاتے ہیں۔ جنسی پہلو سے ایک صحت مند شخص اور ایک مریض کے مابین فرق کرنا مشکل ہے۔ جو لوگ جنسی لحاظ سے بظاہر نارمل دکھائی دیتے ہیں ان میں بھی انحراف کا میلان موجود ہوتا ہے۔ فرائد کہتا ہے کہ نارمل اور منحرف جنسیت دونوں کا سرچشمہ شیرخوارگی کے دور کی جنسی زندگی ہوتی ہے اور انحرافات دورِ طفلی ہی کی باقیات ہیں جن سے آدمی بلوغت کے بعد دوبارہ آشنا ہوتا ہے۔ جنسی انحراف کے چار پہلو ہیں۔

۱۔ — حقیقت نفس کی خاطر جنسی معمولات سے ہٹ کر نئے نئے طریقے اختیار کرنا۔ بعض لوگ طبعاً نارمل ہوتے ہیں لیکن تیس چالیس برس کی عمر کے درمیان نئے جنسی تجربات کرنے لگتے ہیں کیوں کہ شباب کا جوش و خروش ختم ہو جانے کے بعد انہیں طبعی طریقوں سے حسبِ دلوہ تشفی نہیں ہوتی۔ 'سیری' یعنی زندگی کا مصنف بتلاتا ہے کہ وہ پینتیس برس کی عمر کے بعد جنسی انحراف کی جانب مائل ہوا تھا۔ کس نوا کے سوانح حیات سے بھی اس بات کا ثبوت ملتا ہے۔

۲۔ — بوڑھے عیاش جن کی زندگی کا واحد مقصد نفسانی لذت کا حصول ہوتا ہے ازکار رفتہ ہو کر انحرافات سے رجوع لاتے ہیں۔

۳۔ — کچھ لوگ جنسی کوتاہ ہمتی کے باعث احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اس کی تلافی کے

لئے SEXUAL DEVIATION اور اس صدی تک اسے SEXUAL PERVERSION

کہا جاتا تھا جس کا مطلب ہے جنسی کج روی۔ لہذا اصطلاح میں اسے POLYMORPHICALLY PERVERSE کہتے ہیں۔

لئے جنسی انحراف کا دامن تمام لیتے ہیں۔ انہیں اپنی قوتِ رجولیت پر اعتماد نہیں ہوتا اور عورت سے خوف کھاتے ہیں۔

۴۔ بعض لوگ لاشعوری جبر کے تحت جنسی انحرافات میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور جنسی سلاپ سے گریز کرتے ہیں۔ انہی لوگوں کو صحیح معنوں میں جنسی انحراف کے خطی کہا جاسکتا ہے۔

یاد رہے کہ جنسی انحراف کے خطی اکثر و بیشتر طبقہٴ اُمرا سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ لوگ فیکرِ معاش سے آزاد ہوتے ہیں اس لئے فراغت کے اوقات میں عیشِ کوشی کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں اور جب عیاشی کے محروم مطلقوں سے اکٹا جاتے ہیں تو انحراف کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ بغریوں کو فیکرِ معاش اس قدر پریشان کرتی ہے کہ وہ اس نوع کے روگ پالنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے اور جنسی لحاظ سے صحت مند زندگی گزارتے ہیں۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ جنسی انحرافات حضرت انسان سے خاص ہیں۔ حیوانات میں ان کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔ قدام بھی جنسی انحرافات سے آگاہ تھے۔ یونانیوں اور رومیوں کی تالیفات میں ان کا ذکر آیا ہے۔ جنسیات کی دنیا میں سب سے پہلے کرافٹ ایمنگ نے جنسی انحرافات پر تحقیق کے انداز میں قلم اٹھایا۔ پاؤنٹیناگرا کی کتاب جنسی کرویوں، بھی اس ضمن میں قابلِ ذکر ہے۔ فرلڈ، ہیولاک ایلس اور ہرش فیلڈ نے بھی اس موضوع پر تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔ اس باب میں ہم چند عامۃ الورد انحرافات کا ذکر کریں گے۔

**ایذاکوشی** اس کا مطلب ہے فریقِ ثانی کو اذیت دے کر جنسی حطِ محسوس کرنا۔ یہ ترکیب

موریو دتور نے فرانس کے ایک رئیسِ مار کی دو نائن الفانسے دساد کے نام پر وضع کی تھی۔ دساد ۱۸۴۰ء میں پیرس میں پیدا ہوا، جوان ہو کر فوج میں بھرتی ہو گیا اور ہفت سالہ جنگ میں لڑتا رہا جہاں اُس نے بربریت اور شفاکی کے خوفناک مناظر دیکھے۔ پچیس برس کی عمر میں شادی کی جو ناکام ثابت ہوئی۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد اُس کی ساس نے حکام سے ساز باز کر کے اُسے گرفتار کرا

۵۔ اس کی مشہور کتاب ہے PSYCHOPATHIA SEXUALIS

دیا کیوں کہ دساد نے ایک کسی روز گیلہ کو اس کے ہاتھ پاؤں جکڑ کر کوڑے مارے تھے۔ اس کے  
 یہاں عیش کوشی کی خفیہ مجالس برپا ہوتی تھیں جن میں عورتیں اور مرد فسق و فجور کے شرناک مظاہرے  
 کرتے تھے۔ اس قسم کی ایک محفل میں اس نے کبھیوں اور مہمانوں کو ایک زہریلی چیز کھنکھریڈ لیں کھانے  
 میں بلا کر بھلا دی جس سے دو آدمی جاں بحق ہو گئے۔ دساد پکڑا گیا اور اسے تیرہ برس کی سزا دی گئی۔  
 قید تنہائی میں اپنے جذبہ ایذا کوشی کی تسکین عالم تحسین میں کستے ہوئے اس نے قصے لکھنا شروع کئے  
 جو بعد میں دس جلدوں میں شائع ہوئے۔ اس کے دو ناول جسٹن اور جولیت فحش نگاری کے شاہکار  
 سمجھے جاتے ہیں۔ ان ناولوں میں اس نے ایذا کوشی کے پردے میں اپنے 'شیطانی فلسفہ' اور  
 'شیطانی اخلاق' کی تبلیغ کی ہے۔ اس نے عجیب و غریب دلیلوں اور تاویلوں سے یہ ثابت کرنے  
 کی کوشش کی ہے کہ اس دنیا میں نیکی کرنا حماقت ہے اور نیک آدمی ہمیشہ گھاٹے میں رہتا ہے۔ بد اور  
 خبیث ترقی کرتے ہیں اور ہر قسم کی لذت سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ وہ کہتا ہے کہ اہل  
 مذہب ریاکار، نفس پرست، زہد فروش دنیا دار ہوتے ہیں جو اپنے مکروہ عزائم کو مذہب کے لباس سے  
 میں چھپاتے ہیں۔ جسٹن میں اس نے پادریوں کی بوس کاری کا نقشہ کھینچا ہے۔ دساد پکڑا گیا تھا۔  
 وہ کہتا ہے کہ خدا کائنات کا خالق نہیں ہے بلکہ خود ذہن انسانی کی مخلوق ہے اور ذہن انسانی سے  
 علاحدہ اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ انقلاب فرانس کے بعد اسے باسٹیل کی جیل سے رہا کر دیا گیا۔ اس  
 نے اپنی کتاب میں پولیس کو پیش کیا جس نے اسے پاگل خانے بھیجا دیا جہاں وہ دسمبر ۱۸۱۴ء میں مر گیا۔  
 دساد نے اپنے قصوں میں ایذا کوشی کی جو مثالیں دی ہیں وہ معاصر معاشرے ہی سے لی گئی  
 ہیں۔ اس کی قیل کے امراء کبھیوں کے بدن میں نشتر چھو کر اور ان کی رگیں کاٹ کر محفوظ ہو سکتے  
 تھے۔ ۱۸ ویں صدی کے انگلستان اور فرانس میں قہر خانوں میں کوڑے مارنے اور کھانے کا رواج  
 عام تھا۔ کوڑے چینی خواہش کو برا نگینہ کرنے کے لئے مارے یا کھائے جاتے تھے۔ دساد کا نظریہ یہ  
 تھا کہ کوڑے مارنے پر عورت کو مامور ہونا چاہیے کیوں کہ وہ مرد سے بڑھ کر ایذا کوش ہوتی ہے اور اس

میں رحم و کرم کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ قبہ خانوں میں جو عورتیں کوڑے مارنے اور دوسرے عذاب دینے کی ماہر ہوتی تھیں انہیں گورنس کہتے تھے۔ ایک ایذا کو ش عورت نے کہا ”میرا جی چاہتا ہے کہ ایک خوبصورت شائستہ مرد میرے قدموں میں لوٹ رہا ہو، میری ہر بات مانے، میں اسے جی بھر کر گایاں دوں اور اسے خوب پیوں۔“ اس نظریے کی رو سے مرد پر حکومت کرنے کی خواہش ہر عورت میں ہوتی ہے۔ اس ضمن میں چامبر کی ایک حکایت بیان کی جاتی ہے۔ ایک ملکہ نے اپنے ایک سردار سے کہا مجھے یہ بتاؤ کہ عورت کی عزیز ترین خواہش کیا ہے۔ دس دن تک تم کوئی شافی جواب نہ دے سکے تو تمہارا سر قلم کر دیا جائے گا۔ سردار پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا۔ آخر ایک بڑھیا نے اسے کہا، ملکہ سے ہمارا کہہ دو کہ عورت کی عزیز ترین خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے شوہر یا عاشق پر حکومت کرے۔

وانڈا نے اپنے شوہر ساغر مزوج سے — اس کا ذکر آگئے آئے گا — نکاح کا یہ معاملہ کیا تھا۔  
 ”میرے غلام! وہ شرالطہ جن کی بنا پر میں تمہیں بطور ایک غلام کے قبول کرتی ہوں، درج ذیل ہیں۔ تم اپنے آپ کو کامل طور پر میرے سپرد کرتے ہو۔ تمہاری اپنی کوئی مرضی نہیں ہے، میری مرضی ہی تمہاری مرضی ہوگی۔

تم میرے ہاتھوں میں ایک بے جان آلہ کار ہو اور میرے تمام احکام کی بے چوں و چرا تعمیل کرو گے۔ اگر تم بھول جاؤ کہ تم میرے غلام ہو اور میری کامل اطاعت میں کوتاہی کرو گے تو میں تمہیں سزا دینے کی مجاز ہوں گی اور جیسے چاہوں گی سزا دوں گی۔ میں تمہیں کوئی حظ یا مسرت بخشوں تو یہ میرا کرم ہو گا اور تمہیں یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ یہ میرا احسان ہے۔ مجھ پر تمہارا اس قسم کا کوئی حق نہ ہو گا۔ میں تم پر سخت ترین تشدد کرنے کی مجاز ہوں جو تمہیں بغیر شکایت کے برداشت کرنا ہو گا۔ اگر میرے پاس دولت ہو اور اس کے باوجود تمہیں بھوکا رکھوں اور تمہیں اپنے پیروں تلے کچل دوں تو بھی تمہیں بغیر پس و پیش کے میرے پیروں کو چومنا ہو گا۔ میں تمہیں کسی وقت بھی کمرے سے نکال سکتی ہوں لیکن تمہیں میری رضامندی کے بغیر باہر جانے کی اجازت نہیں ہوگی اور تم نے بھاگ نکلنے کی کوشش کی تو مجھے اس بات کا اختیار ہو گا کہ تمہیں ہر طریقے سے عذاب دے کر جان سے

میرے سوا تمہارا کچھ بھی نہیں ہے۔ میں ہی تمہاری سب کچھ ہوں، تمہاری زندگی ہوں، تمہارا مستقبل ہوں، تمہاری خوشی ہوں، تمہاری شامت ہوں۔ تمہاری مسرت ہوں، تمہارا غم ہوں، تمہیں میرے احکام کی تعمیل کرنا ہوگی، اس کا نتیجہ اچھا نکلے یا بُرا۔ اگر میں تمہیں کہوں کہ کسی جرم کا ارتکاب کرو تو تمہیں میری رضامندی کے لئے جرم کرنا ہوگا۔ تمہاری عزت میری ملک ہے۔ تمہارا خون، تمہاری رُوح، تمہاری توانائی سب کچھ میرا ہی ہے، میں تمہاری زندگی اور موت پر پوری طرح مُتصرف ہوں۔ اگر تمہیں کبھی اس امر کا احساس ہو کہ تم میری حکومت کو برداشت نہیں کر سکتے اور یہ زنجیریں تمہارے لئے بہت زیادہ بوجھل ہو گئی ہیں تب تمہیں خودکشی کرنے کا اختیار ہوگا۔ میں تمہیں کبھی بھی رہا نہیں کروں گی۔“

دستخط وائڈا خان دو ناجیو

اس معاہدے پر دستخط کرتے ہوئے ساخر میر وِخ نے لکھا

”میں اپنی عزت و وقار کے نام پر عہد کرتا ہوں کہ میں مادام وائڈا خان دو ناجیو کا غلام ہوں بالکل اُس مفہوم میں جو کہ مندرجہ بالا دستور سے مُستاد رہتا ہے اور میں برضا و رغبت اُس کی ہر خواہش کے سامنے تسلیم خم کرتا ہوں۔“

دستخط ڈاکٹر لیو پولڈ بیرن خان ساخر میر وِخ

روم کی ایک ملکہ قیصر ڈورائے ایڈاکوشی کا ایک عجیب طالعہ وضع کیا تھا۔ وہ ایک شخص پر فریضہ تھی لیکن اُسے اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیتی تھی اور اپنے محبوب کے سامنے دوسرے مردوں سے اختلاط کرتی تھی۔ کالی گولا قیصر روم جب کسی عورت سے ہم کنار ہوتا تو ملاحظت کرتے ہوئے کہا کرتا ”میں مُنہ سے ایک کلمہ نکالوں تو یہ مر مر میں گردن اپنی تن سے جدا ہو جائے“ جیمز دوم شاہ انگلستان ایڈاکوشی تھا اور اپنی ملکہ میری آد مودینہ کو تھلنے میں بیدار کرتا تھا۔ جہنگری کے کونٹ ندامدی کی بیگم خونی باٹھوی نے چھ سو جوان لڑکیوں کو قتل کرایا تھا۔ وہ اپنے شباب کو بچاں رکھنے کے لئے اُن کے خون میں نہایا کرتی تھی۔ ۱۸ ویں صدی میں انگلستان کے امراء کی زندگیاں فحش و فجور اور ایڈاکوشی کے بدترین نمونے

نقیں۔ بید زنی اور ادا لہ بکارت کا شوق جنون کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ اور یہ عادت انگریزوں کی قومی خصوصیت میں شمار ہوتی تھیں۔ بالکہ لڑکیوں کے حصول پر بے دریغ روپیہ صرف کیا جاتا تھا اور بید کھانے کے لئے قحبہ خانے کی گورنس کو خطرہ قوم معاوضے میں دی جاتی تھیں۔ آج کل بھی یورپ میں قحبہ خانوں میں عذاب خلعے موجود ہیں جن میں سر پرستوں کو ننگے بدن پر بید مارے جاتے ہیں یا مختلف طریقوں سے اذیت دی جاتی ہے۔ ان میں قبرستان کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے کہ کیاں کفن پس کر قبر میں لیٹ جاتی ہیں جہاں ایذا کو ش از سے متع کرتے ہیں۔

ایک عالم نفسیات برڈاؤخ نے کہا ہے کہ ایذا کو ش طبی طور پر نفسی ملاح میں مشمول ہے اور حفظ نفسانی اور اذیت کے امتزاج ہی سے جنسی جبلت ترکیب پاتی ہے بلیو پڑا کہتی ہے لہ

” موت کی قرب عاشق کی چٹکی کی طرح ہے کہ تکلیف بھی دیتی ہے اور مرغوب بھی ہوتی ہے۔“

ایسے واقعات بھی مشاہدے میں آئے ہیں کہ مرد نے اختلاہ کے عالم میں حفظ نفسانی کے نقطہ عروج کو پہنچ کر خریق ثانی کا گلا گھونٹ کر اسے ہلاک کر دیا۔ ڈاکٹر فارستھ نے جنس اور مذہب کے تعلق اور جذبہ مذہبیت میں ایذا کو ش اور ایذا طلبی سے بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ مختلف مذاہب کے پرووں اور ایک ہی مذہب کے مختلف فرقوں نے معمولی اختلافات کی بنا پر ایک دوسرے پر بے پناہ ظلم توڑے ہیں۔ یورپ کی مذہبی لڑائیوں اور یہودیوں اور مجادو گرینوں کے قتل عام میں درندگی کے مظاہرے کئے گئے۔ احتساب کیسیا والوں نے عقائد کے اختلاف پر اپنے ہم مذہبوں کو روح فرسا عذاب دیئے۔ انہیں شکنجوں میں کس کر ان کی ہڈیاں چور چور کی گئیں، زبانیں گدی سے کھینچ لی گئیں، آگ میں جلایا گیا، لوہے کی آگ میں تپائی ہوئی کنگھیوں سے ان کا گوشت پوست ہڈیوں سے جدا کیا گیا۔ ہندوؤں نے بودھوں پر خوف ناک منظام ڈھائے اور شوروں کو طرح طرح کے عذاب دیئے۔ مختلف مذاہب کے دروزوں میں بھی ایذا کو ش کا غفر موجود ہے مثلاً زبان کو کھینچ کر گردن کے پیچھے سے نکالنا، ناخنوں کو پھریوں سے چھیل کر گوشت سے الگ کرنا، درندوں سے پھڑوانا، سانپوں سے ڈسولنا، آدمی کو کلڑی کے آرسے سے چرنا، بدن کے سوراخوں میں

انگارے بھرنا، آنکھوں میں سُوئیاں چھپونا، پیپ اور خون کے سمندر میں غمٹے دینا وغیرہ۔ شکار اور غنی کھیس تماشوں میں بھی ایذا کو شہی کا میلان پایا جاتا ہے۔ رومہ میں قیامہ اور امراء کو محفوظ کرنے کے لئے سورما اکھاڑ میں اترتے تھے اور ایک دوسرے کو بے دریغ بتریع کرتے تھے، عیسائیوں کو درندوں سے پھڑپھڑایا جاتا تھا، ٹکلی سے بازہ کر اور کپڑوں پر تیل پھڑک کر مشعل کی طرح جلایا جاتا تھا۔ ان اکھاڑوں کے قریب ہی قہر خانے ہوتے تھے۔ تماشائی فونزیری کے یہ مناظر دیکھ کر ان قہر خانوں کا رخ کرتے تھے کیوں کہ بہتا ہوا خون دیکھ کر ان کی نفسانی خواہش کو اشتعالک ہوتی تھی۔ آج کل بھی فلموں میں جنس اور فونزیری کے امتزاج سے موضوع لئے جاتے ہیں جس سے تماشائیوں کی ایذا کو شہی کی تسکین کی جاتی ہے۔ ڈینیئل ادب میں ایڈگار الین پو، بادلیئر، ڈانزیو، جارج سائ وغیرہ کے قصوں میں ایذا کو شہی کے مناظر ملتے ہیں۔ ان میں حسین فونزیرہ کیوں کے قتل کے واردات مزے لے لے کر بیان کئے جاتے ہیں۔

**ایذا طلبی** لے جنسی نفسیات کی اصطلاح میں ایذا طلب اُس شخص کو کہتے ہیں جو جسمانی اذیت اٹھا کر نفسانی حظ عموس کرتا ہے۔ میزوحیت کی ترکیب پر وفیسر کراؤٹ اینگ نے آسٹریا کے ایک ممتاز قانون دان اور ناول نگار لیو پولڈ فان ساخر میزورخ کے نام پر وضع کی تھی ساخر میزورخ ۲۷ جنوری ۱۸۶۶ء کو لیبرگ میں پیدا ہوا۔ وہ نہایت ذہین و فطین تھا۔ اُس نے قانون میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ جس کسی عورت سے اُس کا معاشرہ ہوتا، وہ اُس سے فرمائش کیا کرتا کہ وہ اُس کے تنگے بدن پر چابک مارے اور ہر طرح سے اُس کی توہین و تذلیل کرے۔ اُس نے تلاش کر کے ایک ایذا کو شہ عورت وائڈا سے نکاح کیا۔ وائڈا اُس کے تنگے بدن پر کیل جڑی ہوئی قمچیاں مارا کرتی تھی جس سے وہ لہو لہان ہو جاتا تھا۔ وہ اپنا خون بہتا دیکھ کر بڑا محفوظ ہوتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اس جسمانی عذاب سے اُس کی نفسانی خواہش کی تشفی بھی ہو جاتی ہے اور تخلیق ادب کی تحریک بھی ہوتی ہے۔ ایک دن میزورخ نے اپنی بیوی وائڈا سے کہا کہ وہ اُس کے ایک دوست کے پاس خلوت میں جائے۔ وائڈا نے اُسے لعنت و ملامت کی لیکن وہ بار بار التجا کرتا رہا۔ آخر وائڈا رضامند ہو گئی تو میزورخ نے اُسے اپنے دوست کے پاس بھیجے سے پہلے وائڈا کے ہار سنگھار میں اُس کا ہاتھ بٹایا اور جب وہ چلی گئی تو وہ خوشی سے بے اختیار ناچنے اور

تالیاں پیٹے لگا۔ میزورخ کے مشہور ناول ”سمور پوش زہرہ“ میں ظالم اور سنگ دل ہیروئین اپنے عاشق کو دھوکا دے کر چھانسی لیتی ہے اور اُس کی ٹشکیں کسوا کر چابک مار مار کر اُس کی کھال اُدھڑتی ہے۔ اُس ناول کی اشاعت کے بعد سمور اور چابک ایذا طلبی کے تمام قصوں میں بار پانگے۔ میزورخ کے معاشقے تہذیبی بولڈے خوف اور بگم بین شائیں سے بھی ہوئے۔ وہ اُن سے بھی کوڑے کھایا کرتا تھا۔

برنہاڈ برنیز جنسی اور اخلاقی ایذا طلبی کا فرق بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

”میزوفیت (ایذا طلبی) کا مطلب ہے ایسے شخص سے پیار کرنا جو پیار کرنے والے سے نفرت اور بد سلوکی کرتا ہو۔ جنسی ایذا طلبی بھی عام طور سے ایک ایسی عورت میں موجود ہوتی ہے جس کے ہاتھ میں چابک ہو جسے وہ جنسی خواہش کی تسکین کے لئے استعمال کرتی ہو یا اس نوع کا تصور موجود ہو۔ بعض اوقات اس مقصد کے لئے کسی کسی کی خدمات مستعد لی جاتی ہیں تاکہ وہ عاشق کے تخیلات کو عملی جامہ پہنا سکے۔ اُس کے ہاتھ سے چابک کھا کر آدمی اپنے آپ کو ایک شریر بچہ یا غلام تصور کر لیتا ہے جس سے اُس کی جنسی تسکین ہو جاتی ہے۔ اخلاقی ایذا طلبی میں جنسی غمخیز نہیں ہوتا۔ اس میں بقول فرائد اذیت سے غرض ہوتی ہے خواہ اذیت دینے والا کوئی بھی ہو۔ فرائد کہتا ہے کہ ممکن ہے یہ اذیت غیر شخصی قوتوں یا حالات سے پہنچے لیکن ایک سچا ایذا طلب ہمیشہ اپنا گال آگے کر دیتا ہے جب کوئی ہاتھ اُسے مارنے کے لئے اٹھتا ہے۔“

عیسائیت کو ایذا طلبی کا مذہب کہا گیا ہے۔ ڈاکٹر فارستھ کے بقول ایذا طلبی کا ثبوت اُن ریاضتوں سے ملتا ہے جو رامب، یوگی اور صوفی کیا کرتے ہیں۔ کیوں کہ بستر پر لیٹا، کھوپڑی سے پانی پینا، ایک جگہ کھڑے رہنا حتیٰ کہ ہاتھ پاؤں سوکھ کر ٹھنڈے ہو جائیں، غسل نہ کرنا، دریا کے پانی میں ساری ساری رات کھڑے ہو کر منتر چننا، اپنے آپ کو کوڑے مارنا، اپنے آپ کو آفتہ کر لینا، غلاظت میں لتھڑے رہنا، بالوں کا لباس پہنا ایذا طلبی ہی کی مختلف صورتیں ہیں۔ فرائد کا ایذا طلبی کا نظریہ یہ ہے کہ انسان کے بطون میں دو لاشعوری قوتیں برسرِ پیکار ہیں، زندگی کی جبلت اور موت کی جبلت۔ موت کی جبلت فنا پر آمادہ کرتی ہے جب

اس میں جنسی خواہش مشمول ہو تو جنسی ایذا طلبی کی نمود ہوتی ہے۔ ہرٹس فیلڈ نے ایذا طلبی کے چار پہلوؤں سے بحث کی ہے۔ — ۱۔ اپنی توہین و تذلیل کی خواہش — ۲۔ محبوبہ سے پٹے وقت اپنے آپ کو بچھ محسوس کرنے کی آرزو، بید مارنے والی عورت کو اپنی ماں کا بدل سمجھ لینا۔ — ۳۔ محبوبہ کے ہاتھوں حیوان بننے کی تمنا۔ پیرس، لندن، نیویارک کے قہر خانوں میں پیشہ ور ناکہ کے پاس لگائے گئے کتے کے پٹے، چابک، بید، قمیصاں، زنجیریں موجود رہتی ہیں کوئی شخص کتیا یا گھوڑا بننا چاہے تو اُس پر زین کس دی جاتی ہے یا گلے میں پٹہ ڈال دیا جاتا ہے۔ — ۴۔ محبوبہ کے ہاتھوں میں ایک بے جان شے بننے کی خواہش مثلاً سٹول بن جانا جس پر محبوبہ بیٹھ سکے، موصوف بن کر لیٹ جانا تاکہ وہ اُس پر آرام کر سکے۔ ہرٹس فیلڈ صدمہ کو ایذا طلبی ہی کی ایک صورت قرار دیتا ہے اور طویل بحث کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ ایذا طلبی صدمہ کا مرکزی نقطہ ہے۔ ایذا طلب دو قسم کے ہوتے ہیں۔

— ۱۔ جو ایک خوبصورت عورت کے ہاتھوں سے بید کھاتے ہیں۔ انہیں آج کل کے مغربی قہر خانوں میں آہنی حلقوں میں جکڑ دیا جاتا ہے اور اُن کے ہاتھ پاؤں باندھ دیتے ہیں پھر کسبیاں اُن کے ننگے بدن پر زور زور سے بید مارتی ہیں۔ بعض ایذا طلب چاہتے ہیں کہ انہیں چھت سے لٹکی ہوئی زنجیروں میں جکڑ دیا جائے، پھر اُن کے بدن پر خار دار کوڑے برسائے جائیں۔ ۱۹ ویں صدی میں سربارکھ نے لندن میں ایک عذاب خانہ کھول رکھا تھا جہاں ایذا طلب نوجوان کبھیوں سے بید کھا کھا کر حفظ اندوز ہوتے تھے۔ اُس کے یہاں ایک کل موجود تھی جسے بارکھ کا گھوڑا کہا جاتا تھا۔ اس میں ایذا طلبوں کو جکڑ کر انہیں کوڑے مارتے تھے۔ یادر ہے کہ اس نوع کے قہر خانوں کے سرپرست ہمیشہ اُمراء و روساء ہوتے ہیں عیاشی کی زندگی ان کے اعضاء کو مضمحل اور اعصاب کو ماؤف کر دیتی ہے اور وہ اپنی کوتاہ ہمتی کا مداوا اس قسم کے قہر خانوں میں تلاش کرتے ہیں۔ مولانا دوم نے کہا تھا ع۔ درمختصر حصہ سونے پس رود۔ ان لوگوں کی انسانی خواہش سرنیوں اور رانوں میں چلی جاتی ہے جن پر بے تحاشا کوڑے کھا کر وہ حفظ انسانی محسوس کرتے ہیں۔ اس شوق پر وہ ہزاروں روپے خرچ کرتے ہیں۔ ایک فوجی افسر نے ہوا یذا طلب تھا اپنی محبوبہ کو خط میں لکھا ”میری گرم فرما غلام دوزانو کو کر نہایت عاجزی سے اُس چابک کو بوسہ دیتا ہے جو

آپ نے نہایت بے رحمی سے میرے تنگے بدن پر برسیا تھا۔ جان من! اب آپ جسمانی اور اخلاقی پہلوؤں سے اپنے اس غلام کو انتہائی ذلیل کیجیے۔ مجھے اپنے غیظ و غضب کا نشانہ بنائیے۔ میں بالکل پس چکا ہوں، مجھے قطعی بے بس بنا دیجیے، میں آپ کی مرضی پوری کروں گا۔ میری ملکہ! اپنے غلام پر ظلم ڈھاؤ، اُسے جسمانی و ذہنی عذاب دو، اُسے شدید اذیت پہنچاؤ تاکہ اس سے آپ کو دردی خوشی محسوس ہو مجھے زنجیروں میں جکڑ دیجیے تاکہ آپ کا غلام بل نہ سکے اور پھر بے رحمی سے اُسے چابک ماریے۔ میری کراہیں آپ کو محفوظ کریں گی۔ اس بے رحمی سے آپ محفوظ ہوں گی۔ مجھے اپنی لونڈی کی طرح ذلیل کیجیے، مجھے ظاہری طور سے بھی مردانگی سے محروم کر دیجیے، مجھے زنانہ لباس پہنائیے، مجھے اپنے زیرِ جامے میں جکڑ دیجیے، مجھے میرے گناہوں کی سزا دیجیے، مجھے اپنی محبوبہ کے نرم ریشمیں کپڑوں میں ملبوس گرم گرم بدن کا تصور لرزادیتا ہے۔ میں عورت میں مردانگی کو دیکھ کر خوشی سے دیوانہ ہو جاتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ اپنی محبوبہ کو چُست ریشمیں جرابوں میں دیکھوں جو مرد پہنتے ہیں۔ میں یقیناً آؤں گا اور اپنی محبوبہ کے قدم چوموں گا۔“ آپ کا غلام

ایک ایذا طلب عذاب خانے کی نالکہ کو لکھتا ہے "۱۔ مجھے گھوڑے (عذاب دینے کا چوبنی آلہ) کے ساتھ زنجیروں میں جکڑ دیا جائے، زنجیریں میں خود لاؤں گا۔ ۲۔ اپنے خون کے پہلے قطرے کے لئے جو تم بباؤگی میں تمہیں ایک پونڈ دوں گا۔ ۳۔ تین پونڈ اگر میرا خون بہہ کر میرے ٹخنوں تک پہنچ جائے۔ ۴۔ چار پونڈ اگر میرے پاؤں کی اڑیاں خون سے تر ہو جائیں۔ ۵۔ پانچ پونڈ اگر میرا خون فرش پر بہہ نکلے۔ ۶۔ چھ پونڈ اگر تم مجھے مار مار کر بہوش کر دو۔“

عشقہ شاعری میں ایذا طلبی کا موضوع کثرت و تواتر سے ملتا ہے عشاق اپنے آپ کو اپنی محبوبہ کے سامنے حقیر و صغیر محسوس کرتے ہیں اور اُس کے ہاتھوں طرح طرح سے ذلیل ہو کر خوشی محسوس کرتے ہیں۔ میر تقی میر کے دیوان اس نوع کے اشعار سے بھرے پڑے ہیں۔

کیا کیا عجز کریں ہیں لیکن پیش نہیں کچھ جاتا میر  
سر گرہیں ہیں آنکھیں ملے ہیں اُس کے خلی پاہم  
جب دیکھتے ہیں پاؤں ہی دالو ہو اُس کے میر  
کیوں ہوتے ہو ذلیل تم اتنا تو مست دلو  
کیا بد بلا ہے لاگ بھی دل کی کہ میر جی  
دامن سوار لڑکوں کے ہو کر نذر ہے

**نرگسیت** <sup>۱</sup> یہ اصطلاح پی نیک نے یونان قدیم کے ایک ضمیماتی کردار نرسیس (نوفی) معنی ہے نرگس کا پھول کے نام پر وضع کی تھی نرسیس دریا کے دیوتا سمی سس کا بیٹا تھا اور نہایت حسین و جمیل تھا۔ ایک دن ایک جنگل میں سے گزرتے ہوئے وہاں کی ایک پری اکیو اُس پر پرفلیتہ ہو گئی اور والہانہ انداز میں اُس سے اظہار محبت کیا لیکن نرسیس جو اپنے حسن کے غرور میں مست تھا ملتفت نہ ہوا۔ اتنے میں اُسے پیاس لگی۔ وہ ایک چشمے کے کنارے جھک کر پانی پینے لگا تو پانی میں اپنے ہی عکس پر پرفلیتہ ہو گیا۔ وہ عرصے تک اپنے حسن کے نظارے میں محو رہے خود چشمے کے کنارے لیٹا رہا حتیٰ کہ دیوتاؤں نے اُسے نرگس کے پھول میں تبدیل کر دیا چنانچہ نرگس کا پھول یونانی اور ایرانی شاعری میں چشم حیراں کی علامت بن گیا جنسیات کی اصطلاح میں جو شخص اپنے ہی حسن و جمال پر عاشق ہو اُسے نرگسیت کا مرثیٰ سمجھا جاتا ہے۔ وہ اپنی ہی ذات سے جنسی حظ اخذ کرتا ہے۔ نرگسیت اتنا ہی کی صورت ہے جس میں جنسی حیلت مشمول ہے۔ ہیو بلاک ایس نے لکھا ہے <sup>۲</sup>

”سیجر کے خیال میں نرگسیت نادر ہے۔ صرف اس کی انتہائی صورت نفسیاتی علالت کی نشاندہی کرتی ہے۔ ہر شخص کسی نہ کسی حد تک اپنے آپ کو حسین سمجھتا ہے اور اپنی ذات سے پیاد کرتا ہے البتہ انانیت اور نرگسیت میں فرق کرنا ضروری ہے۔ موخر الذکر کا ماخذ اپنے ہی حسن کا مبالغہ آمیز احساس ہے۔ نرگسیت میں سچا نہ غنفر موجود ہوتا ہے۔“

جو شخص نرگسیت میں مبتلا ہو وہ نفسیاتی اور ذہنی لحاظ سے بالغ نہیں ہوتا۔ وہ ایک لاڈلے بچے کی طرح

ہر بات کو ذاتی نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ ہمیشہ اُس شخص کو پسند کرتا ہے جو ہر بات میں اُس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہے اور ہمہ وقت اُس کی تعریف پر کمر بستہ رہے اگر فن کارِ زرگیت میں مبتلا ہوتے ہیں اور اپنی تعریف سنتے سے کبھی زیر نہیں ہوتے بلکہ بعض اوقات خود اپنی مدح و ستائش کرنے لگتے ہیں۔ روبرو الکبریٰ کا ایک تمثیل نگار پلاس اپنے ایک ناکام مائلو گوریو کس میں ایک رئیس زادے کا ذکر کرتا ہے۔ جسے اپنے حسن پر بڑا ناز ہے اور جسے اُس کا ملازم بے وقوف بناتا رہتا ہے۔

”ملازم: کیا آپ نے اُن لڑکیوں کو دیکھا تھا جنہوں نے کل مجھے راستے میں روک لیا تھا؟ آقا: کیا کہتی تھی وہ؟“

ملازم: جب آپ گندے تودہ مجھ سے پوچھنے لگیں کیا یہ ایکلیس ہے جس نے دوبارہ جہنم لیا ہے؟ میں نے جواب دیا نہیں یہ اُس کے بھائی ہیں۔ پھر کہنے لگیں کیا خوبصورت جوان ہے، کتنا بارعب، کتنا شاندار! اس کے بال کیسے حسین ہیں۔ پھر مجھ سے کہا کہ آج بھی آپ کو اُسی راستے چلوں تاکہ وہ آپ کو ایک نظر دیکھ سکیں آقا: اُف خوبصورت ہونا بھی کیا مصیبت ہے!

واجد علی شاہ اپنی محبوبہ اکھیل علی سے فرمائش کرتے ہیں کہ اپنی داستانِ عشق کسی شاعر سے کہے اور پھر شہنوی کی صورت میں لکھوا کر انہیں بھیجے۔

”دیکھو تمہیں خدا کی قسم میری اس فرمائش کو بھول نہ جانا، حب الایام میرے عمل میں لانا کس واسطے کہ یہ شاعر نایاب ہے، دُرِ خوش آب ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ تمہارے عشق کا مزا اُس کی زبانی سنوں، وجد میں آکر مزا اٹھاؤں، سرِ دھنوں، کچھ بات نہیں کچھ ایسی بڑی کرامات نہیں، ہماری خوشی اُس کا کام ہوگا تمہارے عشق اور حسن کا تاقیامت نام ہوگا۔“

عورتوں کی زرگیت میں آئینے کو اہم مقام حاصل ہے۔ سمون دہوانے نوجوان لڑکیوں کی نفسیات سے لے تاریخِ ہند:

بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ خوبصورت لڑکیاں آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے حسن و جمال کے نظارے سے لطف اندوز ہوتی ہیں اور پہلو بدل بدل کر اپنے متناسب برہنہ جسم کو مختلف زاویوں سے دیکھ دیکھ کر پھولی نہیں سماتیں۔ آئندے تریدون لکھتا ہے۔

”جو عورت نرگیت میں مبتلا ہو اُس کا بہترین رفیق آئینہ ہوتا ہے۔ وہ قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر مختلف زاویوں سے اپنے جسم کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی ہیں اور اپنے عکس کو چومتی ہیں۔ کئی عورتیں اپنا عکس دیکھ کر باؤلز ملینہ کہتی ہیں ”اُف میں میں کبس قدر حسین ہوں!“ مادام متر و سکی کہا کرتی تھیں، میں خود اپنی دیوی ہوں، اپنے آپ کو پوجتی ہوں، اپنے آپ سے عشق کرتی ہوں۔ اس قسم کی عورتوں کو ایگزرس بننے کا شوق ہوتا ہے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بن سکیں۔“

ایک عرب شاعر الشنفری کہتا ہے۔

حَزَقْتُ وَجَلَّتْ وَابْكَمَتْ وَأَخْطَلَمْتُ      قَلَوُ حُتَيْنَ إِسْمَانٍ مِنَ الْحُسَيْنِ جُنَّتْ

(اُس کے ابرو، کمر اور ناک تپلی ہے، اُس کی دونوں پنڈلیاں اور گولے بڑے ہیں اور بال سیاہ ہیں۔ اگر کوئی انسان اپنے ہی حسن کی وجہ سے دیوانہ ہوا ہوتا تو یہ ہوتی)

نرگیت کا مریض کسی دوسرے شخص سے محبت کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ وہ اپنے آپ سے عشق کرتا ہے۔

”سوئے عشق غم کہاں ہے بزم گل      اپنے ہی حسن پر میں گریباں دریدہ ہوں

اس کے باوجود وہ ہر شخص سے توقع کرتا ہے کہ وہ اُس سے عشق کرے گا۔ اُسے دوسروں کی بے اعتنائی پر برا دکھ ہوتا ہے۔ واعبد علی شاہ لکھتے ہیں۔

”ان عورتوں کو اگر حضرت یوسف بھی مل جائیں تو اپنی بے وفائی کو نہ چھوڑیں، اس

لئے ان سے دور رہنا ہی مناسب ہے۔ مجھ جیسے بادشاہ ضرورت سیرت میں کیٹا

جس کی تعریف میں کتابیں لکھی گئیں ہیں باوجود ناز برداریوں کے کچھ خوف نہ کریں تو

دوسروں کے ساتھ کیا نہ کریں گی۔

صائب تبریزی نے نزگیت کے موضوع پر بے نظیر شعر کہا ہے۔

نمائشیت<sup>۱</sup> | تو بعد آئینہ از دیدن خود سیر نہ ای  
من بہ دو چشم ز دیدار تو چوں سیر شوم  
خود نمائی انسان کی معارف کمزوری ہے۔ سبھی لوگ اپنے جوہر اور خوبی کی نمائش کر کے خوش ہوتے ہیں اور اپنے کو دوسرے لوگوں سے مختلف اور ممتاز ثابت کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ جنسیات کی اصطلاح میں نمائشیت صنف مخالف کے سامنے ستر کھول کر جنسی خطا اٹھانے کا نام ہے یعنی ایسے مرد یا عورت کے سامنے ستر کھولنا جس کی طرف جنسی کشش محسوس ہو عورتیں برہنہ نہیں دکھاتی ہیں اور مرد ستر کھول دیتے ہیں۔ اس کی مشہور مثال روسو کے اعترافات میں ملتی ہے۔ روسو لکھتا ہے کہ اوائل شباب میں ایک دن وہ ایک کوچے سے گذر رہا تھا جس میں ایک کنواں تھا۔ نوجوان لڑکیاں پانی بھرنے کنویں پر آ رہی تھیں۔ روسو نے ایک طرف کھڑے ہو کر ان کے سامنے ستر کھول دیا۔ ان میں سے بعض نے شرما کر منہ پھیر لیا، بعض مسکرانے لگیں اور چند ایک بلند آواز میں اُسے گالیاں دینے لگیں۔ ان کا شور و غل سن کر ایک راگبیر ادھر متوجہ ہوا اور روسو کی جانب لپکا۔ روسو بھاگ نکلا مگر زبردست کاٹینا گامبر پکڑا گیا۔ روسو نے مکر کیا اور پاگل بن گیا جس پر راگبیر نے معذور سمجھ کر اُسے چھوڑ دیا۔ نمائشیت کی ایک صورت یہ ہے کہ بعض پڑھے لکھے لوگ اپنے خود نوشت سوانح حیات میں صاف گوئی کے نام پر اپنے حقیقی یا فرضی معاشقوں اور معاصی کا کھلے بندوں اعتراف کرتے ہیں اور اس پر فخر بھی کرتے ہیں کہ ج۔

باز می پوشند و ما بر آفتاب افکنند الم

فرزیک ہمیں کی خود نوشت سوانح غری اس کی مشہور مثال ہے۔

ہوس دید<sup>۲</sup> | یہ ایک خاص مردانہ انحراف ہے، عورتیں اس سے مبرا ہوتی ہیں۔ اس نوع کے مردانہ کار رفتہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو جنسی ملاپ کرتے دیکھ دیکھ کر غصہ

ہوا کرتے ہیں عام طور سے یہ لوگ کبھیوں سے معاملہ کر لیتے ہیں اور کسی آدمی کو معاوضہ دے کر کبھی کے پاس لے جاتے ہیں۔ اس انحراف کے نام مدارج کے لحاظ سے مختلف رکھے گئے ہیں چھپ لگ کر عورتوں کو کپڑے اتارتے ہوئے دیکھنا، دوسروں کو جنسی ملاپ کرتے ہوئے دیکھنا۔ ایسے لوگوں کو "جھانکنے والے ٹام" کہتے ہیں۔ نیلی فلمیں جن میں جنسی ملاپ کے مناظر دکھائے جاتے ہیں، موس وید کی تسفی کرنے کے لئے بنائی جاتی ہیں۔ ابتدائی صورت میں یہ شوق ہر مرد میں ہوتا ہے لیکن جب بوسہ دید ایک کوتاہ ہمت کے لئے جنسی ملاپ کا بدل بن جائے تو مر لیضا نہ صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ لوگ بے ضرر ہوتے ہیں۔

**جنسی عنفرت** یونان قدیم کی دیو مالا میں پہاڑوں، جنگلوں اور دریاؤں کے کناروں پر رہنے والی ایک عجیب و غریب مخلوق کو ساٹر کہتے تھے۔ ان کا بالائی دھڑ انسان کا اور نچلا دھڑ بکیر کا ہوتا تھا۔ یہ نہایت مغلوب الشہوت تھے اور ہر وقت جنگل کی دیمیں کے پیچھے مارے مارے پھرتے تھے چنانچہ جو شخص غیر معمولی قوت کا مالک اور مدد درجے مغلوب الشہوت ہو اُسے جنسی نفسیات کی زبان میں ساٹر کہتے ہیں جس کا ترجمہ ہم نے جنسی عنفرت کیا ہے۔ جنسی عنفرت مقاربت سے کبھی یہ نہیں ہوتا۔ انزال کے بعد بھی اُس کی توانائی بحال رہتی ہے۔ محرور المزاج عصمت بافتہ عورتیں ایسے مرد پر جان چڑھتی ہیں۔ جنسی عنفرت کی علامتیں میں گٹھا ہوا جسم، گردن بہت موٹی کندھوں میں جھسی ہوئی، پیشانی تنگ، قد کوتاہ، جسم پر بکثرت بال، کان ٹیکیلے، آواز گہری ہوتی ہے۔ یہ شخص عورت کی طرف گھور کر دیکھتا ہے جس سے وہ بے چین ہو جاتی ہے۔ جنسی جرائم کرنے والے اشخاص اکثر و بیشتر جنسی عنفرت ہوتے ہیں۔ ایسے مجرموں کو بعض مغربی ممالک میں آفتہ کر دیا جاتا ہے۔ جنسی عنفرت اپنی بیویوں کے لئے عذاب بن جاتے ہیں۔ شیخ نغز ادوی نے "زہرہ کی کہانی" میں ایک جنسی عنفرت میمون کا ذکر

۱ SCOPOPHILIA

۲ MIXOSCOPY

۳ SATYR, SATYR BYRONIC SATYRIASIS اس کیفیت مزاج کو  
کہتے ہیں۔ پروڈیٹ گلینڈ بڑھ جانے سے سخت خیزش ہو تو اسے PRIAPISM کہا جاتا ہے۔

آیا ہے جو صرف شہد، پایہ اور انڈا کھایا کرتا تھا۔ عرب غیر معمولی قوتِ رجولیت پر فخر کیا کرتے تھے۔  
فرزدق کہتا ہے۔

وَمِنَّا التَّمِيمِيُّ الَّذِي قَامَ آيِسُهُ ثَلَاثَتَيْنِ يَوْمًا ثُمَّ زَادَهُمْ عَشْرًا  
فاسفی برو نو چھے احتسابِ کلیسیا والوں نے آگ میں جھونک دیا تھا جنسی عجزیت تھا۔ وہ خود کہتا ہے  
” میرے اندر جنسی خواہش کی جڑ آگ بھڑکتی رہتی ہے اُسے کوہِ قاف کی ساری برف بھی  
مرد نہیں کر سکتی۔“

فلسفی ابن سینا اسی زمرے سے تعلق رکھتا ہے۔ اُس کا شاگرد ابو عبیدہ جو زبانی کلیم کے سوانح میں لکھتا ہے  
کہ وہ ساری عمر کثرتِ مقابرت کا عادی رہا حتیٰ کہ آخری عیالیت میں جب اُسے مرضِ الموت نے گھر  
لیا تھا وہ بلاناغہ لونڈیوں سے مقابرت کرتا رہا۔ کوئی پنجہ ہم شاہِ فرانس کی یہی حالت تھی۔ اُس کی  
حسین داشتہ مادام پچیے دو اُس کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کی تاب نہ لاسکی۔ کوئی نے اپنے غلام  
لا دال کو جو عورتیں فراہم کرنے پر مملوور تھا کہہ رکھا تھا ”عورت کوئی بھی ہو کیسی بھی ہو لے آیا کرو۔  
ہاں البتہ میرے پاس لانے سے پہلے اُسے حمام کرایا کرو اور دندان ساز کے پاس لے جایا کرو۔“ اسی  
نقطہ میں آتشک میں مبتلا ہو کر مر گیا۔ مشہور افسانہ نویس مویا ساں ایک جنسی عجزیت تھا۔ ایک دفعہ  
فلما برعنے اُس کے دعوے مانتے سے انکار کر دیا تو مویا ساں شواہد ساتھ لے کر قبۂ خلع گیا اور ایک  
گھنٹے میں پچھ بار مقابرت کر کے اپنا دعویٰ سچا کر دکھایا۔ وہ بھی آتشک کی موت مرا۔ مادہ منویہ کے  
بکثرت اخراج سے اُس کا ذہن ماؤف ہو گیا تھا۔ آج کل مغربی ممالک میں جنسی عجزیتوں کو اصلاح  
خانوں میں پابند کر دیا جاتا ہے تاکہ وہ جنسی جرائم کے ارتکاب سے باز رہیں۔

جنسی چڑیل | کہا جاتا ہے کہ ابو الہول — چہرہ عورت کا بدن شیر کا — اسی عورت کی  
علامت ہے۔ یونانی دیو مالا میں چشموں، باغوں اور درختوں کی دیسیوں کو  
نصف کہتے تھے جو دیوتاؤں اور انسانوں سے بے مجاہد اختلاط کیا کرتی تھیں۔ پولیسینز اپنے سفروں

کے دوران میں جینزیرہ اوگیا جا پہنچا جہاں ایک منف کیلکسو نامی رہتی تھی۔ اس کی یولیسز سے مدد بھیڑ ہوئی تو وہ بولی ”ہم ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں اور تعارف کے لئے خلوت میں چلیں“ وہ کئی برس اُس کے چنگل سے پھٹکارا نہ پاسکا۔ ہندو دیو مالا میں انہیں اپسرا کہتے ہیں جو اندر لوک میں رہتی ہیں اور دیوتاؤں اور گندھروں کا بھی بھلاتی ہیں۔ کبھی کبھار انہیں خطرناک تپسویوں کو بہکانے کے لئے زمین پر بھیج دیا جاتا ہے۔ ایک جنسی چڑیل کی علاقہ میں رافیس اور سرن غیر معمولی فریب، سینہ ابھرا ہوا، کمر موٹی، بازو نسبتاً ڈبلے، قد چھوٹا، پیشانی تنگ، کنپٹیوں پر گھنے بال، آنکھوں میں سرخ ڈورے، زساروں کی ہڈیاں قدرے ابھری ہوئی، گردن کوتاہ، ایک جگہ چین سے نہیں بیٹھ سکتی، ہر وقت پہلو بدلتی رہتی ہے، مردوں کے سامنے اُس کا رنگ بدلتا رہتا ہے اور اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اور گھور کر دیکھتی ہے، مقادبت سے کبھی سیر نہیں ہوتی۔ ایک عرب نے ایک عورت نہد نہت اٹس سے کہا

حَجَّتْ بَيْنَ فَخْزَيْكَ لَا تَمَلُ حَقْرُهَا وَلَا يُدِي لَهَا قَعْرُهَا

جنسی چڑیل اور ہرجائی عورت میں فرق کرنا ضروری ہے۔ ہرجائی عورت کئی مردوں کی مطلوبہ ہوتی ہے لیکن اپنے آپ کو کسی کے سپرد نہیں کرتی اور اپنے عشاق کو آپس میں لڑا کر خوش ہوتی ہے۔ جنسی چڑیلوں کو غلبہ شہوت کا جنوں پروردورہ پڑتا ہے تو وہ بے قابو ہو جاتی ہیں گستاخانے لکھا ہے کہ ولا دور باس کی نفع تھی جب اُسے دورہ پڑ جاتا تو وہ اپنے آپ کو ہر اُس مرد کے سپرد کرنے پر آمادہ کرتی تھی جو اُس کے سامنے آ جاتا تھا۔ اس حرکت کے باعث وہ رسوائے دہر تھی۔ شیخ لفزادی نے قضیہ نامی ایک جنسی چڑیل کا ذکر کیا ہے جس کے بڑھتے ہوئے مطالبات سے گھبرا کر اُس کا عاشق بھاگ گیا تھا اگسٹ سیز کی ایک بیٹی اور نواسی — دونوں کا نام جو یا تھا — جنسی چڑیل تھیں۔ مردوں کا انہو ہمیشہ اُن کے بلو میں رہتا تھا۔ اُن کی راتیں سنگامہ آرائی اور فحش و فجور میں گذرتی تھیں۔ ملکہ میا لینا جنسی چڑیل تھی۔ وہ راتوں کو بھیس بدل کر قجر خانوں میں جاتی اور جہاز رانوں سے تمتع کرتی تھی۔ یہی حال

کلیو پیٹرا ملکہ مصر اور نیرو کی ماں اگر پینا کا تھا۔ ندس کی ملکہ کھیرن اعظم جسے ایک موصیٰ کے بقول عشاق کی تعداد کے باعث 'اعظم' کہا گیا ہے ایک بدنام جنسی چڑیل تھی۔ اُس کے ۸۲ عشاق کا ذکر کتب تواریخ میں محفوظ ہے۔ اُس نے ان سب کو بیش بہا تحائف اور سیر حاصل باگریں عطا کی تھیں۔ ان میں اور لوف بھلی اُس کے خاص چیتے تھے۔ اُس کا آخری محبوب ایک نوجوان زلیون تھا۔ اس وقت ملکہ ساٹھ برس سے تجاوز کر چکی تھی بقول لارنس رانی جنڈان پنجاب کی میس لینا، تھی۔ اس کی جنسی بہمت نے سکھوں کی تباہی میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔

جنسی چڑیل شادی کے قابل نہیں ہوتیں مغربی ممالک میں انہیں نفسیاتی شفا خانوں میں رکھا جاتا ہے۔

یہ ترکیب ہیولاک ایلس نے لونی پیجہم کے ایک سفیر اور جاسوس شوپلر دایون کے نام پر وضع کی تھی۔ لونی پیجہم کے سوا کسی کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ

## ایونیت

شوپلر دایون دراصل ایک عورت ہے جو ہمیشہ مردانہ لباس پہنتی ہے۔ دایون نے میدان جنگ میں دائر شجاعت دے کر اپنی مردانگی، کالو ہا منوایا تھا۔ جنسیات کی اصطلاح میں ایونیت کا مطلب ہے عورت کا مردانہ لباس پہن کر اور مرد کا زنانہ لباس پہن کر جنسی حفظ محسوس کرنا۔ اس نوع کے لوگ ہم جنسی اور سوجا نہیں ہوتے۔ پی ٹو نے ان کی تین قسمیں لکئی ہیں ۱۰۔ مرد جو زنانہ لباس پہنتے ہیں ۲۔ عورتیں جو مردانہ لباس پہنتی ہیں۔ ۳۔ بالغ جو بچوں کا لباس پہنتے ہیں۔ ایونی لسا اوقات غیر معمولی ذہین اور تخلیقی قوتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ ناول نویس جارج سائ، جارج ایلیٹ، موسیقار واگنر اور کارل میر یا فان میر ایونی تھے۔ قیادہ روم کوڈس اور ہیاگوگا بولس برسر عام زنانہ لباس پہنتے تھے۔ یہی حال فلپ آرلنز، ایل گسٹ اور ڈیوک آؤسٹسکس کا تھا۔ اہتمش کی بیٹی مردانہ لباس پہن کر دربار میں آتی تھی۔ مہدی عباس کی بیٹی بالوقہ مردانہ لباس پہن کر اور ہتھیار سج کر گھوڑے پر سوار نکلتی تھی۔ سویدن کی ملکہ کرستینا سادی عمر مردانہ لباس پہنتی رہی۔ ہنری سوم شاہ فرانس زنانہ لباس پہنے کا شوقین تھا۔ بعض اوقات وہ بیش بہا زنانہ جوڑا پہنے، کانوں میں ہیروں کے آویسے، گلے میں موتیوں کا ہار، طلائی بازو بند پہنے ناچ کی مجالس میں آیا کرتا تھا۔ اس کے جلو میں بارہ خوبصورت جوان ہوتے تھے۔ ریختی گوشت سر

محکمہ لکھنؤی زنانہ لباس پہن کر مجالس مشاعرہ میں شرکت کرتا تھا۔ ریختی کو لکھنؤ کے زوال پذیر معاشرے کے زنانہ پن کی فنی علامت سمجھا جاسکتا ہے۔

یہ اصطلاح ہسپانیہ کے ایک رئیس کے نام سے یادگار ہے جو غرہر عورتوں کے تعاقب میں سرگرداں رہا۔ فرنیگ ایس کا پرلو ڈان یوان کی نفسیات سے بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

” خوبصورت لڑکے پر لڑکیوں کی نگاہیں اُس کے لڑکپن ہی میں پڑنے لگتی ہیں، اُس کے حسن کی تعریف کی جاتی ہے جس سے اُس کے ذہن میں یہ عقیدہ راسخ ہو جاتا ہے کہ اُس کی ذات عورتوں کے لئے بڑی پرکشش ہے۔ اس خیال کی تہ میں محض خود نمائی ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کا تعلق نفسیاتی عقیدے سے بھی ہے۔ وہ نوجوان جو ظاہری حسانت کے ساتھ قابلیت اور شہرت بھی رکھتا ہو ہر وقت عورتوں میں گھرا رہتا ہے جو اُس پر صدقہ قربان ہوتی رہتی ہیں۔ ان میں کنواریاں بھی ہوتی ہیں اور بیاتنا بھی۔ وہ اپنی بیوی کا وفادار ہو تو بھی اُسے اپنی ملاحتوں کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔ وہ شروع ہی سے اس بات کا عادی ہو چکا ہوتا ہے اُس نے شادی کے بعد بھی اُسے یہ ریت نبھانا پڑتی ہے۔ ڈان یوان کا بنیادی تصور یہی ہے۔ اُس کی ظاہری کشش اور اعتماد نفس میں ایک گہرا نقطہ مخفی ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنی ذات سے اُس کی محبت اس درجے راسخ ہو چکی ہوتی ہے کہ جب وہ خلوت میں کسی عورت کے پاس بیٹھا ہو تو بھی اپنی ذات کو بھلا نہیں سکتا۔ ک نوا کی قسم کے لوگوں کے سوانح سے پتہ چلتا ہے کہ ان لوگوں نے کئی معاشقے کئے، کئی شادیاں کیں کیوں کہ وہ ہر اُس عورت سے دور بھاگتے ہیں جس پر ان کی جنسی کوتاہ ہمتی منکشف ہو جاتی ہے۔ ڈان یوان ایک ایسا آدمی ہے جو کئی معاشقے کرنے کے بعد بھی بھرپور قوت رجولیت سے عادی ہوتا ہے۔“

ڈان یوان کی نفسیات کا مرکزی نقطہ یہی ہے کہ وہ فریق ثانی کی تسکین نہیں کر سکتا نہ خود بھرپور جنسی تشنگی

سے بہرہ مند ہونے کی اہلیت رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ نت نئی عورت کے پیچھے بھاگتا پھرتا ہے۔ ویانا کے ادیب الفرد ما لگر کے الفاظ میں ”اُس کے لئے ایک عورت بہت زیادہ اور بہت سی عورتیں بہت کم ہوتی ہیں۔“ وہ عورتوں کو یوں اکٹھا کرتا رہتا ہے جیسے کسی کو بکے جمع کرنے کا شوق ہو۔ یوکر کی تھیں ڈلن یوآن کا ہیرو کہتا ہے۔

”میرا دل دُنیا بھر کی عورتوں کی املاک ہے سب باری باری اسے اپنے پاس رکھ سکتی ہیں۔“  
 میری محض زندگی، کا مصنف حیرت سے کہتا ہے

”آخر کیا وجہ ہے کہ ایک ہزار عورتوں کے ساتھ خلوت میں جا کر بھی عیب کبھی میں کسی اجنبی عورت کو دیکھتا ہوں تو مجھے اُس میں بے پناہ کشش محسوس ہوتی ہے۔ میں بے اعتیاد اور بے بس ہو جاتا ہوں اور اُسے حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگتا ہوں ٹالں کہ میں جانتا ہوں کہ اُس سے متنع کرنے سے مجھے کوئی نیا تجربہ نہیں ہوگا۔“

جنسی نفسیات کی رُو سے اس کی توجہ یوں کی جائے گی کہ ایک تو اُسے اپنی قوتِ رجولیت پر اعتماد نہیں ہے لہذا اپنے احساسِ کمتری کی تلافی کرنے کے لئے وہ عورتوں کا تعاقب کرتا ہے دوسرے وہ ہر اجنبی عورت کو اپنے لئے ایک چلتا پھرتا چیلنج سمجھتا ہے اور سوچنے لگتا ہے کہ میں اس پر قابو نہ پاسکا تو میری بیٹی ہوگی تیسرے وہ ایک ہی عورت سے دوبارہ رُجوع نہیں لاتا کیوں کہ اُس عورت پر اُس کی کم ہمتی کا راز منکشف ہو چکا ہے اور اُسے شہ ہے کہ وہ اُسے حقارت کی نظر سے دیکھے گی چوتھے وہ لاشعوری جبر کا شکار ہے اور نت نئے معاشقے سے اپنی نرگسیت کا مداوا کرنا چاہتا ہے۔

ڈان یوآن عمر بھر اس فریب میں مبتلا رہتا ہے کہ ایک عورت دوسری عورت سے مختلف ہے وہ اپنی جوانمردی کی دھاک بٹھانے کے لئے عورتوں کے پیچھے پیچھے منڈلاتا رہتا ہے حالانکہ جو شخص ساری عمر عورتوں کے تعاقب میں بنا رہے وہ جوانمرد نہیں ہوتا بلکہ ایک قابلِ رحم احمق ہوتا ہے۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوگا کہ ڈان یوآن کو تاہم ہمت ہوتا ہے تو عورتیں پروانوں کی طرح کیوں اُس پر گر جاتی ہیں۔ اس کا جواب

یہ ہے کہ عورت مرد کی شہرت پر مبنی ہے۔ ڈان یوآن کی شہرت میں عورتوں کے لئے بے پناہ کشش ہوتی ہے۔ ہر عورت یہ چاہتی ہے کہ اُسے اپنی جانب مائل کر کے دوسری عورتوں پر اپنے حسن و جمال کی برتری کو ثابت کر دکھائے۔ یقیناً دورِ رانگ لکھتا ہے۔

”ایک نوخیز دو شیرازہ ڈان یوآن سے سخت متاثر ہوتی ہے۔ وہ روزِ خوابی میں دیکھتی ہے کہ اُس نے ایک ایسے ہرجائی، ہری چمک کو جو کسی دوسری عورت کے قابو میں نہ آسکا رام کر لیا ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ میں اس کی اصلاح کروں گی اور اُسے راہِ راست پر لے آؤں گی۔“

ڈان یوآن کی کشش کا راز اسی بات میں ہے کہ ہر عورت چاہتی ہے کہ میں اُس کی محبت کو جیت کر دوسری عورتوں پر اپنے حسن کی برتری کا ہلکا سا جھانکوں۔ کسی نے کہا ہے کہ عورت اور پولیس میں ایک بات مشترک ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ جہاں سب عورتیں ناکام ہو چکی ہیں وہاں میں کامیاب ہو جاؤں گی۔ لارڈ بائرن اپنے عہد کا معروف ڈان یوآن تھا۔ وہ شکایت کرتا تھا کہ ”میں آف ٹرائے کے بعد جس شخص کو سب سے زیادہ RAPE کیا گیا ہے وہ میں ہوں۔“ بعض مرد مثالی عورت کی تلاش میں رہتے ہیں حالانکہ اس کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ موباساں نے اس جتو کی ترجمانی بڑے خوبصورت انداز میں کی ہے۔ فرینک ہیرس لکھتا ہے

”موباساں نے مجھے بتایا کہ عورت کے تعاقب سے زیادہ دلچسپ اور کوئی تفریح نہیں ہے۔ میں صرف ’نامعلوم‘ عورت سے پیار کرتا ہوں جو میرے اپنے تخیل کی مخلوق ہے۔ وہ سراپا کشش ہے، اُس میں وہ تمام خوبیاں اور رعنائیاں موجود ہیں جو آج تک کسی بھی عورت میں دکھائی نہیں دیں۔ اُسے پالینے کی کوشش — یہی میری زندگی کی سب سے بڑی نہم ہے۔“

اس مقصد کے لئے ڈان یوآن عورتوں کے تعاقب میں سرگرداں رہتے ہیں، اگرچہ اس جتو میں وہ ہمیشہ

نا کام رہتے ہیں۔ تنوع کی یہ خواہش بالآخر میلان کی اور بے کیف بن کر رہ جاتی ہے اور لاشعوری جبر کی صورت اختیار کر جاتی ہے جس سے پھیپھا پھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔

**عشقِ محرمات** غاروں کا انسان وحوش کی طرح اپنی بیٹیوں اور بیٹیوں کو اپنے تصرف میں لاتا تھا۔ فرائڈ نے کہا ہے کہ اس زمانے میں بیٹیوں نے اتحاد کر کے اپنے باپ کو

قتل کر دیا اور احساسِ جرم کے تحت انہوں نے طوطم جانور (باپ کی علامت) کو جان سے مارنا اور ماؤں بیٹیوں سے جنسی ملاپ کرنا ممنوع قرار دیا۔ اُس کے خیال میں اس ممانعت یا طبعی اخلاق، معاشرتی تنظیم اور مذہب کو جنم دیا تھا۔ تمدن کے ارتقاء کے باوجود محرمات سے اختلاط کی روایت کہیں نہ کہیں باقی رہی۔ مصرِ قدیم اور ایرانِ قدیم میں سلاطین اور امراء اپنی بیٹیوں اور بیٹیوں سے نکاح کر لیتے تھے۔ ایشیائے کوچک کے ہاں محرمات یعنی ماں، بیٹی اور بہن کے ساتھ اختلاط باہر تھا۔ ہندوستان میں شکتی پوجا کے دوران میں محرماتِ باج ہو جاتی تھیں۔ نپولین نے اپنی بہن پالین سے معاشرہ کیا تھا۔ بائرن اپنی بہن اگستا سے عشق کرتا رہا۔ محرمات سے اختلاط کی روایت بلقان کی ریاستوں، جرمنی اور فرانس کے دیہات میں آج بھی کسی حد تک باقی ہے۔ اس نوع کے واقعات عام طور سے پردہِ خفا میں رہتے ہیں اور جرائم کی صورت ہی میں سامنے آتے ہیں۔

**جنسِ زدگی** بعض لوگ ہوا و ہوس کی زد میں بہہ کر جنسی خواہش کی تسکین ہی کو زندگی کا مقصد واحد سمجھ لیتے ہیں اور دن رات اسی فکر میں غلطی رہتے ہیں۔ میری محض زندگی، کا مصنف لکھتا ہے۔

”پندرہ ماہ تک میں نے اپنی بیوی پر قناعت کی۔ مجھے اُس سے بڑی محبت ہے، اُس کی خوشنودی کی خاطر جان بھی دے سکتا ہوں لیکن میرا مزاج ایسا ہوس پرست ہے کہ میں کتنی ہی کوشش کروں میں اپنی بیوی کا وفادار ہو کر نہیں رہ سکتا۔ میری تمام کوششیں رائیگاں جاتی ہیں اور میں تنوع کی خواہش پر قابو نہیں پاسکتا۔“

اموی دور کا شاعر عکرم بن ابی ربیع ہوا دسوس کا پتلا تھا اور پردہ شیش زکیوں کو اپنے شعروں میں رُکوا کیا کرتا تھا۔ وہ حج کرنے والی مستورات کے پیچھے پنجے بھاڑ کر پڑ جاتا اور انہیں پریشان کیا کرتا تھا۔ ایک عورت کے بارے میں کہتا ہے۔

أَلَا كَيْتَ أُمِّ الْفَضْلِ كَانَتْ قَرِيْنَتِي هُنَا أَوْ هُنَا فِي جَنَّتِي أَوْ جَهَنَّمِ  
(کاش کہ ام فضل کی صورت میں میری رفیقہ بن جائے، یہاں، وہاں، جنت میں یا جہنم میں)  
ایک اور عرب شاعر مسلم بن ولید الفصاری اپنے آپ کو فزنیہ صریح الفوانی (حسیناؤں کا دیوان) کہا کرتا تھا۔ مجرد مردوں اور کنوار یوں کی جنسی فاقہ زدگی بھی مرخصانہ صورت اختیار کر جاتی ہے۔ ایسی عورت جب کسی مرد سے بات کرتی ہے خواہ وہ بوڑھا ہو یا جوان ہو تو سوچنے لگتی ہے کہ یہ تو میرے دلچسپ ہے۔ اس نوع کی ایک عورت کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ رات کو سونے سے پہلے ہمیشہ اپنے پلنگ کے نیچے بھانک کر دیکھ لیتی تھی کہ کہیں کوئی مرد تو نیچے نہیں چھپا بیٹھا۔ اس تجسس کی تہ میں فی الحقیقت یہ لاشعوری تنہا کار فرما ہوتی تھی کہ کاش کوئی مرد میرے پلنگ کے نیچے چھپا ہوتا۔

**جنسی علامت پرستی** جنسی علامت پرستی میں انسانی خواہش اعضائے مخصوصہ سے منحرف ہو کر عورتوں کے لباس یا اعضا پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ یہ خاص مردانہ انحراف ہے جو عورتوں میں شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ اس نوع کے خطی عورتوں کی زلفوں، زیر جاموں، چولیوں، جوڑوں وغیرہ کو تپا کر انہیں سینت سینت کر رکھتے ہیں اور انہیں دیکھ دیکھ کر یا سونگھ سونگھ کر محفوظ ہوتے ہیں۔ انہیں جنسی ملاپ سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ ان کا ضبط زلف، زیر جامے، سرین، پھاتیوں کے اُچار، پاؤں، ٹخنوں یا گھائی سے مستغلا وابستہ ہو جاتا ہے۔ وہ چولی زیر جامے وغیرہ کو سینے سے لگاتے ہیں، چھتے ہیں اور اس طرح بسا اوقات منزل بھی ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کا ایک خطی زمانہ جوتوں کا پجاری تھا۔ وہ فحش خانے جا کر کسی خوبصورت کسی سے فرمائش کرتا کہ وہ اسے اپنے بوتے چاٹنے دے۔ اس کا وہ بھاری معاوضہ دیتا تھا اور بوتے چاٹ کر چپ چاپ چلا جاتا تھا۔ بعض لوگ عورت کے پاؤں چاٹ کر حفظ

اندون ہوتے ہیں۔ یہ انخواف اجتماعی صورت بھی اختیار کر لیتا ہے مثلاً انشلاخ متحدہ امریکہ میں عورت کی غیر معمولی اُبھری ہوئی چھاتیوں کی پرستش کی جاتی ہے۔ جین مینسفلڈ، انیٹا ایگرگ، صوفیہ لورین وغیرہ کی مقبولیت کا یہی راز ہے۔ عرب، ہندو، اطالوی، جرمن اور حبشی اُبھرے ہوئے بھاری بھرکم مٹروں پر جان چھڑکتے ہیں۔ قدیم چینی پاؤں کے خطنے تھے۔ لڑکیوں کے پاؤں چھپن ہی میں کس کس کر باندھ دیئے جاتے تھے۔ جوان ہونے پر ان کے پاؤں نٹے مٹے رہ جاتے چینی اس قسم کے پیروں کو سنہرا کنول، کہتے تھے اور ان کے نظارے سے از خود رفتہ ہو جاتے تھے۔ چینی عورتیں غیر مردوں کے سامنے پاؤں کھولنے میں اتنا ہی حجاب محسوس کرتی تھیں جتنا کہ دوسری اقوام کی عورتیں اپنی چھاتیاں دکھانے میں کرتی ہیں۔

**مردانہ عورت** | مرد میں زنانہ پن اور عورت میں مردانگی کا انکشاف پہلے پہل فلیس نے کیا تھا۔ اُس نے کہا کہ تمام عورتیں مرد دو جنسی ہوتے ہیں یعنی ہر مرد میں نسوانی اور ہر عورت میں مردانہ خصوصیت کسی نہ کسی حد تک موجود ہوتی ہے۔ شالی ناخ نے ثابت کیا کہ جنسی غدد ہارمون پیدا کرتے ہیں جو مردانگی یا نسوانیت کے ذمے دار ہیں۔ ہر مرد میں تھوڑی بہت مقدار میں زنانہ ہارمون اور ہر عورت میں کچھ نہ کچھ مردانہ ہارمون ہوتے ہیں۔ ان کے توازن و تناسب میں گڑبڑ ہو جائے تو مرد میں زنانہ پن اور عورت میں مردانگی کے آثار ظاہر ہو جاتے ہیں۔ ایک مردانہ عورت کسی زن کے کشادگی کے لئے منتخب کرتی ہے جس پر وہ پوری طرح حکومت کر سکے۔ مردانہ عورتیں تمام عورتوں سے متعلق وہی احساس رکھتی ہیں جو مرد عورت سے متعلق محسوس کرتا ہے۔ لہذا بانی عورت اسی نوع کی ہوتی ہے۔ مردانہ عورت کا قد کشیدہ، جسم غیر مناسب، ہاتھ پاؤں بڑے بڑے اور کھٹ، ٹانگیں اور بازو دُبے پتلے اور لمبے کہنوں اور گھٹنوں کے جوڑوں کی بڈیاں اُبھری ہوئی اور چھاتیاں سپاٹ ہوتی ہیں۔ وہ سگار پیتی ہیں، گھوڑے کی سواری اور شکار کی شوقین ہوتی ہیں اور مرد سے نفرت کرتی ہے۔ انگریزی کی ایک ضرب المثل ہے ”سیٹی بچانے والی عورت اور بانگ دینے والی مرغی، ہر پردہ لعنت“۔ میکسپیر کی ایک تھیل ٹرانس اور کرسٹا

کا ایک کردار پروکس کہتا ہے ”مردانہ عورت زلزلے مرد سے زیادہ قابلِ نفرت ہوتی ہے۔“ یہی خیال عورتوں کا زلزلے مردوں سے متعلق ہے۔

مردانہ عورت کی معروف مثال ملکہ کرسٹینا والی سویڈن تھی۔ کرسٹینا شاہ گسٹاوس اڈولفس کی بیٹی تھی۔ باپ کی موت کے بعد تخت نشین ہوئی۔ اُسے زیوروں سے نفرت تھی۔ وہ مردانہ لباس پہن کر مردانہ کھیلوں میں حصہ لیتی تھی اور سر پہ ٹیوڈا ڈڑاتے ہوئے پہلی گولی سے شکار مار لیتی تھی۔ اُسے شادی سے محنت نفرت تھی۔ وہ کہا کرتی تھی کہ جنسی مواصلت عورت کی غلامی کی علامت ہے۔ اُسے جملہ علوم و فنون پر عبور حاصل تھا اور وہ سائنس دانوں اور فلاسفہ سے حریفانہ مناظرے کیا کرتی تھی۔ وہ یونانی، لاطینی، عبرانی، عربی، جرمن فرانسیسی، اطالوی، ہسپانوی زبانیں بخوبی جانتی تھی۔ اُس نے مشہور فلسفی دے کارت کو اپنے یہاں بلا کر ٹھہرایا تھا۔ دے کارت اُس کا بڑا مددگار تھا۔ جب دے کارت نے اُسے بتایا کہ تمام حیوانات کلیں ہیں تو کرسٹینا نے کہا ”لیکن میں نے کبھی کسی گھڑی کو تو بچہ جتنے نہیں دیکھا۔“ اس جواب سے دے کارت کھسکا ہوا گیا۔ کرسٹینا کے اقوال اُس کی دانش کے سنگسہ نمونے ہیں مثلاً ”\_\_\_\_\_ کسی شخص کی اصیلت کو جان لینا گویا اُسے ناراض کر لینا ہے۔“

”\_\_\_\_\_ غیر معمولی جوہر یا خوبی ایک ایسا جرم ہے جسے کبھی معاف نہیں کیا جاتا۔“

اُس نے ۱۶۵۴ء میں تخت و تاج کو خیر باد کہا اور ڈنمارک چلی گئی۔

**زلزلے مرد** | ان مردوں کی آواز باریک، چہرہ گول، قریبانہ، ہاتھ پر چھوٹے چھوٹے اور گردن، بازو اور دل میں بھری بھری ہوتی ہیں، جسم کے زاویے گول ہوتے ہیں، جسم پر بال نہیں ہوتے، لبوں پر متغزل قسم کی مسکراہٹ کھینچی رہتی ہے، چہرہ تروتازہ ہوتا ہے، سگریٹ اور شراب نہیں پی سکتے، بیٹی نہیں بچا سکتے، مردانہ کھیلوں میں دلچسپی نہیں لیتے، کسی کو ڈانٹ نہیں سکتے، کوہے شکام نہ کر سکتے ہیں، مردانہ وضع کی عورتوں سے شادی کرنا پسند کرتے ہیں جو ان کے لئے ماں کی بدل بن جائیں، گھر گھسنے ہوتے ہیں، کھانے پکانے میں بیوی کا ہات بٹاتے ہیں، مردوں کی محفوں میں جانا پسند نہیں

کرتے، اُن کے جذبات غیر متوازن ہوتے ہیں، معمولی سی بات پر خوش ہو کر قبضے لگاتے ہیں اور خفیف سی نجش پر ٹسوئے بہانے لگتے ہیں، باتونی بغیس مزاج اور خوشامد پسند ہوتے ہیں، عملہ لباس پہنتے ہیں اور بھر پور کیلے رنگوں کے شیدائی ہوتے ہیں، فنونِ لطیفہ میں شغف رکھتے ہیں۔ ان کا ادبی ذوق نکھر ہوا ہوتا ہے۔ بعض زنانے مرد قبہ خانوں میں جا کر 'عاملہ' ہونے کا ڈسٹونگ رچاتے ہیں اور دروازہ میں تڑپ تڑپ کر یہ باور کرنا پسندتے ہیں کہ اُن کے ہاں بچہ پیدا ہونے والا ہے۔ آخر قبہ خانے والے اُن کی گود میں ایک گڑیا ڈال دیتے ہیں اور وہ مان لیتے ہیں کہ یہ اُن کا بچہ ہے۔ بہتری سوم شاہ فرانس اور امیر الدین حیدر دہلوی لکھنؤ اسی نوع کے نسخے تھے اور وضعِ محل کا ڈسٹونگ رچایا کرتے تھے۔

**جنسی غلامی** یہ ترکیب گرافٹ اینگ نے ۱۸۹۲ء میں وضع کی تھی۔ اس کا اطلاق ایسی عورت یا مرد پر ہوتا ہے جو فریقِ ثانی کے ہاتھوں میں کھنڈ پٹی بن کر رہ جائے۔ گرافٹ اینگ اس کی یہ توجیہ کرتا ہے کہ جنسی غلام یا جنسی لونڈی کی قوتِ ارادی کمزور ہوتی ہے جب کہ فریقِ ثانی مضبوط قوتِ ارادی کا مالک ہوتا ہے۔ عام طور سے جو مرد کسی عورت کی بھرپور جنسی تشفی کرتا ہے وہ اُس کی کیز بن جاتی ہے اور اُس کی خاطر ملک و مال، خویش و اقارب، عزت و وقار پر لات مار دیتی ہے۔ مارک انٹنی کلیو پیر کا جنسی غلام تھا۔ اُس نے کلیو پیر کی خاطر اپنا سب کچھ ٹا دیا۔ ایک ساتھی نے انٹنی کے بارے میں کہا تھا "دنیا کا تیرا ستون ایک کسی کا احمق شیدائی بن کر رہ گیا ہے۔"

جانِ عالم و اجد علی شاہ فرماتے ہیں۔

"میں رات رات بھر سر فراز پری کے پاؤں دبا کرتا، تمام دن اُسی کوتا کا کرتا، اگر وہ کوئی

معمولی سی چیز بھی کھاتے کھاتے مجھے دیتی میں بلا پس و پیش کھا لیتا تھا، جس طرف جاتی میں بھی اُسی طرف ہولیتا، اگر کہیں بیٹھتی تو میں کھڑا رہتا۔"

محمد شاہ دنگلا ایک بھکاری کی بیٹی کوئی کا غلام بن گیا۔ کوئی ایک بازاری عورت تھی جسے بادشاہ نے کوئی بادشاہ کا خطاب دیا اور اُمراء کو حکم دیا کہ اُس کے سامنے کورٹش بجالایا کریں۔ اس پر نظام الملک نے استعفیٰ دے دیا۔

کوئی اور اُس کے فرومایہ رشتہ دار سلطنت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے جس سے نظم و نسق تباہ ہو گیا۔ کوئی کا ایک آشنا عبد العقور جو لاہامن مانی کرنے لگا۔ وہ پالیکیوں میں سے دہنیوں کو بائبر نکال کر گھر سے جاتا تھا اور کسی کو اُننگی اٹھانے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ بادشاہ سلامت کوئی کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ اس قسم کے جانِ عالم اور رنگیلے بر قوم کے دورِ زوال میں پیدا ہوتے رہے ہیں۔ شیخ لغزادی نے ایک حکایت لکھی ہے جس میں ایک شخص ایک حسین و جمیل عورت سے پوچھتا ہے کہ تم خود تو چندے آفتاب چندے ماہتاب ہو لیکن تمہارا شوہر نہایت بد صورت ہے۔ تم اس کے ساتھ کیسے بسر کر رہی ہو۔ عورت نے جواب دیا تم نے میرے شوہر کو صرف ظاہر ہی کو دیکھا ہے اگر اُس کی مخفی خوبیاں تم پر آشکار ہو جاتیں تو پھر حیرت کا انہار نہ کرتے بلکہ میری خوش نصیبی پر رشک کرتے۔ رومۃ الکبریٰ کا عظیم ترین عشقہ شاعر مردِ پریس ایک رند سی سنتھیا پر جان چھڑکتا تھا۔ اُس نے اپنی محبوبہ کے حسن و جمال کی تعریف میں پرجوش نظمیں لکھیں اور اُن میں اپنی عاجزی اور غلامی کا انہار کیا۔ سنتھیا اُسے پتی تھی، دستکاری تھی اور بعض اوقات رانٹوں سے کاشتی تھی لیکن وہ اُس کے پاؤں پڑتا۔ ظاہر وہ اس رندی کا ہنسی غلام بن کر رہ گیا تھا۔

**عشقِ بے تاب** یہ ترکیبِ قبرص کے بادشاہ پگ میلیں کے نام سے یادگار ہے۔ وہ ایک ماہر سنگ تراش تھا۔ ایک دفعہ اُس نے بڑے ذوق و شوق سے ایک نسوانی مجسمہ

تراشا اور اُس پر عاشق ہو گیا۔ اُس نے جن کی دیوی افزودہ تھی سے دعا کی کہ وہ اس مجسمے کو زندہ کر دے و ماقبول ہوئی اور پگ میلیں نے اس مجسمہ سے بیاہ کر لیا۔ یہ انحرافِ بت پرست اقوام یونانیوں ہندوؤں اور رومیوں سے خاص ہے۔ چنانکہ نے اس کا ذکر کیا ہے اور دیویوں کے مجسموں سے عشق کرنے اور انہیں آلودہ کرنے کی سخت سزا تجویز کی ہے۔ ایٹھنز کے مشہور سنگ تراش پراکسیٹیلِس نے افزودہ تھی کا ایک نہایت حسین بت تراشا جس پر ایک نوجوان فریقہ ہو گیا۔ یہ نوجوان بہروں اُس کے سامنے بیٹھا آپس جرتا، آنسو بہاتا، والہانہ اُسے چومتا اور اُس کے گلے میں پھولوں کے ہار آویزاں کیا کرتا۔ مشہور شاعرہ میراں کرشن کی

مورتی پر دل و جان سے فدا تھی۔ وہ اُس کے سامنے کھڑی ہو کر پُر جوش بھجوں میں اُس سے اپنے پریم کا اظہار کیا کرتی اور اُسے رُجھانے کے لئے ناچا کرتی تھی۔ ایک روایت ہے کہ ایک دن کرشن کی مورتی شق ہو گئی اور میراں اُس میں سما گئی۔

**حیوانیت** حیوانات سے جنسی ملاپ کرنا ایک قدیم انحراف ہے جو آج بھی کہیں کہیں پایا جاتا ہے۔ بعض مرد گایوں، گدھیوں، کتوں اور بطنوں سے جنسی ملاپ کرتے ہوئے پکڑے گئے ہیں۔ اسی طرح عورتوں کی گدھوں، کتوں، بکھیوں اور بندروں سے جنسی ملاپ کی مثالیں موجود ہیں۔ انگریز عورتیں سدھائے ہوئے کتوں کے ساتھ جنسی ملاپ کرنے کے لئے رسوائے زمانہ ہیں۔ قدیم مصری اور ہندو مقدس گھوڑوں، میلوں اور بکروں کی زوجیت میں حسین عورتیں دیا کرتے تھے۔ دیناند نے لکھا ہے کہ برہمن گیارے کے مقدس گھوڑے کا جنسی ملاپ رانی سے کرایا کرتے تھے۔ یونانی دیو مالامیں ہے کہ دیوتا زئیس نے راج ہنس کا روپ دھار کر ایک دوشیزہ لیدا سے جنسی ملاپ کیا تھا۔ ایک نوجوان عورت پاسی فالی ایک بیل پر عاشق ہو گئی اور اُس سے ہم کنار ہوئی جس سے عنقریب مائٹو مار پیدا ہوا جس کا چہرہ مرد کا اور دھڑیل کا تھا۔ اس انحراف کا ذکر اقوام عالم کی داستانوں میں ملتا ہے الفیلو لید میں دردان قصاب کا قیسہ ہے جس میں ایک عورت ریچھ سے جنسی ملاپ کرتی ہے۔ مولانا روم نے ایک حکایت کینرک و خرمیں بیان کیا ہے کہ ایک کینرک نے گدھا سدھار رکھا تھا جس سے وہ جنسی ملاپ کیا کرتی تھی۔ لاطینی میں پولیس کے ہنرے گدھے کی مشہور کہانی میں بھی اس انحراف کا ذکر موجود ہے۔ دیوتا میں چوداسوں، گڈریلوں اور شتر بانوں یہ انحراف پایا جاتا ہے۔ ایک عرب شاعر نے فزاریوں کی جھو کرتے ہوئے کہا تھا۔

لاتامین فنوادیاخلوت بہ علی قومسک واکتہا باسیا

عہد نامہ قدیم کے باب خروج میں لکھا ہے ”جو کسی جانور سے مباشرت کرے وہ قطعی جان سے مارا جائے“ انگلستان کے عدالتی ریکارڈ میں ایسے مقدمات کی سلیس موجود ہیں جو مردوں عورتوں پر حیوانات سے جنسی

ملاپ کرنے کے جرم میں چلائے گئے تھے اور جن میں مجرموں کو حیوانات سمیت موت کی سزا دی گئی تھی۔ حیوانات پر یہ صریح ظلم تھا۔

**ہوس نگاری** <sup>۱</sup> اس انحراف کا تعلق نفسانی لذت کے بالواسطہ حصول سے ہے اور یہ خاص مردانہ انحراف ہے جس میں عورتیں مطلقاً دلچسپی نہیں لیتی۔ بعض لوگ آثارِ قدیمہ، بیتِ اطفال، ٹیلیفون کے کمروں، گاڑیوں کے ڈبلوں وغیرہ میں بخش کئے لکھتے رہتے ہیں اور اعصابِ نہانی کی تصاویر بناتے رہتے ہیں۔ انہیں اس خیال سے غلط محسوس ہوتا ہے کہ کوئی خوبصورت عورت انہیں دیکھے گی تو انہیں یاد کہے گی۔ یہ انحراف جنسی فاقہ زدگی کی دلیل ہے۔

**فحش گوئی** <sup>۲</sup> یہ بھی مردانہ انحراف ہے۔ ازکار رفتہ بڈے اور کوتاہ ہمت عیاش تسکینِ ہوس کے لئے فحش گالیاں بکتے رہتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ اعصابِ نہانی کے مختلف ناموں کی تکرار اور نئی نئی گالیوں کی اختراع ان کا محبوب مشغلہ بن جاتا ہے۔ میں ایک بڈے کو جانا ہوں جو صبح سویرے سربازار ایک دکان پر آ بیٹھتا۔ سکول جاتے ہوئے لڑکے اُس سے چہرہ چھاڑ کرستے تو وہ بے تحاشا گالیاں بکنے لگتا چھٹی کے وقت وہ پھر اُسی جگہ آکر بیٹھ جاتا۔ گھروں کو لوٹے محض لڑکے اُس پر آوازے کستے اور وہ گالیاں بک بک کر دل کی بھڑاس نکال دیتا تھا۔ اتوار کے دن چھٹی ہوتی تو وہ صحت بد مزہ ہو جاتا اور استادوں کو گالیوں کی بارش پر رکھ لیتا کہ چھٹی کیوں کر دی۔ اُس کی زندگی کی یہ واحد تفریح تھی۔

**لذتِ سرقت** <sup>۳</sup> یہ انحراف عورتوں سے خاص ہے جو دکانوں سے پھوٹی موٹی چیزیں چرا کر نفسانی حظ محسوس کرتی ہیں۔ اس نوع کے سرقت اور چوری میں فرق ہے۔ چوری محض مالی منفعت کی خاطر کی جاتی ہے جب کہ اس انحراف میں جنسی حظ بھی وابستہ ہوتا ہے۔ اوائلِ شباب میں لڑکیاں اس میں خاص دلچسپی لیتی ہیں۔ امیر گھرانوں کی عورتیں جو قیمتی سے قیمتی اشیاء خرید سکتی ہیں دو چار روپے کی چیز خریدنے میں باک محسوس نہیں کرتیں۔ وہ دکانوں سے چوری کرتے ہوئے

پکڑی جاتی میں تو لوگ حیران رہ جاتے ہیں کہ اس امیر عورت کو ایک معمولی چیز خریدنے کی کیا ضرورت تھی لیکن وہ نہیں جانتے کہ یہ محض چوری نہیں ہے بلکہ لاشعوری طور پر نفسانی لذت کے حصول کی کوشش بھی ہے۔

**عورت دشمنی** <sup>۱۷</sup> اکثر انحرافات کے مانند اس کی دوسورتیں ہیں ایک نادرل دوسری مرلیضانہ نادرل صورت یہ ہے کہ کوئی عورت کسی مرد کی صحبت کو ٹھکرا دے تو وہ عورت

ذات ہی کا دشمن بن جائے اور اس کی بے وفائی کا چرچا کرنے لگے۔ شوہنہار، مٹھے اور ہاپٹ مان بیسے عورت دشمن اسی زمرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مرلیضانہ صورت یہ ہے کہ بعض نوجوان اپنی ماں سے اتنی شدید جذباتی وابستگی رکھتے ہیں اور اس کا ایسا مثالیاتی تصور اپنے ذہن میں راسخ کر لیتے ہیں کہ کوئی بھی عورت اس پر لپڑی نہیں اتر سکتی اور وہ عورت ہی سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ اکثر تجربہ داری زمرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ جو مرد خلقی طور پر ہم جنسی ہوتے ہیں انہیں بھی عورت میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی۔ بعض تارک الدینا راسب اور بعض عورت سے نفرت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عورت شیطان کا آلہ کار ہے، غول بیابانی ہے جو طباہان حقیقت کو راہ راست سے ہٹا دیتی ہے۔ اس کی نذر میں جنسی فاقہ زدگی ہوتی ہے۔ یہ لوگ اپنی تند و تیز جنسی خواہش کو دبا کر جو اذیت محسوس کرتے ہیں اس کا انتقام عورت کی بُرائی کر کے لیتے ہیں۔

**جنسی پاجبی** <sup>۱۸</sup> یہ لوگ شائستہ انداز میں محبت کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ ان میں ایذا طلبی کا عنصر موجود ہوتا ہے اور وہ ذیل قسم کی عورتوں سے مقابرت کے آرزو مند ہوتے ہیں مثلاً بادمیر بد صورت جشنتوں اور گندی کبھیوں سے جنسی ملاپ کر کے محفوظ ہوا کرتا تھا۔

جب وہ مادام سباتے پر عاشق ہوا اور ایک مدت کی تگ و دو کے بعد حصول وصال میں کامیاب ہوا تو گھر آکر جھاگ گیا کیوں کہ وہ طبعاً صرف گندی کبھیوں ہی سے جنسی ملاپ کر سکتا تھا۔ مبارک شاہ غلی جنسی پاجبی تھا اور رذیل آبرو باختہ رندلیوں کا شیلڈی تھا۔ وہ زنانہ لباس پہن کر مجمع عام میں آتا اور رندلیوں کو محل ہزار ستون کے بالا خانے میں طلب کرتا۔ وہ اس کے اشارے پر معزز امراء کے سامنے مادر زاد

برہمنہ آتیں اور اُن پر پیشاب کرتی تھیں۔ یہ دیکھ دیکھ کر مبارک شاہ خوش ہوتا تھا۔ جہاں بادشاہ بھی جنسی پالی تھا۔ وہ ایک کسی لعل کنور پر فرشتہ تھا۔ دونوں شراب کے نشے میں دھند راتوں کو باہر نکل جاتے اور مادر زاد برہمنہ باولیوں میں پھلا گئیں لگایا کرتے تھے۔ رُوسو کا معاشرہ مادام دوآرنی سے ہوا جو عمر میں اُس سے کہیں بڑی تھی اور رُوسو اُسے اتنی کہا کرتا تھا۔ بعد میں رُوسو کو معلوم ہوا کہ مادام اپنے ایک نوکر کو بھی اپنی خلوت میں بٹاتی تھی۔ اس پر رُوسو تاؤ کھا گیا لیکن مادام نے یہ کہہ کر رُوسو کو مطمئن کر دیا کہ تم دونوں مجھ سے پیار کرتے ہو آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔ قیصر روم کلاڈیس، کالی گولا اور نیرو بدترین قسم کے جنسی پالی تھے۔ داغ دہلوی کی یہی حالت تھی۔ اُس کی ساری عمر کبیلوں اور گھکیوں کی صحبت میں گئی۔ وہ بڑھاپے میں بھی کبیلوں سے معاشرے کرتا رہا چنانچہ اُس کی غزل کی محبوبہ کسی ہی ہے۔

**دہن کاری** <sup>۱</sup> یہ انحراف آریائی اقوام سے خاص ہے۔ سامیوں، مغلوں اور حبشیوں میں اس کا کوئی کھوج نہیں ملتا۔ دہن کاری کا ثبوت یونان، روم اور ہندوستان کے قدیم زمانے کے نقوش سے ملتا ہے۔ پنڈت واتسیاں اُسے اپارثک کہتا ہے اور لکھتا ہے کہ راجاؤں کے محلوں میں لونڈیاں اور مجبر سے دہن کاری کرتے تھے۔ واتسیاں کے بقول شامستروں میں اس کی اجازت دی گئی ہے۔ البتہ برہمنوں اور منترپوں کو اس سے اجتناب مناسب ہے۔ عرب دہن کاری سے نفرت کرتے تھے۔ اُن کی گالی تھی اَمْعَصُ مِنْ ظِلِّ الْاَت۔ آج کل دہن کاری فرالسیوں کا قومی انحراف بن گئی ہے۔ فرانس کے قجر خانوں ہی میں نہیں بلکہ گھروں میں بھی اس کا رواج ہے۔

**اعادہ شباب** <sup>۲</sup> جن لوگوں کی زندگی کا واحد مقصد جنسی لذت کا حصول ہوتا ہے وہ شباب کو عمر کا بہترین دور سمجھتے ہیں اور انہیں بڑھاپے میں بھی دوبارہ جوان بننے کی آرزو ستاتی رہتی ہے۔ قدیم زمانے میں اعادہ شباب کے لئے لوگ جوان آدمیوں کا خون پیتے تھے اور عورتیں جوان لڑکیوں کے خون میں غسل کرتی تھیں۔ اس مقصد کے لئے عورتوں کا دودھ بھی پیا کرتے تھے۔ کیا کلب، رسائیں اور اکیر کے نشے اسی زمانے سے یادگار ہیں۔ نسخہ داؤد کی کا ذکر جنیت کی کتابوں میں کثرتاً آتا ہے۔

عہد نامہ قدیم میں لکھا ہے کہ جناب داؤد بڑے ہوئے تو جبار سے میں انہیں ٹھٹھوس ہوتی تھی اور نیند نہیں آتی تھی چنانچہ اُن کا نکاح ایک پُر شاب لڑکی ثونست ابی شاگ سے کیا گیا کہ اُن کی توانائی بحال ہو جائے۔ اسے نسخہ داؤدی کہا جاتا ہے۔ مشہور ہے کہ گلیڈسٹون نے اعادہ شباب کے لئے بہتر برس کی عمر میں ایک نوجوان کسی کیمقرین والرز سے معاشرہ کیا تھا۔ اعادہ شباب کے لئے مقوی باہ ادویہ کا ذکر تمام قوموں کی طبی کتب میں ملتا ہے۔ ہمارے ہاں اہل باء معجون فلک میر اور شہید بروش "بیسے مرگت" استعمال کرتے ہیں۔ ان میں عموماً چرس کی آمیزش ہوتی ہے اور جو سخت ضرر رساں ہوتی ہے مغرب میں بڑھاپے کے دفعیے کے طریقوں کی تحقیق شد و مد سے جاری ہے۔

بعض انحرافات شخصی قسم کے ہوتے ہیں جن کی تسکین کے سامان قبہ خانوں میں بہم پہنچائے جاتے ہیں مثلاً ایک جرمن افسر تھا جو ایک کسی سے کہا کرتا تھا کہ وہ برہنگی کے عالم میں اپنے بازوؤں میں پھولوں کے گلہ تھے لے کر کمرے کے چکر لگائے۔ وہ خود پرندہ بن کر اور ہوا میں اپنے بازوؤں لہرا لہرا کر ان پھولوں پر منڈلایا کرتا تھا۔ پیرس، لندن، برلن وغیرہ کے قبہ خانوں میں لوگ عجیب و غریب فرمائشیں لے کر آتے ہیں مثلاً کبھیوں سے کہتے ہیں کہ وہ رامبد کا لباس پہنے یا نرس کے کپڑے زیب تن کریں، اس کے بغیر وہ اُن سے متنع نہیں کر سکتے۔ قبہ خانوں کے مالک ہر قسم کے ملبوسات اور ساز و سامان تیار رکھتے ہیں تاکہ اپنے سر پرستوں کے عجیب و غریب مطالبات کی تسکین کر سکیں۔

انحرافات کے بارے میں جدید ترین نظریہ یہ ہے کہ ہر مرد و عورت میں جنسی انحراف کا میلان پایا جاتا ہے جو اُن کی شیر خوارگی کے دور سے یادگار ہوتا ہے۔ نامساعد حالات اور نفسیاتی الجھنوں کے باعث بعض لوگوں میں یہ میلان نمایاں ہو کر مرئیضانہ صورت اختیار کر جاتا ہے۔

## نئے جنسی زاویے

انیسویں صدی کے ادائل میں صنعتی انقلاب برپا ہوا جو انگلستان سے شروع ہو کر دوسرے مغربی ممالک میں پھیل گیا۔ سائنس کی ایجادات اور کموں کے استعمال نے صنعتی پیداوار کے طریقے بدل دیئے، شہروں میں بڑے بڑے کارخانے قائم کئے گئے اور دیہاتوں نے تلاش معاش میں بھوک در بھوک اُن کا رخ کیا۔ کارخانوں میں عورتیں مردوں کے درجہ بدوش کام کرنے لگیں جس سے اُن کے درمیان صنعتی مناسرت قائم ہو ہو گئی۔ اس آزادانہ میل ملاپ نے قدرتا اُن کے جنسی طرز عمل کو بھی متاثر کیا۔ رہا سہا حجاب و دعا مگر جنگوں نے ختم کر دیا اور لاکھوں مردوں عورتوں نے صدیوں کی روایتی اخلاقی بندشوں کو خیر باد کہا جو اُن کے آزادانہ اختلاط کی راہ میں حائل تھیں۔ صنعتی انقلاب کی اشاعت پر زرعی معاشرے کی سیاسی، معاشی اور تہذیبی قدیں بھی بدل گئیں، محنت کشوں نے سرمایہ داروں کے خلاف جدوجہد شروع کی عورت کی آزادی کی تحریک شروع ہوئی اور وہ دکتوریہ کے عہد کی پابندیوں کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس طرح صنعتی انقلاب کے ساتھ ساتھ جنسی انقلاب بھی پروان چڑھنے لگا۔ علم الحیات، علم الانسان اور جنسی نفسیات کے انکشافات نے جنسی علانیہ پر گہرے اثرات ثبت کئے۔ جنسیات کو ایک مستقل شعبہ علم کا درجہ مل گیا۔ کرائٹ ایننگ، ہرش فیلڈ، رچرڈ برٹن، الرٹس، میوٹاک ایس ویزہ کی تحقیقات نے انسانی زندگی کے چھپے ہوئے گوشے بے نقاب کئے۔ یونانیوں، رومیوں، چینیوں ہندیوں اور عربوں کے جنسیاتی ادب کو مغربی زبانوں میں منتقل کیا گیا۔ جنسی عوارض کے علاج کے لئے شفاخانے کھولے گئے اور جنسی کج رویوں کی تحقیق کے لئے مستقل ادارے وجود میں آئے۔ بچوں کی جنسی تعلیم کے لئے نصاب ترتیب کئے گئے اور جنسی مسائل پر کھلم کھلا بحث ہونے لگی۔ شادی، طلاق، عصمت فروشی، ہم جنسیت اور خود لذتی وغیرہ موضوعات پر پہلے شمار کتابیں لکھی گئیں۔ ارباب اصلاح لوگوں اور لوکیوں کی جنسی رہنمائی پر کمر بستہ ہوئے۔ اس مقصد کے لئے

فلوں سے بھی کام لیا گیا۔ ناول اور شاعری میں جنسی وصف نگاری نے بار پایا اور دہائیوں کے ادبی فنکاروں نے جنسی نعرے کے مصنوعی آلات اور مسک و مہی روایتیں برسرِ عام فروخت ہونے لگیں، ضبطِ تولید کی نئی نئی تدبیریں اختیار کی گئیں۔ غیر شادی شدہ ماؤں اور اُن کے بچوں کے تحفظ کے لئے تحریک شروع ہوئی۔ جنسی آزادی کے حق میں مستقل فلسفے مرتب کئے گئے اور جنسیات کے بارے میں اہل مغرب کے نئے خیالات اور افکار مشرقی ممالک میں بھی نفوذ کرنے لگے۔ جنسی انقلاب کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے سے پہلے ہم چند اہل نظر کے خیالات اور اُن کے اثرات کا مختصر اُذکر کریں گے۔

کرافٹ اینگ نے جنسی کج رویوں کا مطالعہ جدید سائنس کی روشنی میں کیا اور کہا کہ جو اشخاص جنسی کج روی میں مبتلا ہوتے ہیں وہ لعنِ طعن کے مستوجب نہیں ہوتے بلکہ ہمدردی کے مستحق ہوتے ہیں۔ اُس کے خیال کے مطابق بعض اوقات جنس میں ایسی عضویاتی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں جن کے باعث کج خلقی طور پر کج روی ہو جاتا ہے مثلاً جنسی نظام میں گڑبڑ ہو جانے کے باعث بعض عورتوں میں مردانہ غصہ نمایاں ہو جاتا ہے اور بعض مردوں میں زنانہ پن آ جاتا ہے چنانچہ اُن کی طبعِ فطری وضع کے جنسی ملاپ سے ایسا کرتی ہیں اور جنسی تسخیر کے لئے دوسری راہیں تلاش کرتی ہیں۔ الرنس نے ہم جنسیت کو خصوصی تحقیق کا موضوع بنایا اور یہ ثابت کیا کہ جو عورتیں مرد صنفِ مخالف کی بجائے اپنے ہی جنسوں سے رجوع لاتے ہیں۔ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہوتا کیوں کہ عضویاتی نشوونما میں خلل آ جانے کے باعث وہ طبعی جنسی ملاپ میں کوئی رغبت محسوس نہیں کرتے۔ ہر شفیق نے جنسی کج روی پر تحقیق کرتے ہوئے کہا کہ جو لوگ خلقی طور پر جنسی وظیفہ ادا کرنے سے معذور ہوں اُن سے نفرت کرنے کا حق نہیں ہے نہایت بہتر ہوگا کہ معاشرہ اُن سے تعرض نہ کرے اور انہیں اپنے حال پر چھوڑ دے۔ ان خیالات کی اشاعت کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ اطالیہ اور انگلستان کے ضابطہ فوجداری میں ترمیم کر لی گئی۔ چنانچہ ان ممالک میں مرد ویت کو جرم نہیں سمجھا جاتا بشرطیکہ فریقین کی رضامندی مشمول ہو۔ آج کل امریکہ اور یورپ کے ممالک میں مرد ویت اور مردوں کے اپنے کلب ہیں، اپنی رقص گاہیں ہیں، اپنی فنی دادی مجالس ہیں جن میں کوئی دوسرا شخص بار نہیں پاسکتا۔ عورتوں کو بھی لڑبا لڑبا تعلق کی آزادی ہے۔ مردانہ طبع عورتیں اپنی دوگانہ سے بر ملا مل کر

رہتی ہیں۔ اُن کے معاشقوں میں اُسی جوشِ عشق، سوزِ فراق اور ذوقِ وصال کا اظہار کیا جاتا ہے جو عشاق سے خاص ہے۔ بکرو مردِ عورتوں کے لئے نئے نئے آلات بنائے گئے ہیں جو ڈنارک، سویڈن، مغربی جرمنی اور فرانس کے بازاروں میں برسرِ عام فروخت ہوتے ہیں۔ بکروؤں کی تسکین پوس کے لئے خاص قسم کی نلیں بنائی جاتی ہیں جن کی نالیں پر کوئی قدغن نہیں ہے کیوں کہ مغربی معاشرے میں عام آدمی کی طرح بکروؤں کی جنسی تسکین کا حق بھی تسلیم کر لیا گیا ہے۔

فرائڈ جنسی آزادی کا مشہور نقیب ہے جس کے نظریہ تحلیس نفسی کو ہمہ جنسی کہا جاتا ہے۔ ابتداء میں اُس نے شہوانی آرزو کو بے بائد و کا نام دیا تھا لیکن اواخر عمر میں اسے اپراپس کہنے لگا جسے وہ مسرت طلبی کی ایسی حیات بخش تناظر قرار دیتا ہے جو انسانی زندگی کے ہر پہلو پر محیط ہے۔ اُس کے خیال میں حظ اندوزی ہی اعلیٰ انسانی کا بنیادی محرک ہے۔ ہسٹریا کے بارے میں تحقیق کرتے ہوئے فرائڈ کے استاد ڈاکٹر شارکونے کہا تھا کہ ہسٹریا کی تہ میں جنسی جذبے کی ناک خودگی کا درنا ہوتی ہے۔ فرائڈ نے تحقیق کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ شیرِ خوار بچہ بھی شہوانی خواہش رکھتا ہے اور خود لذتی سے اس کی تسکین کرتا کر لیتا ہے۔ ماں باپ اُس کی خود لذتی میں مانع ہوں تو وہ اپنی شہوانی خواہش کو دبا دیتا ہے۔ یہ دباؤ مرضِ اضطرابِ صورت اختیار کر جائے تو وہ مرق، مایوگلیا، آشولس اور عصبی المزاجی کے عوارض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس سے فرائڈ نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ فرد شہوانی جذبے کی آزادانہ بھرپور تسکین کر کے ہی ذہنی صحت مند اور قلبی مسرت سے بہرہ یاب ہوتا ہے۔ اہل مغرب نے فرائڈ کے اس نظریے کا نہایت گرم جوشی سے خیر مقدم کیا اور پورے انہماک سے اُس کی ہدایات پر عمل کرنے لگے چنانچہ آج کل امریکہ اور یورپی ملک میں نوجوان لڑکے لڑکیاں بلا تکلف ایک دوسرے سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ جنسی جبلت کے اظہار کے لئے LIBIDO یہ لفظ لاطینی زبان کا ہے۔ سنسکرت میں لبھاسی، جرمن میں LIEB، انگریزی

میں LOVE، ہندی میں لوبھ۔

لے لفظ ہسٹریا کا مادہ یونانی زبان کا لفظ ہسٹریا ہے جس کا معنی ہے فمِ رحم۔ لفظ نے کہا تھا کہ جس عورت کا فمِ رحم قصب کے لٹس سے محروم رہے اُس کے ذہن اور جسم میں خلل واقع ہو جاتا ہے۔

ساتھ جرم اور گناہ کے جو احساسات وابستہ تھے اُن کا تعریف ٹوٹ چکا ہے۔ اب بکارت اخلاقی مسئلہ نہیں رہی محض شخصی اور جسمانی مسئلہ بن کر رہ گئی ہے۔ لڑکیاں ازالہ بکارت کو بلوغت کی اولین شرط سمجھنے لگی ہیں اور پہلے موقع پر اس سے چھٹکارا پالیتی ہیں۔ جاپان میں کسی آزاد مشرب لڑکی کی شادی قدامت پسند نوجوان سے طے پا جائے تو وہ میں پونڈ دے کر ڈاکٹر سے پلاسٹک کا پردہ بکارت لگوا لیتی ہے۔ مغرب میں دو لہا باکرہ دلہن کی بہ نسبت مستعدہ کو زیادہ قدر و قیمت کی نگاہ سے دیکھتا ہے کیوں کہ وہ تجربہ کار ہوتی ہے۔ دوشیزگی کی اسمیت کے ختم ہو جانے سے شبِ عروسی میں کوئی محسوس باقی نہیں رہی۔ پنجابی دیہات کا ایک لطیفہ ہے کہ ایک مُصلن کا میاں ہوا۔ شبِ عروسی کی صبح کو اُس کی سہیلیاں اُس کے پاس آئیں اور شبِ رفتہ کا حال پوچھا۔ دلہن بولی ”ایہہ ہوندے دیاہ! ایہہ جیسے دیاہ تے میں کئی واری جٹاں دیاں کھریاں وچ کیتے ہوئے نیں“ یہی حال آج کل کی مغربی لڑکی کا ہے۔

امریکہ اور یورپ کی نئی نسل کا عقیدہ یہ ہے کہ بھوک پیاس اور شہوانی خواہش میں کچھ بھی فرق نہیں ہے۔ بھوک پیاس لگنے پر آدمی کھانے پینے میں کچھ باک محسوس نہیں کرتا۔ اسی طرح جنسی خواہش کی فوری تسکین میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہونا چاہیے۔ ایک لڑکی نے کہا ”جنسی ملاپ ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ اچھا کھانا“ ضبطِ تولید کے جدید ترین طریقوں نے حمل کا وہ خوف ختم کر دیا ہے جو ۱۹ ویں صدی کی دوشیزہ کو لاحق رہتا تھا۔ مغربی لڑکیاں اپنے مینڈیگ میں مانع حمل گولیاں، کونڈم اور پیسیریاں رکھتی ہیں تاکہ ضرورت پیش آنے پر تردد نہ کرنا پڑے۔ بیٹی، شہتی لڑکے لڑکیاں بر ملا بغیر نکاح کے مل کر رہتے ہیں۔ ایک بیٹی لڑکی کو ایک سے زیادہ لڑکوں کی داشتہ بن کر رہنے میں کوئی باک محسوس نہیں ہوتا۔ مغرب کے تنزل پذیر معاشرے کی بدر رو کے یہ کیرے ایشیا اور افریقہ کے ممالک میں بھی گندگی پھیلا رہے ہیں۔ لغسانی خواہش کی تسکین کے لئے اب خلوتِ صحیحہ یا خانہ بے تلویش کی بھی چنداں ضرورت نہیں رہی۔ نوجوان ایک دوسرے کے سامنے اختلاط کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ آج کل شرم و حیا کو روایتِ تاریخی لے کونڈم کی ایجاد چارلس دوم کے عہد میں کونل کونڈم نے آتشک سے بچنے کے لئے کی تھی۔

سمجھا جاتا ہے۔ عیسو دور رنگ لکھتا ہے کہ ایک دفعہ ایک مرد نے ایک عورت سے اظہارِ محبت کیا۔ عورت نے اُسے اپنے گھر آنے کی دعوت دی جب وہ اُس کے کمرے میں داخل ہوا تو عورت بولی "وقت ضائع نہ کرو آؤ خواب گاہ میں چلیں۔" یہ سن کر مرد بھونچکا رہ گیا اور گھبرا کر بھاگ گیا۔ یورپ میں ساحلِ سمندر کی تفریح گاہیں جنسی بے راہ روی کے اڑے بن گئی ہیں جہاں عورتیں مرد بے محابا SUN, SAND, SEX سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

جنسی آزادی نے روایتی قسم کے رومانی عشق کا خاتمہ کر دیا ہے عشق کو ایک فرمودہ روایت سمجھا جاتا ہے۔ فرائد کہتا ہے کہ عشق نفسانی خواہش کی منحرف مریضانہ صورت ہے یعنی عکس کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔ اس خلل دماغ سے بچنے کے لئے نوجوان عشق و محبت کا روگ نہیں پالتے اور میکانکی انداز میں اپنی یوس کی تسکین کر لیتے ہیں۔ مغرب کے شہروں میں اباحت نسواں کا چرچا ہے، عورت کی تیز اُصتی جا رہی ہے۔ ایسے شخص سے قوتض کرنا جو بر ملا کسی کی یوسی سے اظہارِ عشق کرے بد مذاقی خیال کیا جاتا ہے۔ شوہر اپنی یوسی کے عاشق سے نہایت خوش اخلاقی سے پیش آتا ہے۔ نئے سال کے ہتوار پر عورتیں مرد ساری رات شراب کے نشے میں دھت دیوانہ وار ناچتے ہیں اور اس کے دوران میں بے محابا ایک دوسرے سے مُمتنع ہوتے ہیں۔ باغوں کے کنوئیں میں ہفتے کی رات خاص ہو سے دادِ عیش دی جاتی ہے۔ اگلی صبح کو ہر طرف کوندم اور پیسریاں بکھری دکھائی دیتی ہیں۔ عیسائی مذہب کے زوال کے ساتھ یونان اور روم کی قدیم جنسی بے راہ روی عود کر آئی ہے۔

ایک جرمن عالم و تسلیم رائج نے جنسی آزادی کا طبی جواز پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ جملہ ذہنی و جسمانی عوارض اور معاشرتی الجھنیں جنسی جذبے کی ناسودگی کے نتائج ہیں۔ اُس کے خیال میں مرد و عورتوں کو نفسانی خواہش کے اظہار بے محابا اور بھرپور حفظِ اندوزی کے مواقع دیئے جائیں تو نہ صرف وہ سچی خوشی سے ہم کنار ہوں گے بلکہ جملہ معاشرتی عقدے بھی از خود حل ہو جائیں گے۔ سویڈن کے

لے اے جدید PAGANISM کہا جاتا ہے۔ PSYCHOLOGY OF HUMAN RELATIONS  
لے THE FUNCTION OF THE ORGASM

ایک عالم ڈاکٹر لارس آکرسٹم نے بھی نفسانی خواہش کی آزادانہ تشفی کو نفسیاتی اُلجھنوں اور شخصی پریشانیوں کا موثر علاج بتایا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قبر خانوں کا انتظام خود مملکت کے ہاتھوں میں ہونا چاہیے تاکہ بغیر کسی معاوضے کے ہر شخص اپنی جنسی تسکین کر سکے۔ اُس کے خیال میں انڈھوں، نوئے ٹنگڑوں، کبڑے، بونوں، قیدیوں اور مریضوں کی جنسی تشفی کا سامان کرنا مملکت کی ذمہ داری ہے۔ آزادانہ معاشرے کے مخالفوں کو آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے سی، ای، ایم جوڈ لکھتا ہے کہ

”جنسی خواہش کو پرہیزگار لوگ نفرت کی نگاہ سے دیکھتے رہے ہیں اور ضبطِ تولید کی مخالفت بھی کرتے رہے ہیں۔ غریبہ مرد، بیوہ عورتیں، بوڑھی کنواریاں، ازکار فرستہ بد صورت، بد وضع لوگ جو خود جنسی حظ سے بہرہ ور نہیں ہو سکتے اسے بدکاری اور جیاسوزی کہہ کر اس کے خلاف شور و غل مچا رہے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ خوبصورت نوجوان لڑکے لڑکیاں اُس جنسی حظ سے فیض یاب ہوں جس سے وہ خود محروم ہیں یہی وہ لوگ ہیں جو رائے عامہ تشکیل کرتے ہیں۔“

۱۹ ویں صدی کے اواخر تک عورت سیاسی اور معاشرتی مساوات کا مطالبہ کرتی رہی۔ اب وہ جنسی آزادی میں مرد کے مساوی حقوق طلب کرتی ہے۔ برٹنڈر مل نے جنسی رجحانات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں

”ماضی میں عورتوں کے باعصمت ہونے کے دو اسباب تھے، نارِ جنیم کا خوف اور حمل کا ڈر۔ پہلا خوف مذہب کے ساتھ ختم ہو گیا ہے، دوسرے خوف کا ضبطِ تولید نے ازالہ کر دیا ہے۔ بعض عورتیں رسم و ریت یا ذہنی تساہل کے باعث عصمت و عفت کے تحفظ میں کوشاں رہی ہیں لیکن جنگِ عظیم کے اثرات نے سب روکاؤں کو زمین بوس کر دیا ہے۔ عورتوں کی رہنما خواتین آج سے تیس برس پہلے کی رہنماؤں کی طرح مردوں کو نیک بنانے کا تردد نہیں کرتیں۔ اُن کا اِدعا یہ ہے کہ جس بات کی اجازت مردوں کو حاصل ہے عورتیں بھی اُس کی حقدار ہیں۔ اُن کی پیش رو خواتین اخلاقی

ہندش میں مساوات کا مطالبہ کرتی تھیں آج کل کی عورتیں اخلاقی آزادی میں برابری کا مطالبہ کرتی ہیں۔

اصلاح متحدہ امریکہ میں کئے اور ہند سے کی "نوجوانوں کی بغاوت" اور "رفاقت کی شادی" میں کج سے کم و بیش تیس برس قبل کے جنسی مسائل کا تجزیہ کیا گیا تھا اور اعداد و شمار فراہم کئے گئے تھے۔ ہند سے نے کہا کہ نئی نسل کے جوانوں میں ہمارے توہمات، طبع، ریاکاری اور عدم رواداری کے خلاف بغاوت کا رجحان نیزی سے بڑھ رہا ہے۔ بقول اُس کے ایک ہائی سکول کی ۹۵ طالبات جو جنسی ملاپ کا تجربہ کر چکی تھیں مثنوی کے لئے اُس کے پاس آئیں، ان میں ۲۵ حاملہ تھیں۔ اُس کے شاہدے کی رو سے ہائی سکول کی نوٹے فی صد لڑکیاں لڑکے جنسی ملاپ سے آشنا ہوتے ہیں اور ان کی باتوں سے نئے جنسی اخلاق کا علم ہوتا ہے۔ ایک نوجوان لڑکی ہیلن نے دوران گفتگو میں ہند سے سے کہا کہ وہ پال بیوی جو ایک دوسرے سے بچا پیدا نہیں کرتے ان مردوں اور عورتوں کی نسبت زیادہ بد اخلاقی کی زندگی گزارتے ہیں جو بغیر نکاح کے مل کر رہتے ہیں لیکن ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ اُس نے کہا کہ محبت کے بغیر شادی شدہ زندگی ایک قسم کی عصمت فروشی ہے۔ اس میں بیوی قبضہ بن کر رہ جاتی ہے جو مالی مفاد کی خاطر ایسے شوہر کے پاس غلوت میں جاتی ہے جس سے وہ نفرت کر رہی ہوتی ہے۔ ہیلن اور اُس کی ہم فوار لڑکیوں کا کہنا ہے کہ مرد عورت کا باہم محبت سے مل کر رہنا ہی شادی ہے خواہ ان کا نکاح ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ جب ان کی محبت سرد مہری میں بدل جائے تو انہیں فی الفور جدا ہو جانا چاہیے۔ اس تعلق کے دوران میں ضبط تولید سے کام لینا ضروری ہے تاکہ بچے پیدا ہو کر اُلٹھنوں کا باعث نہ ہوں۔ کئے اور ہند سے کے بقول نئے زمانے کا نوجوان جنس کو ایک حیاتیاتی ضرورت سمجھتا ہے جیسا کہ مثلاً بھوک یا پیاس نہ قانون کے مطابق ہوتی ہے اور نہ قانون کے منافی ہوتی ہے، نہ اسے اخلاقی کہا جاسکتا ہے اور نہ غیر اخلاقی۔ اسی طرح شہوانی خواہش بھی قانون اور اخلاق کی پابند نہیں ہے۔ ان حقائق جنسیات کا کہنا ہے کہ امریکہ کے نوجوان مردوں اور عورتوں میں شادی سے گریز کرنے کا رجحان روز افزوں ہے۔ صرف نیویارک میں پچاس ہزار لڑکیاں اپنے

عشاق کے ساتھ بغیر نکاح کے رہتی ہیں کیوں کہ وہ شادی اور بچوں کی پرورش کی ذمہ داری کو قبول نہیں کرتیں۔ امریکہ میں ہر سال کئی لاکھ بچے اسقاطِ حمل کا شکار ہو جاتے ہیں۔ سکولوں اور کالجوں کی لڑکیاں ٹیسے ذوق و شوق سے گردن آویڑتی اور ہتھ پھرتی میں حصہ لیتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی جنسی ملاپ سے بھی گریز نہیں کرتیں۔ موٹر کاروں کی کڑت نے جنسی تعلق کو سہل بنا دیا ہے۔ جس لڑکی کو لڑکوں کی خواہش سے سیر و تفریح کی دعوت نہ ملے اُس کے والدین اپنی بیٹی کے بارے میں مشورے ہو جاتے ہیں کہ شاید اس کی ذات میں کوئی عیب ہے۔ امریکہ کے ایرگھراؤن میں ایک مکہ بطور 'خلوت گاہ' کے الگ سجایا جاتا ہے تاکہ گھر کی لڑکی اپنے کسی دوست لڑکے کے ساتھ خلوت میں جانا چاہے تو انہیں تردد نہ کرنا پڑے۔ جج لنڈے کہتا ہے کہ امریکی عورتیں جنسی معاملات میں زیادہ جارحیت کا ثبوت دینے لگی ہیں۔ ایک سکول کی پرنسپل نے اُسے بتایا کہ لڑکیاں دیوانہ وار لڑکوں کا پیچھا کرتی ہیں۔ اس ضمن میں ول ڈیولن سے ایک اقتباس دلچسپ کا باعث ہوگا جو اُس نے ایک مجلے 'مرکری' کے حوالے سے دیا ہے۔

”ایک نامعلوم شخص کو نازک حالت میں یہاں کے ہسپتال میں لایا گیا۔ اُس کے بدن پر زخموں کے متعدد نشانات تھے۔ معلوم ہوا کہ تین لڑکیاں ہر لاک کے نواحی جنگل میں موٹر میں سوار جا رہی تھیں کہ انہوں نے ایک آدمی کو وہاں کام کرتے دیکھا۔ لڑکیوں نے اُسے دعوت دی کہ آؤ ہمیں سیر کرائیں۔ وہ اہل گرفتہ موٹر میں بیٹھ گیا۔ کچھ بعد جا کر بقول اُس کے لڑکیوں نے گاڑی کھڑی کی اور اُس سے جنسی ملاپ کی خواہش کی۔ ایک لڑکی اُس شخص کی کوتاہ ہمتی پر غصناک ہو گئی اور اُس کے گریباں گیر ہوئی۔ اُس کی سہیلیاں بھی اُس مرد پر ٹوٹ پڑیں اور اُسے دلجوچ لیا۔ ایک لڑکی نے اپنی ٹوپی کی سونے سے اُسے بُری طرح گھائل کر دیا۔ اس کے بعد اُسے اس حالت زلوں میں چھوڑ کر بھاگ گئیں۔“

لنڈے کے خیال میں آزادانہ جنسی ملاپ نراج کی طرح ناقابلِ عمل ہے کیوں کہ معاشرے کی بقا کے

لئے کچھ نہ کچھ قوانین وضع کرنا ہی پڑتے ہیں۔ اس ضمن میں لہندے نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ نوجوان لڑکے لڑکیوں کو آزمائشی شادی کر لینا چاہیے یعنی وہ سال دو سال بغیر نکاح کے میاں بیوی کی طرح مل کر رہیں بشرط یہ ہوگی کہ وہ ضبطِ تولید سے کام لیں گے۔ سال دو سال کے بعد اگر وہ محسوس کریں کہ وہ ایک دوسرے سے مستطاب بنھا سکیں گے اور ان میں کامل جسمانی اور ذہنی موافقت پیدا ہو گئی ہے تو وہ نکاح کر لیں۔ کتنے نے رفاقت کی شادی کا مشورہ دیا ہے یعنی نوجوان لڑکا اور لڑکی مل کر رہیں اور انہیں ایک دوسرے کا رفیق کہا جائے۔ اس دوران میں اگر انہیں اپنی مرضی کا کوئی دوسرا نوجوان یا لڑکی مل جائے تو وہ جدا ہو کر اس سے نکاح کر سکتے ہیں۔ رفاقت کی شادی کا ایک فائدہ بقول کتنے یہ ہوگا کہ لڑکے لڑکی کو جنسی ملاپ کا تجربہ ہو جائے گا جس سے وہ آنے والی زندگی میں فائدہ اٹھا سکیں گے۔ برٹرنڈ رسل نے اس نوع کی شادی کی حمایت کرتے ہوئے لکھا ہے یہ

”میرے خیال میں تمام جنسی تعلقات جن سے بچے پیدا نہ ہوں، مرد و عورت کا ذاتی معاملہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ بغیر نفسیاتی تجربہ حاصل کئے کسی مرد و عورت کو شادی نہیں کرنا چاہیے۔ اس بات کی شہادت موجود ہے کہ پہلا جنسی تجربہ ایسے فریق کے کے ساتھ ہونا انبہا ہے جو جنسی ملاپ کا تجربہ رکھتا ہو۔“

بعض عورتیں جو خود کاتی ہیں شادی نہیں کرتیں تاکہ وہ خود مختاری کی زندگی بسر کر سکیں لیکن اس کے ساتھ مانتا کا جذبہ بھی ستا رہتا ہے۔ اس مشکل کا حل یہ تجویز کیا گیا ہے کہ نکاح کے بغیر اولاد پیدا کی جائے۔ لہندے لکھتا ہے کہ ایک دن ایک لڑکی اس کے پاس آئی اور کہنے لگی ”میں شوہر کو پسند نہیں کرتی اور شادی کے بغیر آزادانہ زندگی گزارنا چاہتی ہوں لیکن مجھے بچے کی خواہش دامن گیر رہتی ہے“ کچھ مدت کے بعد وہ پھر لہندے کے یہاں آئی اور کہنے لگی ”میں نے بڑی سوچ بچار کے بعد اپنے بچے کے باپ کا انتخاب کیا، وہ ایک نوجوان طالب علم ہے۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں تم سے پیار نہیں کرتی نہ کسی مرد سے مجھے پیار ہو سکتا ہے لیکن میں ہر صورت ایک عورت ہوں اور مجھے بچہ پیدا کرنے کا

حق حاصل ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اگر تم پسند کرو وہ بچہ تمہارا ہی ہو۔ اس پر ہم نے تبادلہٴ خیالات کیا اور وہ میری بات مان گیا۔ میرے بچے کا باپ جانتا ہے کہ اب اُس کا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں رہا نہ میرا ہی اُس پر کوئی داعیہ ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ جو بچہ میری کوکھ میں ہے وہ میری رسوائی کے بغیر پیدا ہو جائے۔ آپ میری مدد کریں۔“ حجِ بلند سے نے اُس کی درخواست مان لی اور وہ ’رکولی‘ کے بغیر ماں بن گئی۔ امریکہ کا ایک عالم نفسیات البرٹ ایلس کہتا ہے۔

”عشق کے بغیر مقاربت کرنا کوئی سنگین جرم نہیں ہے بلکہ نہایت خطِ مجنّش ہوتا ہے اور لاکھوں انسان کے لئے مسرت کا باعث ثابت ہو رہا ہے۔“

البرٹ ایلس نے نیویارک میں ایک ادارہ قائم کر رکھا ہے۔ اُس کا نظریہ یہ ہے کہ ”محبت مند بیکاری“ شادی کے ادارے کی معاون ہوتی ہے۔ جو لوگ خاص قسم کی جنسی قدروں کو دوسری جنسی قدروں پر فروغ دیتے ہیں وہ جنسی فاشٹ ہیں۔ بلند سے کہتا ہے کہ اب ’حرامی بچے‘ کا تصور بھی بدل گیا ہے۔ اُس کے خیال میں حرامی بچہ وہ ہے جو ایسے ماں باپ کے گھر میں پیدا ہو جو پوری طرح محبت مند نہیں ہیں جہاں مغرب میں آج کل بے نکاحی ماؤں کو نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا اور ایک ماں ایک بچہ، یا ایک باپ ایک بچہ کے کہنے کو ہر کہیں تسلیم کر لیا گیا ہے۔

امریکہ اور یورپ کے ممالک میں جا بجا جنسی مشورہ خانے کھولے جا رہے ہیں جہاں نوجوان، لڑکوں، لڑکیوں، شوہروں اور بیویوں کو جنسی مشورے دیئے جاتے ہیں۔ اس نوع کا سب سے مشہور ادارہ امریکہ میں ڈاکٹر ڈیلیم ماسٹرز اور مسز ورجینیا جاکس نے قائم کیا ہے۔ اس میں نوجوان لڑکے لڑکیوں، شوہروں اور بیویوں کو مقاربت کی تکنیک سکھائی جاتی ہے اور اُن کی رہنمائی کے لئے ادارے کی جانب سے لڑکے اور لڑکیاں بطور بدل بچے کے پیش کئے جاتے ہیں۔ کنواری، عشاق اور

۱ SEX WITHOUT GUILT

۲ INSTITUTE FOR RATIONAL LIVING

۳ TIME, MAY, 25, 1970.

۴ SURROGATES

شادی شدہ لوگ جوق در جوق مشورے کے لئے اُدھر کا رخ کرتے ہیں۔ ماسٹرز اور درجنیہ کے خیال میں شادی شدہ زندگی اور تہجد کی تمنیاں اس لئے رونا ہوتی ہیں کہ فریقین مقابرت کی تکنیک سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں ڈیوڈ ریوین کی کتاب "جنس کے متعلق سب کچھ جوتم جانا چاہتے ہو لیکن پوچھتے ہوئے ڈرتے ہو" اور مس جون گیریٹی کی تصنیف "گرم مزاج عورت" قابل ذکر ہیں۔ ڈیوڈ ریوین کہتا ہے کہ سائنس کے اس دور میں رہتے ہوئے بھی جنسی ملاپ سے متعلق ہمارا طرز عمل وہی ہے جو غاروں کے انسان کا تھا۔ اُس کے خیال میں جنسی ملاپ کی تکنیک میں سائنس کے جدید انکشافات کی روشنی میں رد و بدل کرنا ضروری ہے۔ مس جون گیریٹی کی کتاب عورتوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ اُس نے عورتوں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ مقابرت میں بھرپور حصہ لیں کہ انہیں بھی اس سے بوجہ احسن حظ اندوز ہونے کا حق حاصل ہے۔ یاد رہے کہ اس سے بہت پہلے ڈاکٹر میری سٹولس نے جنسی حظ اندوزی کو عورت کا پیدا نشی حق قرار دیا تھا جس سے بقول اُن کے مرد نے اُسے صدیوں سے محروم کر رکھا ہے اور عورت اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئی ہے کہ اُس کا کام تو صرف مرد کو محفوظ کرنا فرانسیسی عالم جنسیات رینے گویال نے نئے جنسی میلانات کا تجزیہ کیا ہے اور حیاتیات اور تعمیل نفسی کی روشنی میں جنسی اخلاق کو از سر نو مرتب کرنے کی دعوت دی ہے۔ وہ جنسی امور میں نارمل اور ابنا رمل کے فرق کا قائل نہیں ہے اور کہتا ہے کہ کوئی شخص کسی بھی طریقے سے جنسی خواہش کی تسکین کرے۔ وہ طریقہ نارمل ہو گا۔ اُس کے خیال میں نارمل کا تصور مختلف زمانوں میں بدلتا رہا ہے مثلاً آج کل کوئی بالغ مغربی عورت کسی غیر مرد سے خلوت میں جا کر یہ کہے کہ اُس نے گنہ کیا ہے اور اس سے پشیمان ہو تو اسے ابنا رمل سمجھا جائے گا جب کہ آج سے پچاس برس پہلے کی عورت کا یہ احساس نارمل تھا جن اعمال کو علمائے جنسیات نے کج رویاں کہا ہے، رینے گویال انہیں بھی عین فطرتی مانتا ہے۔ وہ خود لذتی، سدومیت، اباحت نسواں، ایذا کوشتی، ایذا طلبی وغیرہ کو عین طبعی سمجھتا ہے۔ اُس کا نظریہ یہ ہے کہ جنسی ملاپ کے ساتھ یا اس کے بغیر جنسی حظ کا حصول فطرتی ہے۔ یہ کہہ کر اُس نے قدمائے یونان کے مسلک حظ اندوزی کا احیاء کیا ہے۔ اُس کے خیال

کے مطابق اس جنس کے علاوہ بھی ایک جنس ہوتی ہے جسے وہ جنسی جنس کہتا ہے۔ یہ جنس خود مکلفی ہے اور اس کی تشفی لازم ہے۔ اس کے بقول جنسی لذت کا حصول ہی مقصود بالذات ہے جب کہ بھونکی پیدائش محض ضمنی اور فروغی ہوتی ہے۔ بچے پیدا کرنے کی نیت کے بغیر محض نفسانی خطا کے لئے منع کرنا انسان کا فطری حق ہے۔ وہ اس بات میں فرائد سے اتفاق کرتا ہے کہ انسان نے تہذیب و تمدن کے نام پر جنسی حظ کو قربان کر دیا ہے اور نفسانی خواہش کے اظہار پر قدغن لگا کر مردوں اور عورتوں کو سچی مسرت سے محروم کر دیا ہے۔ اس کے خیال میں فرد کا جنسی حظ پانا اصل چیز ہے خواہ فریقِ ثانی حظ اندوز ہو یا نہ ہو۔ اس طرح وہ فریقِ ثانی کو محض ایک شے مانتا ہے جنسی جنس اپنی تسکین چاہتی ہے۔ اسے شے میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ فرائد نے قدام کی جنسی زندگی اور معاصرین کی جنسی زندگی میں فرق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

” قدام کی جنسی زندگی اور ہماری جنسی زندگی میں سب سے نمایاں فرق یہ ہے کہ قدام جبلت کو اہم سمجھتے تھے جب کہ ہم فریقِ ثانی کو اہمیت دیتے ہیں۔ قدام جنسی جبلت کے گن گاتے تھے اور اسی کے طفیل وہ ایک ادنیٰ فریقِ ثانی کی بھی عزت کرتے تھے جب کہ ہم جنسی ملاپ کو فی نفسہ قابلِ نفرت سمجھتے ہیں اور اس کی عذر خواہی فریقِ ثانی کی خوبوں میں تلاش کرتے ہیں۔“

رینے گویاں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور فریقِ ثانی کی شخصیت اور احساس سے بھی انکار کر دیا۔ وہ عشق و محبت کا بھی منکر ہے اور کہتا ہے کہ عشق ہمیشہ نفسانی خواہش کی آسودگی ہی ہوتی ہے اس کا ثبوت وہ یہ دیتا ہے کہ کسی عورت سے وصال ہو جانے کے بعد اس کے ساتھ عشق بھی ختم ہو جاتا ہے۔ رینے گویاں جس نے جنسی اخلاق کا داعی ہے اس میں اگر کوئی گناہ ہے تو یہی ہے کہ کسی مرد یا کسی عورت کے جنسی حظ کے حصول پر کسی قسم کی کوئی پابندی لگا دی جائے۔ وہ کہتا ہے کہ مسیحی آباء نے جنسی ملاپ کے ساتھ گناہ کا احساس و البتہ کر کے انسانی مسرت کا سرچشمہ مسموم کر دیا ہے۔

اُس کے خیال میں جنسی ملاپ کوئی گناہ نہیں ہے بلکہ جائز قسم کی تقریر ہے۔ ریتے گویاں ایک ایسے مثالی معاشرے کے قیام کا خواہاں ہے جس میں شہوانی خواہش کی ورزش و تکمیل پر کوئی قدغن نہیں ہوگی۔ اُس کے خیال میں اس معاشرے کے افراد سچی خوشی سے بہرہ ور ہوں گے۔ وہ کہتا ہے کہ جب تک جنسی اخلاق کو مذہب اور مذہبی اخلاق سے الگ کر کے نئے سرے سے علمی بنیادوں پر مرتب نہیں کیا جائے گا ہمیں شخصی اور اجتماعی الجھنوں سے نجات نہیں مل سکے گی۔

جنسی آزادی نے نسوانی لباس کو بھی متاثر کیا ہے، عورتیں نیم غریاں لباس پہننے لگی ہیں۔ وکٹوریہ کے عہد میں ٹخنوں کا دکھانا بھی معیوب تھا۔ اب سکرٹ گھٹے گھٹے برگ انجیر بن کر رہ گئی ہے اور چھاتیوں کو برہنہ رکھنے کا رواج بھی چل نکلا ہے جیسا کہ قدیم ہندوستان، کریٹ اور نشاۃ الثانیہ کے عہد کے فرانس اور اطالیہ میں تھا جب عورتیں رخساروں کے ساتھ برہنہ چھاتیوں پر بھی غارہ لگاتی تھیں کسی زمانے میں لباس کی تراش فراس سے بدن کے نقائص چھپائے جاتے تھے اب ایسا لباس پہنا جاتا ہے جس سے گدرائے ہوئے بدن کی لطافتیں نکھر کر سامنے آجائیں اور جسم کے دلاؤیز زادیوں کی زیادہ سے زیادہ نمائش کی جاسکے۔ لباس کے یہ فیشن ایشیا اور افریقہ میں بھی رواج پا رہے ہیں۔ جاپان، تھائی لینڈ، فلپائن، مصر، لبنان وغیرہ میں عورتیں آزادانہ مغربی وضع کا نیم غریاں لباس پہنتی ہیں جن اقوام میں قدامت پسندی کے اثرات باقی ہیں ان میں بھی عورتیں ایسا تنگ لباس پہننے لگی ہیں کہ جو بن کا جھکڑا پوری طرح نمایاں ہو جاتا ہے۔ اشتہار باز اور فلم ساز عورت کے جسم کی غریبانی کا استحصال کر رہے ہیں۔ اشتہار سکرٹ کا ہویا سکورٹ کا، صابن کا ہویا چاکولیٹ کا، اس میں جاذبیت پیدا کرنے کے لئے نیم غریاں نسوانی جسم کا سہارا لیا جاتا ہے۔ نازک اندام، سیم تن، لڑکیوں کو فلموں میں غریاں حالت میں دکھایا جاتا ہے۔ لوگ ہوس دید کی تسکین کے لئے ایسی فلموں پر ٹوٹ پڑتے ہیں جہیں مسٹیفیڈ، برجست بار دو، جینا لوپور جانیڈ، راکوئل ویش کے پردوں کی تعداد کروڑوں تک پہنچتی ہے۔ امریکا اور یورپ میں ایسی فلمیں بھی بننے لگی ہیں جن میں برگ انجیر کو بھی اتار پھینکا گیا ہے۔ ان میں عورتیں مرد بھی لباس میں دکھائی دیتے ہیں۔ امریکی تیشیل 'اڈہ کلکوتا' میں مادر زاد برہنہ عورتوں مردوں کو قہقہے

ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس نعرے کی تیشیوں اور فلموں پر پابندی لگانا بدذوقی خیال کیا جاتا ہے۔ اس عرمانی نے عورت کی جنسی کشش کو بچر و ج کیا ہے کہ اس کا راز ترغیب نامعلوم میں ہوتا ہے۔ انا طول و فز کے بقول لباس نے عورت میں بے پناہ کشش پیدا کی تھی۔ ایک ناول میں اُس نے دکھایا ہے کہ عورتوں کے پہلی مرتبہ لباس پہن کر نمودار ہونے کے نتائج کیسے انقلاب آور ہوئے تھے۔

جنسی آزادی نے تھمکی کو بھی متاثر کیا ہے۔ اب کبھیوں کو نئے نئے نام دیئے گئے ہیں۔ تجارتی اداروں میں کاروبار کو فروغ دینے کے لئے ان سے کام لیا جاتا ہے جب کسی گاہک سے کوئی بڑا معاملہ کرنا ہو تو حسین روکیاں تمام مشکلات کو حل کر دیتی ہیں۔ یہ خوش حمال، پری مثال روکیاں اپنے اقاروں کی تسکین پر بس بھی کرتی ہیں اور گاہکوں کے ذوق کی آسودگی کا فرض بھی انجام دیتی ہیں۔ بعض ممالک میں قبیہ خانوں کا انتظام مملکت نے سنبھال لیا ہے۔ مثال کے بطور جرمن کے شہر ہامبرگ میں کبھیوں کو مفت ستھرے ماحول میں رکھا جاتا ہے۔ ان کا باقاعدگی سے طبی معائنہ کرایا جاتا ہے۔ سب کبیاں ایک ہی جگہ مل بیٹھ کر کھانا کھاتی ہیں، اُن کے کپڑوں کی دھلائی، کھانے وغیرہ کا خرچ آٹھ شنگ روزانہ وصول کیا جاتا ہے۔ اس طرح لوگ بیمار، آتش زدہ کو چہرہ گرد کبھیوں سے بچ گئے ہیں اور کبیاں غنڈوں اور بھیر ووں کے چنگل سے آزاد ہو گئی ہیں۔

آخر میں ہم دو کتابوں کا ذکر کریں گے جو حال ہی میں شائع ہوئی ہیں اور جن سے مغربی معاشرے کے جدید ترین رجحانات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ پہلی کتاب وینس میکارڈ کی ہے۔ اس کا مرکزی خیال یہ ہے کہ آج کل مرد عورت کے تعلق میں جو تبدیلیاں واقع ہو رہی ہیں وہ معاشی، سیاسی، تعلیمی اور تہذیبی تبدیلیوں ہی کا ایک حصہ سمجھی جاسکتی ہیں۔ اس کے خیال میں عصر جدید کے جنسی انقلاب کو جنسی غلط فہمی کہنا زیادہ موزوں ہوگا کیوں کہ انقلاب کی ایک خاص جہت متعین ہوتی ہے جب کہ جنسی

۷۰ PANGUIN ISLAND

۷۱ CALL GIRL RECEPTIONST MODEL GIRL

۷۲ SEXUAL WILDERNESS REPERBAHN کہتے ہیں۔

آزادی بغیر کسی جیت کے ہر طرف پھیل رہی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تاریخِ عالم میں پہلی بار مائعِ حمل ادویات اور وسائل نے جنسی ملاپ کو تولید و تناسل سے علاحدہ کر دیا ہے اور عورتیں حمل کے خوف سے آزاد ہو کر جنسی ملاپ سے پوری طرح خطا اندوز ہونے لگی ہیں جو حاجی کے عمل سے بھی ضبطِ تولید کا رواجِ عالم ہو گیا ہے۔ بعض عورتیں فمِ رحم کا اپریشن کر دیتی ہیں جس سے استقرارِ لفظ کا خدشہ ہمیشہ کے لئے دور ہو جاتا ہے۔ طلبہ اور طالبات درس گاہوں میں مطالبہ کر رہے ہیں کہ انہیں مائعِ حمل جو ب مہیا کی جائیں تاکہ وہ شادی سے قبل جنسی تعلقات کے تجربے کر سکیں۔ 'پلے بوائے' جیسے رسائل میں نوجوانوں کو جنسی آزادہ روی کی تلقین کی جا رہی ہے۔ واعظین سے کہا جا رہا ہے کہ وہ اتوار کے مذہبی خطبات میں گناہ کا لفظ منہ سے نہ نکالا کریں کہ اس سے نوجوانوں میں گناہ کی الجھن پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے اور ان کے فحور ذہن میں مبتلا ہو جانے کا امکان ہے۔ نوجوانوں کو عبادات میں شامل ہونے کی ترغیب دلانے کے لئے گر جاگھروں میں راک اینڈ رول ناچوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ وینس سیکار ڈھکتی ہے کہ منکوحہ عورتوں کے ملازمت کرنے سے مرد عورت کے تعلقات میں دور رس تبدیلیاں واقع ہو رہی ہیں اور عورت مرد کی معاشی غلامی سے آزاد ہوتی جا رہی ہے۔ عورتوں نے ایسے کام بھی سنبھال لئے ہیں جو مردوں سے خاص سمجھے جاتے تھے مثلاً فن لینڈ میں دندان ساز اور قصاب اکثر و بیشتر عورتیں ہی ہیں۔ نئی عورت مرد سے جنسی ملاپ میں زیادہ توانائی اور قوتِ رجولیت کا مطالبہ کرنے لگی ہے اور بھرپور جنسی توانائی کی تمنا کرتی ہے۔ وہ کوتاہِ ہمت مرد پر بر ملا تعریض کرتی ہے نتیجتاً مرد عورتوں سے خوف کھانے لگے ہیں اور ان کے بڑھتے ہوئے جنسی مطالبات سے خائف ہو کر ہر جنسیت کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ اضلاعِ متحدہ امریکہ میں عورتیں مردوں پر حاوی ہوتی جا رہی ہیں اور مردوں میں زنانہ پن آرہا ہے چنانچہ وہاں کے مرد بھی عورتوں کی طرح عطریات کا استعمال کرتے ہیں، سر کے بال بڑھا کر زلفیں بناتے ہیں، غازے، کریم اور لپ شک کا استعمال کرتے ہیں، سر کے بالوں کا رنگ بدلواتے ہیں اور شوخ رنگ کے لال چھپا کپڑے پہنتے ہیں۔ ناروے، سویڈن اور ڈنمارک میں نئے جنسی میلانات زیادہ واضح شکل و صورت میں دکھائی دیتے ہیں۔ سویڈن میں جنسی ملاپ کی

عام آزادی ہے اور شادی کی روایتی صورت بہت کچھ بدل گئی ہے۔ ایک بچہ ایک ماں یا ایک بچہ ایک باپ کے کنوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے کیوں کہ میاں بیوی شادی کے بعد جلد ہی ایک دوسرے سے اکتا کر الگ ہو جاتے ہیں۔ سنگ ہم یونیورسٹی کے ایک عالم عمرانیات گنار بولٹ کہتے ہیں کہ حیاتیاتی پہلو سے عورتوں کو بچے پیدا کرنے کی ضرورت شوہر رکھنے کی ضرورت سے کہیں زیادہ ہے۔ فلموں میں جنسی ملاپ، خود لذتی اور لزبائی اختلاط کے مناظر دکھائے جاتے ہیں۔ سویڈن کی ایک فلم "میں تیس ہوں" میں کرداروں کو اعلانیہ جنسی ملاپ کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اوسلو کے باغ میں چھین فٹ اونچا دیو قامت لنگ نصب کیا گیا ہے جس کے چاروں طرف ہر منہ عورتوں کے نقوش کندہ کیے گئے ہیں۔ شاگ ہوم میں نوجوان لڑکے لڑکیاں شام کے وقت کنگز گارڈن پارک میں اکٹھے ہوتے ہیں اور قریب کے جنگل میں جا کر ایک دوسرے سے متعلق کرتے ہیں۔ تیس پیکار ڈکیتی ہے کہ اس جنسی آزادی کے تین نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ ۱۔ ملک بھر کے بچوں کی ۱۰ تعداد صرف ماں یا صرف باپ کے پاس رہتی ہے۔ ۲۔ سوزاک اور آتشک کے امراض ہر کہیں پھیل گئے ہیں۔ ۳۔ ملاطوں کی تعداد دنیا بھر کے ممالک میں سب سے زیادہ ہے۔

دوسری کتاب امریکہ میں تحریک آزادی نسوان کی راہنما خواتین کے مقالات پر مشتمل ہے جسے دوین گارننگ اور باربرا موران نے مرتب کیا ہے۔ ان مقالات میں قدر مشترک یہ ہے کہ ان خواتین کے خیال میں تحریک آزادی نسوان کو سب سے زیادہ نقصان جنسیت نے پہنچایا ہے۔ ان کے ہاں اس ترکیب سے مراد محض یہ نہیں ہے کہ معاشرے میں ایک جنس کو دوسری جنس پر برتری حاصل ہے بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ مرد کے ذاتی حفظ نفس ہی کو مقصود بالذات سمجھ لیا گیا ہے اور جنسی ملاپ کو مرد کی خط اندوزی اور بچے پیدا کرنے کے لئے وقف کر دیا گیا ہے۔ اس نوع کے معاشرے میں مرد اس حقیقت کو فراموش کر دیتا ہے کہ اس کی لذت طلبی یا بچوں کی پیدائش کے ساتھ عورت کو

لے انہیں RAGGARE کہتے ہیں، WOMAN IN SEXIST SOCIETY

SEXISM

بھی جنسی غلاب کے ساتھ یا اس کے بغیر حفظ اندوزی کا حق حاصل ہے۔ وہ کہتی ہے کہ خواتین کی حصولِ آزادی کی کشمکش اُس سہمہ گیر جدوجہد کا ایک حصہ ہے جو استحصال کرنے والے چند مقتدر گروہوں کے خلاف محنت کش اور سیاہ فام امریکی کر رہے ہیں۔ انہیں شکایت ہے کہ عورت کو بار بار یاد دلایا جاتا ہے کہ اُس میں قوتِ ارادی اور پیش رفت کا فقدان ہے اس لئے وہ عقلیت پسند نہیں ہوتی نہ غیر معمولی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہوتی ہے چنانچہ اُسے مرد سے مختلف قسم کی کوئی مخلوق سمجھا جاتا ہے جو بنیادی طور پر طفلانہ طبع اور خفیف الحركات ہے۔ اُن کا استدلال یہ ہے کہ جنسیت زدہ معاشرہ پدری نظام پر مبنی ہے جس میں عورت کو ہم جنس خونی، مشکل پسندی اور حوصلہ مندی سے عاری سمجھا جاتا ہے۔ اس معاشرے میں جو قوانین مردِ راج ہیں وہ مرد ہی کے بنائے ہوئے ہیں، موجودہ اخلاقی قدیر مرد ہی کی عائد کی ہوئی ہیں مثلاً مرد نے عورت کو بچہ دینے کے لئے عورت کے حُسن و جمال کا ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ اَدنا شینار ڈکھتی ہیں کہ مرد عورت کے حُسن و جمال کا جو راگ الاپتا رہا ہے وہ محض اُس کی اپنی ہوس پرستی کی تخلیق ہے۔ عورت کو حسین و جمیل اس لئے کہا جاتا ہے تاکہ وہ ہمیشہ اپنی آرائش و زیبائش میں جُتی رہے اور اپنے حقوق سے غافل ہو جائے۔ عورتیں مرد کے اس دامِ فریب میں پھنس گئی ہیں اور انہوں نے اپنے اصل مقام کو فراموش کر دیا ہے۔ اَدنا شینار ڈکھتی ہیں کہ تمام پرندوں اور چوپایوں میں نر مادہ سے زیادہ خوبصورت ہوتا ہے اور زیادہ خوش آواز بھی ہوتا ہے اس کیلئے کی رُو سے مرد عورت سے زیادہ خوبصورت ہے لیکن عورت کو اپنی ہوس کا کھلونا بنا کر رکھنے کے لئے مرد نے اُسے حُسن و جمال کا پیکر قرار دے دیا ہے اور عورت بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئی ہے کہ میں مرد سے زیادہ خوبصورت ہوں چنانچہ عورتوں کو زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے اشتہار، فلموں، نگار خانوں اور شبانہ مجالس میں اپنے جسم کی نمائش کرنا پڑتی ہے۔ غولہ کوئی لڑکی کتنی ہی مین و دراک ہوا ہے اپنے آپ کو حسین اور پرکشش ثابت کرنے کے لئے کاوش کرنا پڑتی ہے کیوں کہ مرد یہی کچھ چاہتا ہے۔ چنانچہ عورتوں نے اپنی غیر معمولی ذہانت کو بھی زیبائش اور ہارنگھار پر قربان کر دیا۔

ہے اور وہ کوئی اعلیٰ کارنامہ انجام نہیں دے سکیں۔ مرد ذہین اور خیمہ لڑکیوں سے دور بھاگتے ہیں کہ اس سے اُن کے احساس برتری کو ٹھیس لگتی ہے۔ فہمیدہ لڑکیاں ڈر کے مارے اپنی ذہانت کا برملا اظہار نہیں کرتیں اور جان بوجھ کر احمقانہ حرکتیں کرتی ہیں تاکہ مردوں کو اپنی جانب متوجہ کر سکیں۔ اگر کسی لڑکی کو راکوئیل ویلش اور میریا گوپرٹ میرڈاس خاتون نے ۱۹۶۲ء میں طبیعیات میں نوبل انعام جیتا تھا، میں انتخاب کرنا ہوتا تو وہ راکوئیل ویلش بننا پسند کرے گی۔ یہ نتیجہ ہے اُن غلط قدروں کا جو مردوں نے پوری معاشرے میں قائم کر رکھی ہیں۔ عورت کو نزاکت اور لطافت کا مجسمہ کہہ کر اسے فریب دیا جا رہا ہے۔ فرائد اور اُس کے متبعین کہتے ہیں کہ عورت فطرتاً ایذا طلب ہے۔ یہ کہہ کر وہ اُن مُغالَم کا جواز پیش کرتے ہیں جو مرد صدیوں سے عورت پر کر رہا ہے بعض علمائے تحلیل نفسی نے تو یہاں تک کہا ہے کہ عورت مرد کے ہاتھوں پٹ کر خوشی محسوس کرتی ہے جس عورت کو اُس کا شوہر کبھی کبھار دھول دھپانہ کرے وہ سمجھنے لگتی ہے کہ اب وہ اُس سے پیار نہیں کرتا مرد کے بغور غلط احساس برتری کا ایک کرشمہ یہ ہے کہ وہ عورت کو فلسفیانہ تعمیق اور فن کا رانہ تخلیق کے نابل سمجھتا ہے مرد کہتا ہے کہ عورت رحم ہی سے تخلیق کر سکتی ہے، دماغ سے تخلیق کرنے سے قاصر ہے عورت کی تخلیقی صلاحیتیں تہتر بچوں کی پیدائش پر صرف ہو جاتی ہیں چنانچہ جارج ایلیٹ، جارج ملوں وغیرہ خواتین جو ادبیات میں نامور ہوئی ہیں اُن سے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ مردانہ قہم کی عورتیں تھیں اُن کے جنسی نظام میں گڑبڑ تھی اور وہ کچ رو تھیں۔ تخلیق ادب و فن پر صرف مرد ہی قدرت رکھتا ہے ایکس سلمان کہتی ہیں کہ علمائے جنسیات و تحلیل نفسی کا یہ ادھار لے کر غلط ہے کہ نفسانی حفظ کا اصل مرکز فرج ہے اُن کے خیال میں لفظ عورت کے لئے جنسی حفظ اندوزی کا اہم مرکز ہے۔ وہ فرائد کے اس خیال کو بھی رد کر دیتی ہیں کہ اوائل شباب میں لفظ حفظ نفسانی کا مرکز ہوتا ہے لیکن جنسی ملاپ کے بعد حفظ نفس فرج میں منتقل ہو جاتا ہے لہذا جو عورت بدستور لفظ سے محفوظ ہونے پر اصرار کرتی ہے وہ نفسیاتی لحاظ سے مجرور ہے۔ ایکس سلمان کہتی ہیں کہ مردوں کی اس نوع کی موثر گائیاں

لے اے OVARIAN THEORY OF LITERATURE کہتے ہیں۔

مغاطہ آفریں میں عورت بخوبی جانتی ہے کہ جنسی حظ کا نقطہ عروج ایک ہی ہوتا ہے، اُسے تین مراحل میں تقسیم کرنا محض سفسطہ ہے۔ وہ ماسٹر ز جانس سے حوالہ دے کر کہتی ہیں کہ ان کی تحقیق سے صاف عیاں ہے کہ اکثر عورتوں کے لئے جنسی حظ کا حصول بطور ہی سے ہوتا ہے۔ سمون دوبا نے کہا ہے۔

”عورت کا مل آزادی حاصل کر کے ہی مرد کی غلامی سے نجات پاسکتی ہے۔“  
یہ کامل آزادی بقول ایکس سلمان ہم جنسی عورتوں ہی کو میسر آسکتی ہے چنانچہ یہ دیکھ کر تعجب نہیں ہوتا کہ امریکہ اور یورپ میں تحریک آزادی نسوان کی سرخیل اکثر بیشتر ہم جنسی خواتین ہی ہیں ایکس سلمان اور ان کی ہم نوا خواتین کے اس استدلال کے خلاف مردوں نے کہنا شروع کر دیا ہے کہ تحریک آزادی نسوان مردوں کے خلاف لزبانی سازش ہے جو کامیاب ہوگئی تو معاشرہ انسانی کا شیرازہ بکھر کر رہ جائے گا۔ ان خیالات کی اشاعت کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ اضلاع متحدہ امریکہ اور اکثر مغربی ممالک میں نازک اندام، دھان پان، شرمیلی، بودی سبے بس دوشیزہ غائب ہوگئی ہے اور اُس کی جگہ جارحیت پسند، دلیر اور با اعتماد لڑکی نے لے لی ہے۔

محو کہ بلائے جنسی رجحانات اضلاع متحدہ امریکہ اور یورپ کے ممالک میں صورت پذیر ہوئے ہیں۔ اشتراکی ممالک میں لوگ زیادہ صاف ستھری اور صحت مند جنسی زندگی گزار رہے ہیں بے شک ان کے ہاں بھی جنس روایتی اخلاق کی بندشوں سے آزاد ہوگئی ہے لیکن ان میں شادی اور کنبے کا تقدس برقرار ہے۔ شادی رجسٹر میں نام لکھوانے سے ہو جاتی ہے اور طلاق کے لئے بھی رجسٹر کو اطلاع دینا کافی ہوتا ہے۔ اس کے باوجود امریکہ اور یورپ کے ممالک کی یہ نسبت اشتراکی ممالک میں طلاقیوں کی تعداد کم ہے۔ اشتراکی ممالک میں عورت کو محض ایک شے نہیں سمجھا جاتا جس کا واحد مصرف جنسی حظ کا سامان ہم پہنچانا ہے بلکہ اُسے مرد کے مساوی ذی شعور ذی احساس

۱۰ ORGASM

۱۱ LESBIAN

فرد تسلیم کر لیا گیا ہے۔ کارل مارکس نے کہا ہے کہ سرمایہ دارانہ معاشرے میں ہوس زر کے باعث عورت مرد کے لئے جنس فروختی بن کر رہ جاتی ہے جسے مرد دوسری اجناس کی طرح کسی نہ کسی قیمت پر خرید لیتا ہے چنانچہ عورت کی شخصیت ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ مارکس نے اسے "انسانی علاقہ کی معروضیت" کا نام دیا ہے۔ روس اور چین میں مرد عورت کے مرتبہ کی تفریق مٹا دی گئی ہے، قانوناً عورت کو مرد کا ہم تسلیم کر لیا گیا ہے اور اس پر ہر قسم کی ملازمت کے دروازے کھول دیئے گئے ہیں۔ سوئیٹ روس کے ایک دانش ور ڈاکٹر بینی ٹوف نے لکھا ہے:

"اب جب کہ نیا انسان ابھر رہا ہے اس بات کی ضرورت ہے کہ عورت سے متعلق قدیم نظریہ ترک کر دیا جائے اور اسے پروتاری مملکت کا پورا رکن اور ساتھی تسلیم کر لیا جائے۔"

جیسا کہ ہم تفصیل سے ذکر کر چکے ہیں، آزادی کا مفہوم مغربی عورت نے یہ لیا ہے کہ وہ جنسی ملاپ کرنے میں آزاد ہے۔ اشتراکی ممالک میں عورت کو آزاد کر کے اسے معاشرتی ذمے داریاں سونپ دی گئی ہیں۔ وہ مردوں کے دوش بدوش کارخانوں، کھیتوں، سائنس کی تجربہ گاہوں اور کارخانوں میں محنت کرتی ہے۔ روس اور چین میں پچھترے اسی فیصد ڈاکٹر اور چالیس سے پچاس فیصد انجینئر عورتیں ہیں۔ اشتراکی عورت کام میں اس قدر مصروف رہتی ہے کہ وہ مغربی عورت کی طرح بیزاری اور اکتاہٹ کی شکار نہیں ہوتی نہ ان کا مداوا کرنے کے لئے اسے عیش کوشی کا دامن تھامنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ مغربی عورت نے مساوات کا مطلب یہ لیا ہے کہ وہ مردہی کی طرح ہر قسم کی جنسی بے راہ روی کا حق رکھتی ہے۔ اشتراکی اقوام میں مساوات نے عورت کو مردہی کی طرح کے علمی اور عملی کارنامے انجام دینے کی تحریک و تشویق کی ہے۔

لے OBJECTIFICATION OF HUMAN RELATIONS

لے BIOLOGICAL TRAGEDY OF WOMAN

# اصطلاحات

ADOLESCENCE	نوجوڑی	CLITORIS	لفظ، زنبور
ADOLESCENT	نوجوڑ	COCOTTE	قبّہ
AMBIVALENT	دورُخ	CONCUBINE	کینیز مدخولہ
APHRODISIAC	مُہبی	COPROLALIA	فحش گوئی
AUTO-EROTICISM	خود لذتی	CUNNILINGUS	دھن کاری
BAWD	پھنّال	DAVID'S RECIPE	نسخہ داوڈی
BESTIALITY	حیوانیت	DEFLOWERING	ازالہ بکارت
BI-SEXUAL	دوجنسی	DEMI-MONDE	عصمت باختہ
BOHEMIAN	قلندر	EFFEMINATE	زنانہ مرد
BROTHEL	قبّہ خانہ	EJACULATION	انزال
CASTRATION	ختنہ کی الجھن	EONISM	ایوانیت
COMPLEX			
CASTRATO	بیچڑے	EROGENOUS ZONES	نفس پورا اعضا
CHASTE LOVE	عشقِ عندی	EROTIC	شہوانی
CHASTITY GIRDLE	عصمت کی پٹی	EROTOMANIA	جنس زدگی
CHIVALRY	فہوت، فرویت	EROTOGRAPHOMANIA	ہوس نگری
CLIMACTERIUM	کھولت (مردانہ)	EXHIBITION	نمائشیت
CLITRODECTOMY	قطع لفظ	EXOTIC	غلابت آمیز

FANCY-MAN	خانۀ آشنا	LIBIDO	کام ، لوبه
FELLATIO	ایجاد تشنگی ، لقمه خوری	MAIDENHOOD	بکارت
FETICHISM	جنسی علامت پرستی	MOTIF	علامتی محرک
FLAGELLATION	بید زنی	MASTURBATION	جلق
FOREPLAY	ملاعبت	MASTURBATORY PHANTASY	جلق خیال آرائی
FRIGIDITY	سرد مہری	MASOCHISM	ایذا طلبی
GIGOLETTE	نوخیز داشته	MALE PROSTITUTE	کاسب
GIGOLO	نوجوان کاسب	MENOPAUSE	بکولت (نسوانی)
GOVERNESS	کشتی ، نانک	MISOGYNY	عورت دشمنی
GRISSETTE	نوجی	NARCISSISM	زنگیت
GUILT-FEELING	احساس جرم	NECKING	گردن آویزی
HARLOT	بیسوا	NOCTURNAL EMISSION	احتلام
HERMAPHRODITE	عورت مرد	NYMPHOMANIAC	جنسی پیرطی
HEDONE	مسکب حظ اندوزی	OLISBOS; BANBON	پا درو یا
HOMOSEXUALITY	هم جنسیت	ORGASAM	غایت حظ نفسانی
HYMEN	پرده بکارت	OVER-SEXED	مغلوب الشہوت
INCEST	ایاحت	PAGANS	بت پرست قدماء
INITIATION CEREMONIES	رسوم بلوغت	PERIODS	ایام
KLEPTOMANIA	لذت سرقت	PETTING	ہتھ پھیری
KNIGHT	فتی ، جوان مرد	PHALLUS	لنگ
LESBIAN	لربانی	PIMP	دلال

PLATONIC LOVE	عشق بيم جنسی	SEXUAL DEGENERATE	جنسی پاپی
PONCE	غذا آشنا	SEXUAL DEVIATION	جنسی انحراف
PORNOGRAPHY	فحش نگاری	SEXUAL PERVERSION	جنسی کج روی
PORNOTOPIA	عالم شهوات	SEXUAL SLAVERY	جنسی غلامی
POSTURE	آسن	SINGING GIRL	گنجینی
PREMATURE EJACULATION	سُرعت اِزال	SLUT	کسی
PROCURER	بهر دوا	SODOMY	سدومیت
PROSTITUTE	طوائف	SOUTENEUR	قرم ساق
PROSTITUTION	قبضگی	SPIRITUAL LOVE	عشق حقیقی
PUBERTY	بلوغت	STREET WALKER	گشتی
PYGMALIANISM	عشق بُتار	STRIP-TEASE	لباس اُتار رقص
QUIESCENT	خُفتہ	TOUT	کُننا
RETENTIVE	مُمسک	TOURNAMENT	دوران
SADISM	ایذاکوشی	TRIBADIC UNION	چیٹ بازی
SAPPHIC UNION	مساقت	TROBADOUR	طراب
SATYR	جنسی عفریت	TROLLOP	رندگی
SHUNIMATISM	اعادہ شباب	UNDER-SEXED	کوتاہ ہمت
SELF-MANIPULATION	خودکاری	UTERUS	رَحِم
SEXOLOGIST	عالم جنسیات	VAGINA	فرج
SEXOLOGY	جنسیات	VIRAGO	مردانہ عورت
SEXUAL CONGRESS	مقاربت یا ملاقات	VIRGINAL ANXIETY	تشنہ بکاردگی
VULVA	یونی	VOYEURISM	ہوس دید
WHITE SLAVERY	سفید غلامی	WHORE	ہلکی

# کتابیات

- ۱۔ الف لیلہ و لیلہ
- ۲۔ کتاب الہند ، البیرونی
- ۳۔ وقائع اسدیگ
- ۴۔ تاریخ صحف سہادی ، نواب علی
- ۵۔ تابستان ہذاہب ، محسن فانی
- ۶۔ تمدن ہند ، بی بان ۔ ترجمہ علی بلگرامی
- ۷۔ تاریخ اندلس ، ڈوزی ۔ ترجمہ عنایت اللہ دہلوی
- ۸۔ منتخب التواریخ ، عبدالقادر بدایونی
- ۹۔ مثنوی مولانا روم
- ۱۰۔ گلستان سعدی
- ۱۱۔ قابوس نامہ ، کیکاؤس
- ۱۲۔ مہا بھارت
- ۱۳۔ میراں کے گیت ، جے کشن چودھری
- ۱۴۔ ستیارتھ پرکاش ، دیانند
- ۱۵۔ گیت

- ۱۶ - چھانڈو گیتھ ، اُنشد
- ۱۷ - برہادارنیک ، اُنشد
- ۱۸ - حکایات پنجاب ، آرسی ، ٹپیل
- ۱۹ - نرہۃ المشتاق ، ادرلی
- ۲۰ - وقیۃ الاعیان ، ابن خلکان - ترجمہ ڈی سلیم
- ۲۱ - قانون اسلام ، جعفر شریف
- ۲۲ - دربار اکبری ، آزاد
- ۲۳ - سفرنامہ ، ابن بطوطہ
- ۲۴ - بلوغ العرب ، محمود شکاری آگوسی - ترجمہ پیر محمد حسن
- ۲۵ - البرامکہ ، عبدالرزاق کانپوری
- ۲۶ - یاد ایام ، عبدالرزاق کانپوری
- ۲۷ - دستور الوزراء ، خوندمیر
- ۲۸ - تاریخ الدولتین ، جرجی زیدان
- ۲۹ - ہزار بیشہ ، جمال زادہ
- ۳۰ - تاریخ ممتاز
- ۳۱ - پری خانہ ، واجد علی شاہ
- ۳۲ - آرائش محفل ، شیر علی افسوس
- ۳۳ - اُمر او جان آدا ، مرزا ہادی رسوا
- ۳۴ - گذشتہ لکھنؤ ، شرر لکھنوی

# B I B L I O G R A P H Y

ANDIARD, MICHEL. : PATTERNS OF SEX AND LOVE.

ASHBEE, H. S. : INDEX

BACHOFEN. : THE RIGHT OF THE MOTHER.

BEAUVOIR, DE-SIOMON. : THE SECOND SEX.

BERLINER, BERNARD. : PSYCHODYNAMICS OF  
MASOCHISM

BOCCACCIO. : DECAMERON.

BOTHONEE, PHYLLIS. : ALFRED ADLER.

BRIFFAULT, ROBERT. : MOTHERS.

BRIFFAULT, ROBERT. : SEX IN CIVILIZATIONS.

BROWN, FRED. : SEX QUESTIONS ANSWERS.

BURTON, RICHARD. : TERMINAL ESSAY.

CAPRICO, FRANK. S : THE SEXUALLY ADEQUATE  
MALE.

CASANOVA. : MEMOIRS.

CLEVELAND. : FANNY HILL.

DAVIS, MAXIME. : THE SEXUAL RESPOSIBILITY  
OF WOMEN

DEUTSH, HELEN. : THE PSYCHOLOGY OF WOMEN

DUBOIS, ABBE. : HINDU MANNERS, CUSTOMS AND  
CEREMONIES.

DURANT, WILL.:LIFE OF GREECE.

DURANT,WILL.:CAESAR AND CHRIST.

DURANT,WILL.:THE REFORMATION.

DURANT,WILL.:THE AGE OF REASON BEGINS.

DUREAUX,CAPTAIN.:VENUS IN INDIA.

ELLIS,HAVELOCK.:PSYCHOLOGY OF SEX.

FRAZER,J.G.:THE GOLDEN BOUGH.

FREUD,SIGMUND.:COLLECTED PAPERS VOL.2,4.

FREUD,SIGMUND.:THREE ESSAYS ON THEORY OF  
SEXUALITY,

FREUD,SIGMUND.:THE MOST PRAVELENT FORM OF  
DEGRADATION IN SEXUAL LIFE.

FORSYTH,DR.:PSYCHOLOGY AND RELIGION.

GARNICK,VIVIAN.:WOMAN IN SEXIST SOCIETY.

GARNICK,VIVIAN.:WOMAN IN SEXIST SOCIETY.

GARRITY,JOAN.:THE SENSUOUS WOMEN.

GUPTA DAMODAR.:NATNI MATAM.

HANNAY.:SEX SYMBOLISM IN RELIGION.

HARRIS,FRANK.:MY LIFE AND LOVES.

HENRIQUES,FERNANDO.:SOCIOLOGY OF SEX.

HENRIQUES,FERNANDO.:MODREN SEXUALITY.

HIRSEHFELD,MAGNUS.:SEXUAL ANOMALIES AND  
PERVERSION

HUXLEY ALDOUS.:FRANCIS AND GREGORY.

JOAD, C. E. M. : THE FUTURE OF MORALS.  
 JUNG . : TWO ESSAYS ON ANALYTICAL  
 PSYCHOLOGY.  
 KIEFER, OTTO. : SEXUAL LIFE IN ANCIENT ROME.  
 KINSEY. : SEXUAL BEHAVIOUR IN THE HUMAN MALE.  
 KINSEY. : SEXUAL BEHAVIOUR IN THE HUMAN  
 FEMALE.  
 LEAGUE OF NATIONS. : COMMISSION OF ENQUIRING  
 INTO TRAFFIC IN WOMAN AND CHILDREN IN THE  
 EAST.  
 LEWINSOHN, RICHARD. : A HISTORY OF SEXUAL  
 CUSTOMS.  
 LICHT, HANS. : SEXUAL LIFE IN ANCIENT GREECE.  
 LILARD, SUZANNE. : ASPECTS OF LOVE IN  
 WESTERN SOCIETY.  
 LINDSAY. : COMPASSIONATE MARRIAGE.  
 MACPASTLAND, JAMES. : SEX IN OUR CHANGING  
 WORLD.  
 MAL, KALYAN. : ANANGA RANGA.  
 MALRAUX. : MAN'S FATE.  
 MANTAGAZZA, PAOLO. : THE PERVERSIONS OF LOVE.  
 MARCUS, STEVENSON. : THE OTHER VICTORIANS.  
 MAUROIS, ANDRE. : ART OF LIVING.  
 MAYO, KATHERINE. : MOTHER INDIA.  
 MAYO, KATHERINE. : SLAVES OF GODS.  
 NAFZAVI, SHEIKH. : PERFUMED GARDEN.  
 NAVARRE, DE MARGUERITE. : HEPTAMERON.